دین و شریعت

جدید ایڈیشن اہم اضافات و ترمیمات کے ساتھ

از

مولانا محمد منظور نعمانی مدظلہٗ

مقدمہ

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہٗ

مجلسِ نشریاتِ اسلام
[illegible] کراچی

یہ کتاب حضرت مولانا محمد منظور نعمانی مدظلہٗ کی تحریری اجازت سے
شائع کی جا رہی ہے۔

اکیسواں ایڈیشن

نام کتاب ———— دین و شریعت
مصنف ———— مولانا محمد منظور نعمانی
کتابت ———— بلقیس ناز
طابع ———— تکمیل پرنٹنگ پریس آرام باغ کراچی
تعداد ———— ایک ہزار
قیمت ———— [redacted]/- روپے

فضل ربی ندوی

مجلس نشریات اسلام
ا۔ کے۔ ۳ ناظم آباد مینشن، ناظم آباد کراچی ۱۸

فہرست مضامین وعنوانات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ طبع جدید (۱۴۰۲ھ / ۱۹۸۲ء)

از مصنف

اس عاجز کی یہ کتاب "دین و شریعت" جو آپ کے ہاتھ میں ہے۔ پہلی دفعہ اب سے ۲۵ سال پہلے (۱۳۷۵ھ / ۱۹۵۶ء) میں شائع ہوئی تھی اس وقت سے اب تک قریباً ۱۰ اڈیشن اس کے شائع ہو چکے ہیں، انگریزی، فرانسیسی اور گجراتی زبانوں میں بھی اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں اور جیسا کہ ناچیز کے علم میں آنے والے تاثرات سے اندازہ ہوتا ہے، اس کے ذریعہ بہت سے اللہ کے بندوں کو جن میں اعلیٰ تعلیم یافتہ اصحاب بھی ہیں اور متوسط بھی، الٰہی دین و شریعت کے بارے میں ذہنی اطمینان، قلبی انشراح اور ذوق عمل بھی حاصل ہوا ہے۔ بلاشبہ یہ سب محض اللہ تعالیٰ کا فضل اور اُس دین و شریعت کی حقانیت و صداقت کا نتیجہ ہے جس کی خدمت و تفہیم اس تصنیف کا اصل مقصد ہے۔ فللّٰہ الحمد ولہ المنۃ!

اب تک یہ کتاب چھوٹے کتابی سائز (۲۰×۳۰/۱۶) پر شائع ہوتی رہی، اب طے کیا گیا ہے کہ اس کو متوسط کتابی سائز (۲۳×۳۶/۱۶) پر شائع کیا جائے تو ناچیز مصنف نے اس پر نظر ثانی اور اس کے نتیجہ میں جا بجا ترمیمات بھی کیں اور آخر میں بطور ضمیمہ ایک مستقل مضمون کا اضافہ بھی جس میں کتاب کے ایک اہم مضمون سے متعلق بعض حضرات

کے سوالات اور شبہات کا جواب دیا گیا ہے۔

اس ایڈیشن کا بیش قیمت اضافہ صدیق محترم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا مقدمہ ہے، جس کے لئے یہ ناچیز راقم سطور اُن کا ممنون ہے۔

آخری کلمہ اللہ کی حمد ہے اور حسن توفیق، حسن قبول اور حسن خاتمہ کی دعا۔

ربنا تقبل منا انك انت السميع العليم ○ وتب علينا انك انت التواب الرَّحيم ○

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ
لکھنؤ
۱۱ر جمادی الاولی ۱۴۰۳ھ
۱۴ر فروری ۱۹۸۳ء

مقدمہ
از
مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی،

جب یہ حقیقت مسلم ہے کہ اسلام آخری دین ہے، وہ حدود وثغور اور ممالک و اقالیم ہی نہیں، زمان و مکان، نسل و زبان اور عقول واذہان کے حدود سے بھی آزاد ایک دائمی، زندہ جاوید اور عالمگیر پیغام، دعوت اور زندگی کا دستور العمل ہے، تو اس سے لازماً ایک دوسری حقیقت ثابت ہوتی ہے کہ ہر زمانہ، ہر ماحول، ہر ذہنی سطح اور ہر زبان اور اسلوب میں اس کو اس طرح پیش کرنے کی ضرورت ہے کہ اس کے ماننے والوں اور پیروؤں کے ایمان واطمینان میں اضافہ، ذہین طبیعتوں کی ذہنی تشفی کا سامان اور ان کے ان نئے سوالات کا جواب ہو، جو ماحول، خاص طرح کی تعلیم وتربیت ہمسایہ قوموں کے ساتھ رہنے، دوسرے مذاہب کا مطالعہ، یا اہم واقعات وتغیرات نے ان کے ذہن میں پیدا کر دیئے ہیں، نیز ایک طالب حق اور سلیم الطبع انسان کو سمجھانے اور اسکے سامنے اسلام یا اس کے کسی عقیدہ یا حکم کی معقولیت ثابت کرنے کا بقدر ضرورت

سامان ہو۔

اس ابدی صداقت کو سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے (جنہوں نے آغوشِ نبوت میں تربیت حاصل کی تھی اور قرآن مجید کا عمیق و ممتاز فہم رکھتے تھے) اپنے اس حکیمانہ جملہ میں بیان فرمادیا ہے، جو اغلب ہے کہ انہیں کے لفظوں میں اس وقت تک نقل ہوتا چلا آرہا ہے اور اپنے اندر معانی کا ایک دفتر رکھتا ہے۔ اُن کا ارشاد ہے:-

كلموا الناس على قدر عقولهم أتريدون
أن يكذب الله و رسوله۔

لوگوں سے ان کی عقلی سطح اور فہم کے مطابق (دینی) بات کرو، کیا تم چاہتے ہو کہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی تکذیب کا ان کو موقعہ ملے۔

اس عالمی صداقت اور قانون فطرت کا تقاضہ تھا کہ علوم اسلامیہ کی تاریخ میں اسلامی عقائد کی تشریح (جس کا اصطلاحی اور معروف نام علم کلام ہے) اور طریق دعوت سب سے زیادہ اس اصول پر عمل اور اپنے کو زندگی کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرے، امام ابوالحسن اشعریؒ، امام غزالیؒ، جلال الدین رومیؒ، شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہؒ حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی تحریریں اور تصنیفات اس کوشش کا ایک نمونہ ہیں، دور آخر میں علامہ حسین الجسر طرابلسی کا رسالہ "الحمیدیۃ" بھی اس سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

جہاں تک اس زمانہ کا تعلق ہے یہ کام پہلے سے زیادہ دشوار اور نازک ہوگیا ہے کہ ذراسی غفلت، کسی رجحان کے غلبہ یا ذہنی ردعمل کے نتیجہ میں دین کی تفہیم، زمانہ کے اثرات سے متاثر، روح اور مقاصد دین سے دور، اور رائج الوقت اور مقبول عامہ فلسفوں

تحریکوں اور نظریات کی ترجمان بن سکتی ہے، اس کام سے صحیح طور پر وہی شخص عہدہ برآ ہو سکتا ہے۔ جس نے ایک طرف دین کا علم، اس کے ماہر اساتذہ اور علماء اور راسخین سے حاصل کیا ہو، کتاب وسنت سے براہ راست استفادہ کی صلاحیت اور قدرت رکھتا ہو، تعلیم کے ساتھ علماء راسخین کی صحبت بھی پائی ہو، پھر اس کے ساتھ وہ عوام و خواص کے مختلف حلقوں میں رہا ہو، ان کے حالات و خیالات سے واقف ہو، اس نے زندگی کی خیالی دنیا یا علمی حصار یا "دینی جزیرہ" میں نہ گزاری ہو، اہل حرفہ سے لے کر دانشوروں اور علماء اور واعظین سے لے کر سیاسی میدان میں کام کرنے والوں تک سے اس کا اختلاط و نشست و برخاست رہی ہو، پھر وہ (وہبی یا اکتسابی طریقہ پر) دقیق مسائل کو سہل اور عام فہم طریقہ پر بیان کرنے اور سادہ سے سادہ زبان بولنے اور لکھنے پر قادر ہو، اس سب کے علاوہ اس کے اندر اخلاق، سوز دروں اور دعوت کا طاقتور جذبہ بھی پایا جاتا ہو کہ اس کے بغیر کوئی کوشش مؤثر اور انقلاب انگیز نہیں ہوتی۔

ہمارے زمانہ میں جب انگریزی نظام تعلیم خود مسلمانوں کے ذہنوں پر پورا اثر ڈال چکا تھا اور اس میں کئی نسلیں پورے طور پر پرورش پاچکی تھیں، اسی کے ساتھ مغرب سے آئے ہوئے مادی فلسفوں، مادی طریق فکر، سیاسی تحریکات اور مسلم ممالک اور اسلامی معاشرہ میں کئی طرح کے خلا کے وجود کا احساس، پسماندگی اور شکست خوردگی کا بڑھا ہوا شعور اور بعض حلقوں میں (خلوص کے ساتھ) ہر اس نظریہ کا خیر مقدم جو اسلام کو زمانہ کے مطابق ثابت کرنے اور مسلمانوں کو غلبہ اور طاقت دلانے کی کوشش نے، اس کام کو زیادہ نازک اور مشکل بنا دیا تھا، پھر اس کے ساتھ عوام اور متوسط طبقہ کو سامنے رکھنے اور روزمرہ کی سادہ زبان میں ان دینی حقائق کو بیان کرنے کی کوشش

نے اس کو اور دشوار اور اس کوشش کے نتائج کو مشکوک بنا دیا تھا کہ بعض اوقات وہ "اجتماع ضدین" کے مترادف سمجھا جاتا تھا۔

مجھے اس حقیقت کے اعلان میں مسرت اور کسی قدر فخر محسوس ہوتا ہے کہ رفیق محترم مولانا محمد منظور صاحب نعمانی مدیر الفرقان نے اس اہم اور نازک کام کا بیڑا اٹھایا اور پہلے کم تعلیم یافتہ اور سادہ ذہن رکھنے والے لوگوں کے لئے "اسلام کیا ہے" کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی جس کو وہ مقبولیت حاصل ہوئی اور اس کے اتنے ایڈیشن اُردو میں اور ترجمے انگریزی، فرانسیسی، عربی اور ہندی، گجراتی، کنڑی اور ہندوستان کی دیگر متعدد زبانوں میں نکلے جو اردو کی کم دینی، دعوتی کتابوں کے ہوئے ہوں گے اس کی افادیت اور اثر کا مجھے ذاتی طور پر تجربہ اور علم ہے کہ کم خواندہ لوگوں کے لئے اسلام کو سمجھنے نیز اس پر عمل کرنے کے لئے ہمارے پاس اس وقت بھی کم کتابیں ہیں جو اس کی طرح مفید اور مؤثر ہوں۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے مولانا کو توفیق دی کہ وہ اس سے بلند معیار کی کتاب پیش کریں جس میں ان کے بقول "اسلامی اصول و تعلیمات کو اس طرح پیش کیا جائے کہ دلوں سے عہد حاضر کے شکوک و شبہات و اہل زیغ و ضلال کے مغالطات و تحریفات کی بھی صفائی ہو اور اس کے ذریعہ علم و واقفیت کے ساتھ دین و شریعت کے بارے میں ذہنوں کو بصیرت اور قلوب کو یقین و اعتماد اور سلف صالحین کے اختیار کئے ہوئے مسلک، اہل سنت کے بارے میں اطمینان بھی حاصل ہو جائے"[۱]

اس کتاب کی تصنیف میں جو (وقت کی ایک بڑی ضرورت تھی) مولانا کی علمی مشغولیتوں

---

[۱] دین و شریعت ص۱۲

اور تبلیغی دوروں کی وجہ سے شاید بہت تاخیر ہوتی کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے ایک تقریب وتحریک پیدا کر دی، محرم ۱۳۷۲ھ (ستمبر ۱۹۵۲ء) میں ہم دونوں نے جو اس وقت لکھنؤ، اس کے اطراف میں نظام الدین کے طرز کی تبلیغی جدوجہد و نقل وحرکت کے ذمہ دار تھے اور ایک ہی جگہ کچہری روڈ لکھنؤ کے تبلیغی مرکز میں قیام تھا، طویل تجربہ اور واقفیت کی بنا پر اس ضرورت کا شدت سے احساس کیا کہ تبلیغی کارکنوں اور ان رفقائے جماعت کی ذہنی تربیت اور ان کی دینی واقفیت میں اضافہ اور توسیع کی ضرورت ہے تاکہ وہ شعوری طور پر خود بھی واقف اور مطمئن ہوں اور دوسروں کو بھی واقف اور مطمئن کر سکیں اس کے لئے ایک تربیتی ہفتہ کا نظام بنایا گیا جس میں دین کے ضروری شعبوں اور پہلوؤں پر ایک جامع معلومات افزا اور مربوط تقریر کی جائے، مولانا نے اسلام کے بنیادی عقائد ومسائل پر اور دین وشریعت کے موضوع پر تقریر کا ذمہ لیا اور میں نے اصلاح وتجدید کی تاریخ اور اس کی اہم شخصیتوں کا عنوان اختیار کیا، پہلی کوشش کے نتیجہ میں زیر تبصرہ "دین وشریعت" جیسی قیمتی ومفید کتاب وجود میں آئی اور دوسری کوشش کے نتیجہ میں "تاریخ دعوت وعزیمت" کا سلسلہ مرتب ہوا جس کا پہلا حصہ ۱۹۰۵ء میں اعظم گڑھ دارالمصنفین کی طرف سے شائع ہوا، پھر مجلس تحقیقات ونشریات اسلام نے اس کو اپنی مطبوعات میں شامل کر لیا اور تحدیث بالنعمۃ کے طور پر اس کا ذکر کیا جاتا ہے کہ حال میں اس کا پانچواں حصہ جو حکیم الاسلام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے عہد اور ان کے اخلاف وخلفاء کے تذکرے پر مشتمل ہے، مرتب ہوا اور طباعت کے لئے پریس جا رہا ہے۔[1]

مولانا نے ان تقریروں کی یادداشت کو سامنے رکھ کر جو بعض دوستوں نے

---

[1] الحمد للہ یہ حصہ طبع ہو گیا ہے۔ ۱۲

قلم بند کرلی تھی اور جس میں قدرتاً خطابی انداز تھا، اسکو ایک مکمل اور منضبط کتاب کی شکل میں ڈھال لیا، جس اجمال کی قدرے تفصیل کی ضرورت تھی اسکی تفصیل کی، اور جن مضامین کا اضافہ ضروری اور مفید محسوس کیا اسکا اضافہ کیا۔ اسطرح یہ کتاب مسلمان تعلیمیافتہ کیلئے اور ان غیر مسلموں کیلئے بھی جو اسلام کو کسی حد تک علمی و عقلی اور عملی طور پر سمجھنا چاہتے ہیں، ایک رہنما اور معلم کتاب بن گئی، کتاب کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ عام فہم ہونے کے ساتھ اس میں دین کے صحیح فہم مطالعہ اور صحبت کا نچوڑ آگیا ہے، اسی کے ساتھ اس میں توازن، حقیقت پسندی بھی ہے اور وہ مولانا کی عمومی تحریری خصوصیت کے مطابق حشو و زوائد سے پاک ہے، مولانا نے تفہیم کے لئے بعض ذاتی واقعات اور دقیق حقائق سمجھانے کے لئے بعض مکالمے بھی نقل کئے ہیں، جدید ذہن اور لٹریچر کو سامنے رکھتے ہوئے بعض ایسے مضامین بھی آگئے ہیں جو عقائد کی عربی کتابوں میں نہیں ملیں گے، مثلاً وحدت ادیان کے فتنہ کا رد، منکرین حدیث کی گمراہی کا بیان، اہل السنۃ والجماعۃ کے بنیادی امتیاز کا اظہار، نئے زمانے کے نئے بتوں کا تذکرہ، نفس پرستی پر ضرب، اعجاز قرآن پر مختصر لیکن مفید بحث، ارکان اربعہ کی اصل روح اور مقصد کی توضیح، اس سلسلہ میں مولانا نے ایک اہم نکتہ کی طرف اشارہ کیا ہے کہ نماز کا تعلق اللہ کی صفت حاکمیت سے بھی ہے اور محبوبیت سے بھی اور نماز ایمان کا خارجی وجود ہے، نیز یہ کہ ارکان میں حقیقت پیدا کرنے کی کوشش احیاء دین کا بنیادی کام ہے، وہ امراض کے ساتھ ساتھ تدبیر و علاج بھی بتاتے چلتے ہیں۔ بعض قدیم و دقیق کلامی مسائل کی بڑی خوبی سے تلخیص و تسہیل کی ہے، مثلاً رویت باری، جبر و قدر کا مسئلہ، آخرت کی ضرورت؟ اور یہ کہ جزا و سزا اس دنیا میں کیوں نہیں دی جاتی، سلف صالحین کے اتباع کی کیا اہمیت ہے؟ خلافت راشدہ کی عظمت و انفرادیت، سیاست

وحکومت کے بارے میں متوازن ومعتدل نقطۂ نظر اور جامع گفتگو۔

کتاب کی ایک خوبی یہ ہے کہ اس میں دبہت سی اصلاحی و دعوتی کتابوں کے برخلاف اخلاق کی اہمیت، معاملات ومعاشرت، دین کی خدمت ونصرت جہاد فی سبیل اللہ، دعوت حق، امر بالمعروف نہی عن المنکر پر پورا زور دیا گیا ہے اور ان پر مستقل ابواب اور مضامین ہیں، آخر میں احسان وتصوف کی بحث ہے، اس سلسلہ میں تصوف کے اغلاط کی نشاندہی بھی کی گئی ہے اور طالبین کے لئے لائحہ عمل مرتب طریقہ پر پیش کر دیا گیا ہے، اس طرح اس کتاب نے دین کی تفہیم اور اسلام کی ضروری تعلیم کے ساتھ، ایک مختصر لیکن جامع رہنمائے زندگی کی حیثیت اختیار کر لی ہے، جس کو ایک مشغول ومتوسط درجہ کا آدمی اپنی زندگی کا دستور عمل بنا سکتا ہے، اس کے ساتھ ایک خوبی یہ ہے کہ اسلام کو سمجھنے کے لئے کسی طالب حق غیر مسلم کے ہاتھ میں اس کا انگریزی ترجمہ بے تکلف دیا جا سکتا ہے۔

اب جبکہ مصنف کی نظر ثانی اور کچھ اضافات وترمیمات کے بعد اس کا جدید ایڈیشن شائع ہونے کو جا رہا ہے، راقم سطور ان چند سطور کے لکھنے کی (جن کو اس سے بہت پہلے لکھا جانا چاہیئے تھا) سعادت حاصل کر کے اس کار خیر میں برائے نام شرکت حاصل کر رہا ہے۔

ابوالحسن علی ندوی
دائرہ شاہ علم اللہ حسنیؒ
۸ر جمادی الاولیٰ سنہ ۱۴۰۳ھ
۱۱ر فروری سنہ ۱۹۸۳ء

شکرِ نعمت، اور پیش لفظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

رَبِّ اَوْزِعْنِيْٓ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلٰي وَالِدَيَّ
وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ وَاَدْخِلْنِيْ بِرَحْمَتِكَ فِيْ
عِبَادِكَ الصّٰلِحِيْنَ[۱]

رب العزت جلّ جلالہٗ وعم نوالہٗ کے انعامات واحسانات اپنے اس سیاہ کار بندہ پر بےحد وبیشمار ہیں اور اُن میں سب سے بڑا انعام واحسان یہ ہے کہ محض اپنے فضل سے اُس نے ایک اسلامی گھرانے میں پیدا فرماکر مجھے پیدائشی مسلمان بنایا اور پھر میرے مرحوم والد ماجد کو توفیق دی کہ دنیوی تعلیم اور اس کے ذریعہ دنیوی ترقی کے خاص امکانات وترغیبات بلکہ بعض خاص سہولتیں حاصل ہونے کے باوجود انہوں نے محض جذبۂ خدا طلبی کے تحت میرے بارے میں یہ فیصلہ کیا کہ دین کی خدمت کے لئے میں علمِ دین حاصل کروں، پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے کرم اور والد مرحوم کی نیت کی برکت سے مجھے علمِ دین کا کچھ حصہ عطا بھی فرما دیا، پھر اُس نے دین کی ٹوٹی پھوٹی خدمت کی بھی کچھ توفیق دی ؎

من آں خاکم کہ ابرِ نوبہاری　　کند از لطف بر من قطرہ باری

---

[۱] "اے پروردگار! مجھے توفیق دے کہ تیری ان نعمتوں کا شکر ادا کروں جو تو نے مجھے اور میرے والدین کو عطا فرمائیں اور توفیق دے کہ ایسے نیک عمل کروں جن کو تیری رضامندی حاصل ہو اور اپنی رحمت سے مجھے اپنے نیک بندوں میں شامل فرما!" (قرآن مجید سورۂ نمل میں حضرت سلیمان علیہ السلام کی یہ دعا نقل فرمائی گئی ہے)۔

اگر بر روید از تن صد زبانم   چو سوسن شکر لطفش کے توانم

اسی سلسلہ کا ایک خاص احسان وانعام یہ بھی ہے کہ اُس نے چھوٹی بڑی متعدد ایسی کتابیں میرے قلم سے لکھوائیں، جو اس کے دینی اصلاح کا بہانہ بنیں۔ ان سب کتابوں کو اللہ کے فضل سے یہ قبولیت تو اس دنیا ہی میں نصیب ہو گئی کہ دینی حلقوں میں عام طور سے ان کو پسند کیا گیا اور نافع اور مفید سمجھا گیا، نیز ان کی اشاعت بھی بفضلہ تعالیٰ اس سے بہت زیادہ ہوئی جتنی کہ مجھ جیسے کسی بے ہنر اور بے سلیقہ مصنف کی کتابوں کی ہونی چاہئے اور آخرت میں بھی ان کی قبولیت کی میں اپنے رب کریم کے رحم وکرم سے امید رکھتا ہوں اور دعا کرتا ہوں.

اَللّٰھُمَّ لَا تَجْعَلْنِیْ بِدُعَائِكَ شَقِیًّا۔

میری ان کتابوں میں اللہ تعالیٰ نے خاص کر "اسلام کیا ہے؟" کو جو تاثیر اور قبولیت اس دنیا میں عطا فرمائی ہے اُس کو دیکھتے ہوئے اس عاجز کو اس کی بڑی امید ہے کہ انشاء اللہ وہ آخرت میں بھی میری نجات اور مغفرت کا ذریعہ بن جائے گی۔

"اسلام کیا ہے؟" کی قبولیت ونافعیت کا خاص ظاہری سبب میری نظر میں یہ ہے کہ وہ اسلامی تعلیمات کو خاصی حد تک جامع ہے اور اس کا طرز بیان سادہ اور زبان آسان ہے، لیکن چونکہ اس کے لکھتے وقت بیچارے سادہ دل، کم تعلیمیافتہ عوام ہی کو سامنے رکھا گیا ہے، اس لئے اس میں مشککین کے شکوک وشبہات اور اہل زیغ کے خیالات سے بالکل تعرض نہیں کیا گیا تھا۔

"اسلام کیا ہے؟" کی اشاعت کے کچھ ہی دنوں بعد سے مجھے خیال تھا کہ ایسی ہی جامع اس سے آگے کے درجہ کی ایک کتاب اور تیار ہونی چاہئے، جس میں اسلامی اصول وتعلیمات کو اس طرح پیش کیا جائے کہ دلوں سے عہد حاضر کے ملحدانہ شکوک وشبہات اور اہل زیغ د

ضلال کے مغالطات و تحریفات کی بھی صفائی ہو اور اُس کے ذریعہ علم و واقفیت کے ساتھ دین و شریعت کے بارے میں ذہنوں کو بصیرت اور قلوب کو یقین و اعتماد اور سلف صالحین کے اختیار کئے ہوئے مسلکِ اہلسنت کے بارے میں اطمینان بھی حاصل ہوتا چلا جائے۔

یہ کتاب جو اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے، اس عاجز کے نزدیک ——— واللہ اعلم بحقیقۃ الحال ——— اسی آرزو کی عملی شکل ہے۔ اس کی ترتیب و تالیف کی تاریخ بھی قابل ذکر ہے۔

سنہ ۱۳۷۲ھ کے شروع میں، لکھنؤ کے ہمارے دینی دوستوں اور رفیقوں نے آٹھ دن کا ایک تعلیمی و تربیتی پروگرام بنایا اور میرے ذمہ اُس سلسلہ میں یہ کام کیا، کہ "دین و شریعت کے عنوان پر روزانہ ایک گھنٹہ تقریر کر دیا کروں اور اس کی کوشش کروں کہ آٹھ تقریروں میں "دین و شریعت" کے تمام شعبوں پر ایسی اصولی اور بقدر ضرورت تفصیلی روشنی پڑ جائے، جس سے اس کے بارے میں وہ بصیرت و اطمینان حاصل ہو سکے، جس کی فی زمانہ خاص ضرورت ہے، میں نے اپنی تقریروں کا نقشہ اسی مقصد کو سامنے رکھ کر مرتب کیا، اور مقررہ تاریخ آ جانے پر ان تقریروں کا سلسلہ شروع ہو گیا، چھ دن کی تقریروں میں میں نے اپنے نقشہ کے مطابق ایمانیات، عبادات، اخلاق، معاشرت و معاملات کے شعبوں پر گفتگو کی، لیکن اللہ کی مشیت کہ چھٹے دن تقریر کے دوران ہی میں مجھے بخار ہو گیا، جس کی وجہ سے دین کے اُن شعبوں کا بیان بالکل رہ گیا جن پر میں ساتویں اور آٹھویں دن گفتگو کرنا چاہتا تھا۔ یَفْعَلُ اللّٰہُ مَا یَشَآءُ وَ یَحْکُمُ مَا یُرِیْدُ ۝

اس پروگرام کے سلسلہ کی تقریروں کے ساتھ ساتھ قلمبند ہونے کا بھی خاص انتظام کیا گیا تھا۔ جو چھ تقریریں میں نے کی تھیں، جب چند روز کے بعد وہ صاف ہو کر نظر ثانی کے لئے میرے پاس آئیں تو میں نے محسوس کیا کہ اگر ان میں معمولی ترمیم کر کے ایک مسلسل تصنیف

کی شکل اُن کو دے دی جائے اور میرے مریض ہو جانے کی وجہ سے جن شعبوں پر گفتگو نہیں ہو سکی، اُن پر لکھ کر اس کی کو پورا کر دیا جائے، تو وہ کتاب تیار ہو جائے گی جس کی ہمیں آج کل کے ذہین اور تعلیمیافتہ طبقہ کے لئے "اسلام کیا ہے؟" کی اشاعت کے بعد سے ضرورت محسوس کر رہا تھا۔

جو چھ تقریریں قلمبند ہو کر میرے پاس آگئی تھیں، نظرثانی اور معمولی ترمیمیں کر کے اُن کو تو اُسی زمانہ میں "ماہنامہ الفرقان" کی ایک خاص اشاعت میں "دین و شریعت" ہی کے عنوان سے شائع کر دیا گیا تھا، لیکن جو کام اس سلسلہ میں اس وقت رہ گیا تھا، دوسری مصروفیتوں کی وجہ سے وہ برابر مؤخر ہوتا رہا، اب اللہ تعالیٰ کی توفیق سے وہ بھی انجام پا گیا اور اب وہ اس مکمل کتاب کی صورت میں آپ کے سامنے ہے۔ فَالْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ بِعِزَّتِہٖ وَجَلَالِہٖ تَتِمُّ الصّٰلِحَاتُ ٥

جو مقالہ میری چھ تقریروں سے مرتب ہو کر "دین و شریعت" ہی کے عنوان سے ۱۳۸۲ھ میں الفرقان کی ایک خاص اشاعت میں شائع ہوا تھا وہ بھی اس میں لے لیا گیا ہے لیکن اس میں جابجا کئی کئی صفحے کے اضافے اور کافی ترمیمیں کی گئی ہیں اور آخر میں "دین کی خدمت و نصرت" اور "سیاست و حکومت" اور "احسان و تصوف" کے شعبوں پر جو کچھ لکھا گیا ہے وہ مستقل اضافہ ہے اور وہ کتاب کا قریباً ایک تہائی حصہ ہے۔

یہ عاجز اس کتاب کی تالیف کو بھی اللہ تعالیٰ کا خاص انعام سمجھتا ہے اور امید رکھتا ہے کہ انشاء اللہ ناظرین کو اس کے مطالعہ سے "دین و شریعت" کے بارے میں ذہنی بصیرت بھی حاصل ہوگی اور قلبی اطمینان بھی اور عمل کا شوق و جذبہ بھی اور یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہوگا۔ کُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ!

چند ضروری باتیں:۔

(۱) اس کتاب میں کہیں تقریر کا انداز محسوس ہوگا اور کہیں تصنیف و تحریر کا لیکن اس کتاب کی تیاری کی جو تاریخ اوپر ذکر کی جاچکی ہے اُس کے بعد اس سلسلہ میں کسی وضاحت اور معذرت کی ضرورت نہیں، ابتدائی حصہ میں یعنی ایمانیات اور عبادات کے بیان میں تقریر کا رنگ کہیں کہیں زیادہ نمایاں ہے، اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ ان مقامات پر سلسلہ کلام، موضوع کا بہت زیادہ پابند نہیں رہا ہے، مثلاً نبوت و رسالت کے بیان میں انبیاء علیہم السلام کے اجتہاد کے ذکر کے ساتھ ائمہ مجتہدین کے اجتہاد کا بھی ذکر آگیا ہے، اسی طرح معجزہ کی بحث میں کرامت کا اور پھر اولیاء اللہ کا اور اُن کے مقام اور اُن کے حقوق کا بھی ذکر آگیا ہے اور تقریر کی روانی میں ایسا ہونا بالکل قدرتی ہے اور اصولاً صحیح بھی ہے۔

(۲) "دین کی خدمت و نصرت" کے شعبہ پر جو کچھ لکھا گیا ہے، اس کے لکھتے وقت میں نے دین کی خدمت کرنے والی اس دور کی کسی جماعت اور حلقہ کو سامنے نہیں رکھا ہے، بلکہ اس شعبہ سے متعلق دین کے جو مطالبات اور جو اصول و احکام ہیں اور اللہ و رسول کی طرف سے جو تاکیدیں اور ترغیبیں ہیں بس ان کو ایک خاص ترتیب سے مرتب کر کے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

(۳) اسی طرح "سیاست و حکومت" کے بیان میں کسی خاص ملک کی سیاست و حکومت کو سامنے نہیں رکھا گیا ہے، بلکہ اس شعبہ سے متعلق اسلام کی اصولی تعلیمات و ہدایات کا ذکر کیا گیا ہے اور "اسلامی اقتدار" اور "غیر اسلامی اقتدار" کے علاقوں میں رہنے والے مسلمانوں کے احوال و امکانات کے اختلاف کی وجہ سے دین کے احکام و مطالبات میں جو فرق پڑ جاتا ہے بس اصولی درجہ میں اس کو ظاہر کیا گیا ہے، خاص خاص ملکوں کے سیاسی

مسائل (جن کی نوعیت دوامی نہیں بلکہ وقتی ہوتی ہے) ان سے تعرض اس کتاب میں مناسب بھی نہیں تھا، ان مسائل و مباحث کی مناسب جگہ مجلاّتی مضامین و مقالات ہیں۔ ہاں! سیاست و حکومت کے شعبہ ہی سے متعلق ایک بات بطور استدراک کے یہاں لکھنی ضروری ہے، کتاب مکمل ہو جانے کے بعد اس بیان کو پڑھا تو محسوس ہوا کہ یہ بات اس میں جتنی صفائی اور صراحت سے آنی چاہئے تھی نہیں آئی ہے کہ اسلام چونکہ صرف عقائد و عبادات ہی کا داعی نہیں ہے بلکہ وہ پوری انسانی زندگی کی تنظیم خدا پرستی اور روحانیت و مادیت کے صحیح توازن کی بنیاد پر کرنے کا علمبردار ہے اور یہ کام بغیر حکومتی اقتدار کے پورے طور سے انجام نہیں پاسکتا اس لئے حکومت بھی اسلام کے نظام و پروگرام کا ایک اہم جز ہے اور یہ مسلمان کا دین و ایمان ہے، لیکن اس کا یہ تقاضا ہرگز نہیں ہے کہ جس علاقہ میں اقتدار اسلامی نہ ہو، وہاں رہنا مسلمان کے لئے جائز ہی نہ ہو، یا کاروبار حکومت سے بالکل الگ رہنا اس کے لئے ضروری ہو، بلکہ اس کا فیصلہ دین و شریعت کی روشنی میں مختلف احوال میں مختلف ہوگا۔ غیر اسلامی حکومتوں کے حالات ایسے بھی ہو سکتے ہیں کہ مسلمانوں کے لئے شرعاً ان میں شرکت و تعاون کی گنجائش ہی نہ ہو اور ایسے بھی ہو سکتے ہیں کہ اشتراک و تعاون ہی میں اسلام اور مسلمانوں کی مصلحت ہو، اصل بات بس یہ ہے کہ جو کچھ ہو دین و شریعت کی روشنی میں اور اسکی قائم کی ہوئی حدود کا پابند رہ کر ہو اور دنیا طلبی کے تحت نہ ہو، بلکہ اللہ طلبی کے تحت ہو۔

(۴) "احسان اور تصوف" کے موضوع پر جو کچھ اس عاجز نے لکھا ہے وہ دراصل اپنے بزرگوں سے سنی سنائی یا انکی کتابوں میں دیکھی بھالی باتیں ہیں، ورنہ میں اپنی آرام طلبی اور بے عملی کی وجہ سے اس دولت سے محروم ہوں، ہاں اس دولت والوں کو دیکھا اور پایا ہے اور اللہ تعالیٰ نے ان کی محبت بھی دی ہے بس حدیث نبوی "اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ" میرا سہارا ہے

أَحِبُّ الصَّالِحِيْنَ وَلَسْتُ مِنْهُمْ لَعَلَّ اللّٰهَ يَرْزُقُنِيْ صَلَاحًا

(۵) آیتوں اور حدیثوں کے ترجموں میں میں نے لفظی ترجمہ اور نحوی ترکیب کی پابندی نہیں کی ہے بلکہ ناظرین کی سہولتِ فہم کے لئے اکثر آزاد ترجمہ کیا ہے اور بس مطلب ادا کر دینا پیشِ نظر رکھا ہے۔

(۶) اکثر صفحات پر خفی قلم سے لکھے ہوئے چھوٹے چھوٹے جو عنوانات ہیں وہ سب اصل مضمون لکھنے کے بعد لکھے گئے ہیں اور اُن کا مقصد پیراگراف کے مضمون کی طرف رہنمائی ہے، گویا ان کی حیثیت وہ ہے جو پہلے زمانہ میں فارسی اُردو کی کتابوں میں حاشیہ پر لکھے ہوئے "فائدوں" کی ہوتی تھی۔ بہرحال وہ اصل مضمون کا جز نہیں ہیں، مضمون ان کو چھوڑ کر مسلسل ہے اور اسی لئے اُن کو جدولوں سے بند کر دیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ اِس کتاب کو دنیا میں قبولیت و نافعیت عطا فرمائے اور آخرت میں اس کو میرے لئے ذریعۂ مغفرت و رحمت بنائے اور میرے تمام دینی مربیوں محسنوں کے حسنات میں اس کتاب کو بھی شامل فرمائے۔ وَمَا هُوَ عَلَيْهِ بِعَزِيْزٍ ۝

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

صفر ۱۳۷۸ھ (ستمبر ۱۹۵۸ء)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الحمد للہ رب العٰلمین والصلوٰۃ والسلام علی سیدنا محمد خاتم النبیین وآلہ واصحابہ اجمعین۔

دین وشریعت کی بنیاد اور اسکے دو حصے اعتقادی وعملی

سب سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ دین اسلام اور اسلامی شریعت کی بنیاد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم وہدایت پر ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو علوم اور احکام آپ لائے جو قرآن مجید میں اور حدیثوں میں محفوظ ہیں۔ وہی دین اسلام کی اساس اور بنیاد ہیں پھر ان میں سے کچھ کا تعلق اعتقاد سے ہے اور کچھ کا اعمال سے۔ یعنی آپ کی لائی ہوئی ہدایت میں ایک حصہ تو وہ ہے جس میں کچھ ایسی حقیقتوں کی اطلاع دی گئی ہے جن کو ہم از خود نہیں جان سکتے تھے اور ہم کو یہ حکم ہے کہ ان حقیقتوں کو ہم مانیں اور ان پر ایمان لائیں۔ یہ اسلام کا ایمانی اور اعتقادی حصہ ہے اور یہ بنیادی اہمیت رکھتا ہے اور دوسرا حصہ وہ ہے جس میں عملی زندگی کے متعلق احکام ہیں کہ یہ کام کرو اور یہ نہ کرو، یہ اسلام کا عملی حصہ ہے اور پھر اس میں بہت سے شعبے ہیں۔ مثلاً عبادات کا شعبہ، اخلاق اور آداب کا شعبہ، معاملات کا شعبہ، معاشرت کا شعبہ، دین کی دعوت ونصرت کا شعبہ،

سیاست وحکومت کا شعبہ وغیرہ وغیرہ۔ اسلام ان سب کو حاوی ہے اور یہ سب اس کی شاخیں ہیں۔

آئندہ اوراق میں انشاء اللہ اسلام کے ان سب شعبوں کے متعلق اصولی اور ضروری ضروری باتیں بیان کی جائیں گی۔

سب سے پہلے ایمانی اور اعتقادی حصے کے متعلق کچھ عرض کیا جاتا ہے۔

ایمان پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ دین و شریعت کی خاص اصطلاح میں ایمان اس کو کہتے ہیں کہ اللہ کے رسول کو اللہ کا رسول مانا جائے اور یقین کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ ہماری ہدایت کے واسطے وحی کے ذریعہ ان کو بہت سی وہ باتیں بتلاتا ہے، جو ہم آنکھ، کان وغیرہ اپنے علمی ذرائع سے معلوم نہیں کر سکتے اور اس بناء پر اُن کی ان سب باتوں کی تصدیق کی جائے، جو وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے پہنچائیں اور ان پر یقین کیا جائے اور ان کے لائے ہوئے دین کو دینِ حق کی حیثیت سے قبول کیا جائے۔ پس کسی آدمی کے مومن ہونے کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ ان سب باتوں کو حق مانے جن کی اطلاع اللہ کے پیغمبر نے دی، اگر ان میں سے کسی ایک چیز کا بھی کسی نے انکار کیا تو وہ مومن نہیں ہو سکتا، مثلاً اگر کوئی شخص کہے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا رسول بھی مانتا ہوں اور آپ نے اللہ کی توحید اور اس کی صفات کے بارے میں جو کچھ بتلایا ہے اُس کو بھی میں حق مانتا ہوں، لیکن قیامت اور جنت و دوزخ کے متعلق جو کچھ آپ نے اطلاعیں دی ہیں (جو ہم قرآن و حدیث میں پڑھتے ہیں) اُن کو میری عقل قبول نہیں کرتی، لہٰذا میں اس کو تسلیم نہیں کرتا، تو ایسا شخص مومن نہیں ہو سکتا۔

الغرض ایمان اس کا نام ہے کہ "کل ماجاء بہ الرسول من عند اللہ" کی

تصدیق کی جائے، یعنی ان سب باتوں کو حق مانا جائے اور قبول کیا جائے جو پیغمبر، اللہ کی طرف سے پہنچائے اور بتلائے[1]۔

عقائد اور ایمانیات اس کے بعد معلوم ہونا چاہیے کہ جن باتوں پر ایمان لانے اور اعتقاد رکھنے کا ہم سے مطالبہ کیا گیا ہے، اُن میں سے کچھ کا تعلق اللہ کی ذات و صفات سے ہے اور کچھ کا تعلق دوسری چیزوں سے ہے مثلاً:۔ رسُولوں سے، ملائکہ سے، قیامت سے، ہم پہلے دین کے اُس ایمانی اور اعتقادی حصے کو لیتے ہیں جس کا تعلق اللہ تعالیٰ سے ہے، کیونکہ مقصدی حیثیت سے یہی حصہ سب سے زیادہ اہم ہے۔

اللہ تعالیٰ کی ہستی اس سلسلہ میں سب سے پہلی بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ہستی کو مانا جائے یعنی اس پر یقین کیا جائے کہ اس ساری کائنات کی پیدا کرنے والی اور عالم کے اس کارخانہ کو چلانے والی ایک ہستی ہے اور وہ اللہ ہے۔

یہاں ایک بات یہ بھی سمجھ لینی چاہیے کہ تاریخ سے اور دنیا کی مذہبی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ہستی کا عقیدہ دنیا کی قوموں میں ہمیشہ سے رہا ہے، یعنی اتنی بات

---

[1] جو لوگ اللہ کے کسی پیغمبر کی حیاتِ مقدسہ میں براہِ راست ان کی زبان سے اُن کی ہدایت اور تعلیم سُنیں، اُن کے لئے تو اُن کی ہر اُس بات کی تصدیق شرطِ ایمان ہے، جو وہ پیغمبر اُن کے سامنے اللہ کی طرف سے بیان کریں، اگر وہ اُن کی ایسی ایک بات کا بھی انکار کریں گے تو مومن نہ رہیں گے، لیکن جب پیغمبر دنیا میں نہ ہوں تو صرف اُن باتوں کی تصدیق کرنا شرطِ ایمان ہے جن کا ثبوت ان پیغمبر سے ایسے یقینی قطعی اور بدیہی طریقہ سے ہو جس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہ ہو، دین کی ایسی تعلیمات کو خاص علمی اصطلاح میں ضروریاتِ دین کہتے ہیں، ان سب پر ایمان لانا شرطِ ایمان ہے، اگر ان میں سے کسی ایک کا بھی کوئی انکار کرے تو مومن نہیں رہے گا اور اگر وہ پہلے مسلمان تھا تو اسلام سے اس کا رشتہ کٹ جائے گا۔ ۱۲

ہر زمانہ میں اور تمام قوموں میں مانی جاتی رہی ہے کہ اس دنیا کا کوئی پیدا کرنے والا ہے اور وہ بڑی طاقتوں والا ہے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں مختلف زمانوں اور مختلف قوموں میں آنے والے جن پیغمبروں کا ذکر کیا گیا ہے ان کی تعلیم اور دعوت کے سلسلہ میں توحید وغیرہ کا تو ذکر آتا ہے لیکن اسکا پتہ نہیں چلتا کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی ہستی کے ماننے پر کوئی خاص زور دینے کی ضرورت سمجھی ہو۔

خود قرآن مجید کا رویہ بھی یہی ہے کہ اللہ کی توحید اور اسکی صفات کے بیان سے تو وہ بھرا ہوا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی ہستی اور اسکا وجود منوانے پر اس میں اتنا زیادہ زور نہیں دیا گیا ہے اسکی وجہ یہی ہے کہ اسی انسانی دنیا کا گویا یہ ایک مسلّمہ مسئلہ رہا ہے اور انسانوں کی فطرت اگر بالکل مسخ نہ ہو جائے تو اس کائنات کے پیدا کرنے والے کی ہستی کا مسئلہ ان کیلئے ایسا ہی فطری اور بدیہی ہے جیسا کہ اپنے وجود اور اپنی ہستی کا مسئلہ اور یہی وجہ ہے کہ ہمارے اس زمانہ میں بھی جسکو دہریت کا زمانہ کہا جاتا ہے اُن مغربی ممالک میں بھی جو دہریت کا سرچشمہ سمجھے جاتے ہیں اللہ کے منکروں کی تعداد اللہ کے ماننے والوں کے مقابلہ میں آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں ہے حتیٰ کہ روس جو دہریت اور اللہ دشمنی کا مرکز سمجھا جاتا ہے وہاں بھی اللہ کے منکر اللہ کے ماننے والوں کی نسبت تھوڑے ہی ہیں۔[1]

بہرحال ہمارا خیال ہے کہ اسی لئے اس مسئلہ کو زیادہ قابل بحث نہیں سمجھا گیا لیکن اسکا یہ مطلب نہیں ہے کہ قرآن پاک نے اس مسئلہ کو بالکل بے دلیل چھوڑ دیا ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ اس مسئلہ کے بالکل فطری اور بدیہی ہونے کی وجہ سے اس پر ایسی توجہ نہیں دی گئی جیسی کہ توحید پر یا صفاتِ الٰہی پر دی گئی ہے بلکہ سوچنے والوں کیلئے معمولی اشارات اور کچھ اشارے کر دینا کافی سمجھا گیا ہے، مثلاً ایک جگہ فرمایا گیا ہے:

---

[1] ابھی ۸ جنوری ۱۹۶۰ء کے روزنامہ قومی آواز لکھنؤ میں جرمنی کے شہر فرینکفرٹ سے چرچ لیڈر پاسٹر نی مولر کا ایک بیان شائع ہوا ہے جس میں موصوف نے اپنے روس کے حالیہ دورے کے تاثرات اور مشاہدات بیان کئے ہیں اس کے چند فقرے یہ ہیں "اندازاً اس وقت روس کی ۵۰ فیصدی آبادی گرجا گھروں سے متعلق ہے۔ اس وقت خود ماسکو میں ۵۰ گرجا گھر موجود ہیں اور ان کے علاوہ پورے سوویت یونین میں ۲۰ ہزار گرجا گھر قائم ہیں اور گرجا گھر کے بڑے پادری سے لے کر معمولی راہبوں تک کو کلیساؤں کی ترقی کی امید ہے۔" (قومی آواز ۸ جنوری ۱۹۶۰ء کالم ۱-۲)۔ یہ بیان پاسٹر نی مولر نے عالمی چرچ کونسل کی سنٹرل کمیٹی کے ممبران کے سامنے دیا ہے۔ م م

اِنَّ اللّٰہَ فٰلِقُ الۡحَبِّ وَالنَّوٰی یُخۡرِجُ الۡحَیَّ مِنَ الۡمَیِّتِ وَمُخۡرِجُ الۡمَیِّتِ مِنَ الۡحَیِّ ذٰلِکُمُ اللّٰہُ فَاَنّٰی تُؤۡفَکُوۡنَ ۝ (الانعام - ع - ۱۲)

بیشک اللہ ہی ہے پھاڑنے والا دانے اور گٹھلی کا، وہی نکالتا ہے زندہ کو مردہ سے اور نکالنے والا ہے مردہ کو زندہ سے یہ سب کرنے والا اللہ ہی ہے پھر تم کدھر بہکے جاتے ہو۔

مطلب یہ ہے کہ انسان برابر دیکھتے ہیں اور تجربہ کرتے ہیں کہ غلہ کے کسی دانہ کو یا کسی پھل کی گٹھلی کو زمین میں دبا دیا جاتا ہے، پھر وہ دانہ اور گٹھلی اندر ہی اندر پھٹتے ہیں اور اُن میں سے ایک نہایت نرم و نازک ریشہ نکلتا ہے اور وہ سطح زمین کو چیرتا ہوا اوپر نکل آتا ہے، تو غور کرنے کی بات یہ ہے کہ اس دانہ کو یا گٹھلی کو زمین کے اندر کس نے قاعدہ سے شگاف دیا، اور کس نے اس بے جان اور سوکھے ہوئے دانہ یا گٹھلی میں سے وہ ہرا جاندار ریشہ یعنی انکھوا نکالا، پھر وہ ریشہ جو ریشم کے دھاگے سے بھی زیادہ نرم ہوتا ہے، کس کی طاقت اور کارفرمائی سے زمین کو چیرتا ہوا اوپر نکل آیا؟ ——— تو قرآن پاک کی اس آیت میں بتلایا گیا کہ بس سمجھ لو کہ یہ سب کچھ اللہ کی قدرت سے اور اسی کی کارفرمائی سے ہوا اور یہ سب کچھ اللہ ہی نے کیا (اِنَّ اللّٰہَ فٰلِقُ الۡحَبِّ وَالنَّوٰی)۔ آگے فرمایا، اسی طرح تم دیکھتے ہو کہ ایک بالکل بے جان چیز میں سے جاندار چیز پیدا ہو جاتی ہے، مثلاً بے جان انڈے میں سے بولنے چہکنے والی اور آسمان کی فضا میں اُڑنے والی چڑیا نکل آتی ہے اور بعض جاندار چیزیں بجائے جاندار بچہ جننے کے بے جان انڈا دیتی ہیں اور پھر اُسی بے جان انڈے سے جاندار بچہ نکل آتا ہے، قرآن مجید انسان کے اس روزمرہ کے تجربہ اور مشاہدہ کو اس کے سامنے رکھ کر کہتا ہے کہ یہ سب کرشمے اللہ ہی کی قدرت کے ہیں اور یہ سب کچھ کرنے والا اللہ ہی ہے، پس جو لوگ قدرتِ الٰہی کی ان کھلی کارفرمائیوں کو دیکھنے کے باوجود اللہ کو نہیں جانتے اور نہیں

پچھلے تھے، اُن کی آنکھوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں اور اُن کی عقلیں ماری گئی ہیں۔

اسی طرح ایک جگہ فرمایا گیا:-

"وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِّلْمُوقِنِينَ وَفِي أَنفُسِكُمْ أَفَلَا تُبْصِرُونَ" (ذاریت - ع - ۱)

اور یقین لانے والوں کے لیے زمین میں ہماری نشانیاں پھیلی ہوئی ہیں اور خود تمہارے اندر بھی ہیں، تو کیا تم کو دکھلائی نہیں دیتا۔

مطلب یہ ہے کہ انسان اگر اپنی بصیرت سے کام لے اور دیکھنا چاہے تو زمین میں ہماری ہستی اور ہماری قدرت کی نشانیاں پھیلی ہوئی ہیں اور خود انسانوں کے وجود میں ہماری کچھ نشانیاں موجود ہیں، ذرا انسان غور تو کرے کہ ماں کے رحم میں اس کی یہ حسین و موزوں صورت کس نے بنائی؟ کس نے دیکھنے والی آنکھ بنائی؟ کس نے سننے والے کان بنائے؟ کس نے ذائقہ لینے والی زبان اور سونگھنے والی ناک بنائی؟ کس نے اس کی زبان کو گویائی دی؟ کس نے ماں کے پستانوں میں اس کے لئے دودھ کی نہر جاری کی؟ کس کے قبضہ میں اس کی موت اور زندگی ہے؟ —— انسان اگر خود اپنے بارہ میں اس طرح غور کرے تو ہر سوال کا جواب خود اس کی عقل یہی دے گی، کہ یہ سب کچھ نظر نہ آنے والی ایک قدرت و حکمت والی ہستی نے کیا اور وہی اللہ ہے۔

اور ایک اور جگہ بڑے عجیب سوالیہ پیرایہ میں فرمایا گیا۔

"أَفِي اللَّهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ" (ابراہیم - ع - ۲)

کیا اس اللہ کی ہستی میں کسی کو شک ہو سکتا ہے جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے!

یعنی جو شخص زمین کو دیکھتا ہے اور زمین پر جو کچھ ہوتا رہتا ہے اُس کو بھی دیکھتا رہتا ہے اور اوپر جو آسمان اور ستارے وغیرہ نظر آتے ہیں اُن کو دیکھتا ہے، اس کے لئے زمین و

آسمان کے خالق کے بارے میں شک کرنے کی کیا گنجائش ہو سکتی ہے؟

اللہ کی ہستی کے موضوع پر ایک دلچسپ گفتگو اور عام فہم استدلال

ایک دفعہ ایک ایسے صاحب سے گفتگو کرتے ہوئے جو اللہ تعالیٰ کی ہستی کے بارہ میں شک رکھتے تھے اور اس پر بحث کرنا چاہتے تھے، راقم سطور نے اپنی جیب سے کاغذ کا ایک پرزہ نکال کر اُن کے سامنے رکھتے ہوئے کہا کہ اگر میں یہ کہوں کہ اس کاغذ پر جو حروف لکھے ہوئے ہیں وہ کسی لکھنے والے نے نہیں لکھے ہیں، بلکہ آپ سے آپ لکھے گئے ہیں، تو کیا آپ میری اس بات کو مان لیں گے یا اس کا امکان بھی تسلیم کریں گے؟ انہوں نے کہا، نہیں، یہ ناممکن ہے۔ پھر میں نے کہا، اور اگر اسی طرح میں اپنی گھڑی کے متعلق آپ سے کہوں کہ یہ کسی بنانے والے نے بنائی نہیں ہے بلکہ آپ سے آپ یہ بن گئی ہے، یا اپنے اس فونٹین پن کے بارے میں دعویٰ کروں کہ یہ کسی بنانے والے نے بنایا نہیں ہے بلکہ یوں ہی آپ سے آپ بن کر آسمان سے گر پڑا ہے، یا اگر کسی دوڑتی ہوئی موٹر کے متعلق میں آپ سے کہوں کہ اس کو کسی نے بنایا نہیں ہے بلکہ یہ آپ سے آپ بن گئی ہے اور کوئی ڈرائیور اس کو چلا نہیں رہا ہے، بلکہ یہ آپ سے آپ دوڑ رہی ہے اور ہر موڑ پر خود ہی قاعدہ کے مطابق مڑ جاتی ہے، تو کیا آپ میری ان باتوں کو باور کر سکیں گے؟

اُن صاحب نے جواب دیا کہ ان میں سے تو کسی بات کو بھی عقل تسلیم نہیں کر سکتی، میں نے اُن سے کہا کہ اللہ کے بندے! موٹر، فونٹین پن اور گھڑی جیسی چیزوں کے متعلق تو آپ کی سمجھ میں نہیں آسکتا کہ یہ آپ سے آپ بن گئی ہیں اور اس کاغذ پر لکھے ہوئے ٹیڑھے ترچھے ان چند حروف کے متعلق بھی آپ کی عقل کسی طرح نہیں مان سکتی کہ یہ آپ سے آپ لکھے گئے ہیں لیکن چاند، سورج جو ایک حیرت انگیز حکیمانہ نظام کے ساتھ چل رہے ہیں اور

ان سے بھی عجیب تر انسان کی ہستی، اُس کا طل و دماغ اور اُس کی آنکھیں اور اُس کے کان اور اس کی زبان، ان سب کے متعلق آپ کی عقل یہ مان سکتی ہے کہ یہ بغیر کسی کے بنائے آپ سے آپ یوں ہی بن گئے ہیں ؟ پھر میں نے کہا کہ جس طرح آپ کے نزدیک یہ بات بالکل بدیہی اور ناقابل بحث ہے کہ کاغذ کے اس پرزہ پر جو کچھ لکھا ہوا ہے اُسے کسی لکھنے والے نے لکھا ہے اور اس گھڑی اور فونٹین پن کو کسی بنانے والے نے ہی بنایا ہے، اور موٹر بھی کسی کارخانہ میں بنی ہے اور اگر وہ چل رہی ہے تو یقیناً کسی چلانے والے کے چلانے سے چل رہی ہے، اسی طرح یہ بات اس سے بھی زیادہ بدیہی اور قطعاً ناقابل بحث ہے کہ چاند سورج اور انسان وحیوانات اور یہ ساری کائنات کسی حکیم وخبیر اور کسی کامل القدرۃ ہستی کی بنائی ہوئی ہے اور اس میں شک اور بحث کرنا اپنی فطرت کے مسخ ہو جانے یا عقل سے اپنے کو بالکل کورے ہونے کا ثبوت دینا ہے۔

بہرحال میرا خیال بلکہ یقین یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ہستی کا مسئلہ چونکہ انسانوں کے لئے بالکل فطری اور بدیہی مسئلہ تھا، اس لئے قرآن پاک میں اس پر زیادہ بحث نہیں کی گئی، بلکہ مذکورہ بالا قسم کے استدلالی اشارات کر دینا ہی کافی سمجھا گیا اور یہی ہونا بھی چاہئے تھا کیونکہ کسی بدیہی مسئلہ کو موضوع بحث و استدلال بنانا اور اُس پر لمبے چوڑے دلائل پیش کرنا اصولِ حکمت کے خلاف ہے اور ایسا کرنے سے آسان مسئلہ خواہ مخواہ مشکل اور نظری بن جاتا ہے۔ الغرض اللہ تعالیٰ کی ہستی کا مسئلہ انسانی فطرت کے لئے شک اور بحث کے قابل ہے ہی نہیں اور اسی لئے یہ گمراہی کبھی انسانوں میں زیادہ نہیں پھیلی بلکہ بسا اوقات تو ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ بظاہر اللہ کا انکار کرنے والوں کو جب ٹٹولا گیا تو اندازہ ہوا کہ اُن کے بھی دل کے کسی گوشہ میں اللہ کی ہستی کا اقرار چھپا ہوا موجود ہے۔

توحید ہاں! اللہ کی توحید کا مسئلہ ایسا ہے جس میں بہت سی قومیں گمراہ ہوئی ہیں، اسی لئے تمام انبیاء علیہم السلام کی دعوت اور تعلیم کا یہ خاص موضوع رہا ہے اور قرآن مجید میں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات میں تو اس مسئلہ کی ایسی تکمیل اور تفصیل بیان کی گئی ہے کہ کوئی گوشہ نہیں چھوڑا گیا ہے۔ قرآن پاک میں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث میں اس بارے میں جو کچھ فرمایا گیا ہے اُس کو سمجھنے کے لئے پہلے ایک بات یہ سمجھ لینی چاہئے کہ شرک میں وہی شخص گرفتار ہوتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ کی صفات کا صحیح علم نہیں ہوتا اور جس کو صفاتِ الٰہی کا صحیح علم ہو جائے، اُس سے کبھی شرک نہیں ہوسکتا۔

مثلاً جو شخص یہ یقین رکھتا ہے کہ اللہ ہی پیدا کرنے والا ہے اللہ ہی پالنے والا ہے، اللہ ہی رزق دیتا ہے، اللہ ہی اولاد دیتا ہے، اللہ ہی مارتا اور جلاتا ہے، اللہ ہی تندرست اور بیمار کرتا ہے، اللہ ہی امیر یا غریب بناتا ہے، غرض اس دنیا میں جو کچھ بھی ہوتا ہے سب اللہ ہی کے حکم سے اور اُسی کے کرنے سے ہوتا ہے، سب اُس کے محتاج ہیں اور وہ کسی کا بھی محتاج نہیں ہے، تو جو شخص اللہ تعالیٰ کی ان صفات پر یقین رکھتا ہو، ظاہر ہے وہ نہ اللہ کے سوا کسی سے اپنی حاجتیں مانگے گا، نہ کسی کی عبادت کرے گا، نہ کسی کو راضی اور خوش کرنے کے لئے نذریں اور منتیں مانے گا۔

بیان توحید کا ایک طریقہ تو قرآن شریف میں اور اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں میں بھی توحید کو سمجھانے اور دل میں بٹھانے کے لئے ایک تو یہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے تاکہ بندے یہ جان لیں، کہ جب اللہ کی ایسی شان ہے اور اس میں یہ سب صفتیں موجود ہیں، تو بس وہی بندگی اور عبادت کے لائق ہے۔ قرآن شریف کے اس طریقہ تعلیم اور طریقہ بیان کو سب سے پہلے

آپ سورۂ فاتحہ میں دیکھئے! ــــــ پہلے بندوں سے کہلوایا گیا :-

"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ٥ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ٥ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ٥

ہر قسم کی حمد وثنا اُسی اللہ کیلئے ہے جو ساری کائنات کا رب اور پروردگار ہے، بڑی رحمت والا اور مہربان ہے، انصاف کے دن کا مالک ہے، یعنی ایک آنے والے دن میں اصلی جزا اور سزا دینے والا ہے"

اللہ تعالیٰ کی یہ صفات بیان کرکے آگے کہلایا گیا، کہ :-

"اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ٥"

یعنی جب اللہ تعالیٰ ہی رب اور پالنے والا ہے اور ہماری زندگی کی ساری ضرورتیں وہی مہیا کرتا ہے اور وہ بڑی رحمت والا اور نہایت مہربان بھی ہے، اور ان صفاتِ جمال کے ساتھ وہی آخرت والی زندگی میں جزا اور سزا دینے والا صاحبِ جلال و جبروت حاکم بھی ہے تو بس پھر اُسی کی عبادت ہم کریں گے اور اپنی ضرورتوں میں صرف اُسی سے مدد مانگیں گے۔

بیانِ توحید کا دوسرا طریقہ اور کہیں بیانِ توحید کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے کہ پہلے توحید کا ذکر کیا گیا اور یہ بیان فرمایا گیا کہ اللہ ہی عبادت اور بندگی کے لائق ہے اور بس وہی الٰہ اور معبود ہے اور اس کے بعد بطور دلیل اور سند کے اللہ کی شان اور صفات بیان کی گئیں، مثلاً آیت الکرسی میں پہلے فرمایا گیا :- "اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ" (اللہ کے سوا کوئی عبادت اور بندگی کے لائق نہیں) اور آگے اس کی صفات اور اس کی شان کو

اس طرح بیان فرمایا گیا :-

"اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ" یعنی وہی زندۂ جاوید ہے اور اسی کی زندگی اپنی ذاتی زندگی ہے اور اس کے سوا جن کو زندگی ملی ہے وہ اسی کی دی ہوئی ہے اور عارضی ہے، اور وہی زندۂ جاوید ہستی اس ساری کائنات کو تھامے ہوئے اور سنبھالے ہوئے ہے، (اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ کا یہی مطلب ہے) - آگے فرمایا ہے: "لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ" نہ اسے اونگھ لگتی ہے اور نہ نیند آتی ہے، یعنی وہ ہمہ وقت بیدار اور باخبر ہے، کوئی ایک لمحہ بھی ایسا نہیں ہوتا کہ کوئی بندہ اُس کی طرف اپنی کسی ضرورت کے لئے متوجہ ہو اور وہ اُس وقت اپنے آرام میں اور اونگھ یا نیند کی حالت میں ہو، اونگھ یا نیند جیسی چیزوں کا اُس کے پاس گزر ہی نہیں " لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ" زمین اور آسمان میں جو کچھ ہے اُسی کا ہے، وہی سب کا مالک و مختار ہے۔ آگے فرمایا گیا ہے :- " مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ " کون ہے جو اس کی بارگاہ میں اس کی اجازت کے بغیر کسی کی سفارش بھی کر سکے، یعنی کسی کی بھی یہ مجال نہیں " یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖۤ اِلَّا بِمَا شَآءَ" جو کچھ بندوں کے سامنے اور حاضر ہے وہ اُس کو بھی جانتا ہے اور جو اُن کے پیچھے ہے اور اُن سے غائب اور اوجھل ہے وہ اُس سے بھی واقف ہے اور مخلوقات اور بندوں کے علم کا حال یہ ہے کہ اللہ کے بے نہایت علم میں سے وہ کسی ایک چیز کو بھی پوری طرح نہیں جان سکتے، اِلّا یہ کہ کسی چیز کا علم وہ خود ہی اُن کو دینا چاہے، تو وہ بس اسی کو اور اسکے بتلانے کے بقدر ہی جان سکتے ہیں۔ آگے فرمایا گیا ہے :- "وَسِعَ كُرْسِیُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَلَا یَـُٔوْدُهٗ حِفْظُهُمَا وَهُوَ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ " اس کا تخت

حکمت زمین و آسمان کی وسعتوں پر چھایا ہوا ہے اور اُن کے تھامنے سے وہ تھکتا نہیں اور وہ اونچی شان والا، بڑی عظمت والا ہے۔

جیسا کہ آپ نے دیکھا اس آیت الکرسی میں پہلے توحید کا ذکر کیا گیا:- (اَللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ) اور اس کے بعد اللہ کی وہ شان اور وہ صفتیں بیان کی گئیں جن کے جاننے کے بعد آدمی خود بخود اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ صرف یہی ستی اللہ (معبود) ہے اور عبادت و بندگی اسی کا حق ہے۔

اسی طرح سورہ اخلاص میں پہلے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت بیان فرمائی گئی:- "قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ" یعنی کہو اور اقرار کرو، کہ وہ اللہ ایک ہے یکتا ہے اور اس کے بعد اس کی وہ صفات بیان کی گئیں جن کو جاننے کے بعد آدمی خود اسی نتیجہ پر پہنچتا ہے، فرمایا گیا:- اَللّٰہُ الصَّمَدُ یعنی اللہ بے نیاز ہے، وہ کسی کا محتاج نہیں ہے اور اسکے علاوہ سارے موجودات اس کے محتاج ہیں" لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ " نہ کوئی اُس کی اولاد، نہ وہ کسی کی اولاد" وَلَمْ یَکُنْ لَّہٗ کُفُوًا اَحَدٌ ۝ اور کوئی اس کے برابر اور ہمسر نہیں۔

ان چھوٹے چھوٹے جملوں میں اللہ کی جو شان اور صفت بیان کی گئی ہے اسکو جاننے کے بعد آدمی خود بخود یہ سمجھ سکتا ہے کہ اللہ اور معبود بننے کے لائق صرف یہی ذات ہے جسکی شان یہ ہے کہ وہ کسی کا محتاج نہیں اور سب اسکے محتاج ہیں، اور نہ کوئی اس کی جنس ہے اور نہ کوئی اُس کے مانند اور ہمسر ہے۔

یہ ہم نے قرآن مجید کے بیانِ توحید کے متعلق ایک اصولی بات کہی ہے اس سے توحید اور قرآن مجید کے توحیدی مضامین کو سمجھنے کیلئے ایک راستہ کھل جاتا ہے۔

کم سے کم کس درجہ کی توحید معتبر ہے اور لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ ؕ کا ابتدائی مطالبہ کیا ہے

توحید کے متعلق اسی طرح کی ایک اصولی بات اور بھی سمجھ لینی چاہیے! اور وہ یہ کہ توحید کا یعنی اللہ تعالیٰ کو ایک ماننے کا ایک درجہ تو وہ ہے جس کو بہت سے مشرکین بھی مانتے ہیں لیکن قرآن مجید کے بیان کے مطابق وہ کافی نہیں، مثلاً اتنی بات کہ زمین و آسمان اور اس ساری کائنات کا پیدا کرنے والا ایک ہی ہے، ایسا نہیں ہے کہ کچھ چیزیں کسی نے پیدا کی ہوں اور کچھ کسی نے۔ خود قرآن مجید میں جابجا اس کی شہادت موجود ہے کہ اتنی بات عرب کے مشرک بھی مانتے تھے

قرآن مجید کا بیان کہ مشرکین عرب بھی ایک درجہ توحید کے قائل تھے

لفظوں کے تھوڑے تھوڑے فرق کے ساتھ کئی جگہ قرآن مجید میں یہ مضمون بیان فرمایا گیا ہے کہ اگر ان مشرکوں سے پوچھا جائے کہ بتلاؤ زمین و آسمان اور اس ساری کائنات کو کس نے پیدا کیا؟ تو وہ کہیں گے اور اقرار کریں گے کہ اللہ نے:۔

۰ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَ
سَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ۚ ؕ (عنکبوت۔ ع-۶)

بلکہ اس سے آگے بڑھ کر وہ یہ بھی مانتے اور اقرار کرتے تھے کہ اس سارے کارخانہ کو چلانے والا بھی اللہ ہی ہے، وہی روزی دیتا ہے، وہی مارتا اور جلاتا ہے۔ چنانچہ سورۂ یونس میں فرمایا گیا ہے:۔

قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَ	یعنی اے پیغمبر! آپ ان مشرکوں سے پوچھے
الْاَرْضِ اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ	کہ بتاؤ کون تمہیں زمین و آسمان سے روزی
وَمَنْ يُّخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ	دیتا ہے اور کون کانوں اور آنکھوں کا مالک

الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَمَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ فَسَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ ۚ (یونس - ۳ - ۳)	ہے اور کس کا ان چیزوں پر اختیار ہے اور کون زندہ سے مردہ کو اور مردہ سے زندہ کو نکالتا ہے اور کون ہے جو اس تمام کارخانۂ ہستی کا انتظام کر رہا ہے ؟ تو آپ جب ان سے یہ پوچھیں گے تو وہ صاف کہیں گے کہ یہ سب کرنے والا صرف ایک اللہ ہے !

بہرحال اتنی توحید کے قائل عرب کے مشرک بھی تھے۔

پھر ان کا شرک کیا تھا؟ تو اب غور کرنے کی بات یہ ہے کہ پھر اُن کا شرک کیا تھا؟ قرآن مجید ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو ساری کائنات کا خالق و مالک اور مدبر و منتظم یعنی اس پورے کارخانۂ ہستی کو چلانے والا ماننے کے باوجود یہ سمجھتے تھے کہ جن ہستیوں کو ہم دیوی اور دیوتا مانتے ہیں وہ اگرچہ اُسی اللہ کے پیدا کئے ہوئے اور مخلوق ہیں، لیکن ان کا اللہ سے ایسا خاص تعلق ہے، کہ اگر وہ کسی کو کچھ دینا چاہیں تو دے سکتے ہیں اور کسی سے کچھ چھینا چاہیں تو چھین سکتے ہیں، کسی کو دولت دے کر امیر کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں، کسی سے دولت چھین کر اس بیچارے کو غریب و فقیر بنانا چاہیں تو بنا سکتے ہیں، اسی طرح اگر کسی کو بیمار یا تندرست کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں، کسی کو اولاد دینا چاہیں تو دے سکتے ہیں ۔ الغرض یہ مشرکین سمجھتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے خاص تعلق کی وجہ سے ہمارے ان دیوتاؤں کو ایسے جزوی کاموں کے اختیارات دے دیئے ہیں اور اس بنا پر وہ انہیں راضی اور خوش رکھنے کے لئے ان کی عبادت کرتے تھے، نذریں اور منتیں مانتے تھے، چڑھاوے چڑھاتے تھے، اُن کی مورتیوں کے گرد طواف کرتے تھے اور اپنی ضرورتوں اور

حاجتوں میں ان سے مدد مانگتے تھے، تو قرآن پاک نے ان کے اسی خیال اور اسی طرزِ عمل کو شرک قرار دیا ہے اور اکثر قوموں، ملکوں کے مشرکوں میں یہی شرک رہا ہے، ایسے مشرک دنیا میں غالباً بہت کم ہوئے ہیں جن کا عقیدہ یہ ہو کہ اس دنیا کے پیدا کرنے اور چلانے میں اللہ کا کوئی ساتھی اور شریک ہے اور جہاں تک ہمارے معلومات ہیں کسی مشرک قوم نے بھی اپنے معبودوں کو اللہ کے برابر نہیں سمجھا اور جیسا کہ میں نے عرض کیا مشرکین عرب کے متعلق تو قرآن و حدیث میں صاف صاف اس کی شہادت موجود ہے اور قرآن مجید ہی میں اُن کے اس طرزِ عمل کا تذکرہ کئی جگہ فرمایا گیا ہے کہ جب وہ کشتی میں دریا کا سفر کرتے تھے اور اُس کی موجیں خطرہ کی صورت پیدا کر دیتی تھیں تو وہ اپنے سب دیوتاؤں کو بھول جاتے تھے اور صرف اللہ ہی کو پکارتے تھے اور اُسی سے آس لگاتے تھے۔ چنانچہ ایک جگہ فرمایا گیا:۔

وَاِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِى الْبَحْرِ ضَلَّ مَنْ تَدْعُوْنَ اِلَّآ اِيَّاهُ ۚ (سورۂ بنی اسرائیل - ع - ۷)	جب سمندر میں تم پر کوئی مصیبت اور آفت آتی ہے تو اللہ کے سوا اپنے ان سب دیوتاؤں کو تم بھول جاتے ہو جن کو تم دوسرے موقعوں پر پکارا کرتے ہو۔

اور ایک دوسری جگہ فرمایا گیا:۔

وَاِذَا غَشِيَهُمْ مَّوْجٌ كَالظُّلَلِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۚ (سورۂ لقمان - ع - ۴)	اور جب سمندر کی موجیں بادلوں کی طرح ان کو گھیر لیتی ہیں تو اس وقت وہ اپنے اعتقاد کو اللہ کیلئے خالص کر کے بس اُسی کو مدد کے لئے پکارتے ہیں۔

بہرحال مشرکین عرب کے قول سے بھی اور عمل سے بھی یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ وہ

اپنے دیوتاؤں کو اللہ کے برابر نہیں سمجھتے تھے بلکہ اللہ کو سب سے بالا اور برتر سمجھتے تھے اور اپنے دیوتاؤں کو اللہ کی مخلوق اور اللہ کا مملوک جانتے تھے۔

مشرکین عرب کا تلبیہ حدیث کی کتابوں میں مشرکین عرب کا تلبیہ بھی نقل کیا گیا ہے، جو وہ اپنے مشرکانہ حج میں پڑھتے تھے۔ اسکے آخری الفاظ یہ نقل کئے گئے ہیں:۔ "اِلَّا شَرِیْکًا هُوَ لَكَ تَمْلِكُهٗ وَمَا مَلَكَ" (ترمذی) یعنی وہ اپنے حج کے تلبیہ میں اللہ تعالیٰ سے کہتے تھے کہ:۔

"اے اللہ! ہم آپ کی بارگاہ میں حاضر ہیں، آپ کا کوئی شریک نہیں ہے
ہاں ایسے شریک ہیں جو آپ کی ملکیت میں ہیں، آپ اُن کے مالک ہیں اور
ان چیزوں کے بھی جن کے وہ مالک ہیں"

مشرکین عرب کے شرک کی حقیقت اور قرآن میں اس کی تردید بہرحال مشرکین عرب کا شرک یہ نہیں تھا کہ وہ اپنے معبودوں کو اللہ کی طرح دنیا کا خالق یا رازق سمجھتے ہوں، یا کسی حیثیت یا کسی صفت میں بھی اللہ کے برابر کہتے ہوں، بلکہ اُن کا شرک یہ تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کو ساری کائنات کا خالق و مالک اور مدبر و منتظم ماننے کے باوجود یہ سمجھتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کے تعلق اور تقرب کی وجہ سے ہمارے ان دیوتاؤں کو بھی کچھ جزوی اختیارات حاصل ہیں اور یہ چاہیں تو بنا و بگاڑ سکتے ہیں اور اسی بنیاد پر یہ اُن کو خوش کرنے کیلئے ان کی عبادت کرتے تھے یعنی سجدہ اور طواف جیسے اعمال کرتے تھے نذریں اور قسمیں مانتے تھے، چڑھاوے چڑھاتے تھے اور اُن سے حاجتیں اور مرادیں مانگتے تھے۔ پس اُن کا یہی عمل شرک تھا اور اکثر مشرک قوموں میں اسی قسم کا شرک رہا ہے، اور اسی وجہ سے قرآن پاک میں اسی شرک کا رد زیادہ کیا گیا ہے۔ ایک جگہ فرمایا گیا ہے۔

• وَاتَّخَذُوا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً لَّا — اور ان مشرکوں نے اللہ کے سوا ایسے معبود

يَخْلُقُوْنَ شَيْئًا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ ۝
وَلَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ ضَرًّا وَّلَا
نَفْعًا وَّلَا يَمْلِكُوْنَ مَوْتًا وَّلَا حَيٰوةً
وَّلَا نُشُوْرًا ۝ (فرقان - ع - ۱)

بنالئے ہیں جو کوئی چیز بھی نہیں بنا سکتے اور
وہ خود اللہ کے بنائے ہوئے ہیں اور دوسروں
کا کیا ذکر خود اپنے نفع نقصان پر بھی انہیں اختیار
نہیں اور نہ اس دنیا کے مرنے جینے پر اور نہ
حیات بعد الموت پر انہیں کوئی اختیار ہے،
(یعنی اُن کے قبضہ و اختیار میں کچھ بھی نہیں ہے)

اور ایک دوسری جگہ ارشاد ہے:۔

قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِ
اللّٰهِ ۚ لَا يَمْلِكُوْنَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِي
السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ وَمَا
لَهُمْ فِيْهِمَا مِنْ شِرْكٍ وَّمَا لَهٗ
مِنْهُمْ مِّنْ ظَهِيْرٍ ۝
(سبا - ع - ۳)

اے پیغمبر! ان مشرکوں سے کہئے کہ جن کو تم
اللہ کے سوا مالک و مختار سمجھتے ہو، وہ ایک
ذرہ کے بھی مالک نہیں، نہ آسمانوں میں، نہ
زمین میں اور ان میں ان کا کوئی ساجھا بھی
نہیں اور نہ ان میں سے کوئی اللہ کا مددگار
ہے۔

یعنی زمین و آسمان کی کوئی ذرہ برابر چیز بھی تو ان کی ملکیت ہے، نہ اس کی ملکیت میں اللہ کے ساتھ ان کی کوئی شرکت ہے اور ایسا بھی نہیں ہے کہ بغیر ملکیت اور شرکت کے خدا اُن سے کسی معاملہ میں مدد لیتا ہو۔ اور سورۂ بنی اسرائیل میں ایک جگہ فرمایا گیا:۔

قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ
فَلَا يَمْلِكُوْنَ كَشْفَ الضُّرِّ عَنْكُمْ
وَلَا تَحْوِيْلًا ۝ (بنی اسرائیل ع - ۶)

اے پیغمبر! ان مشرکوں سے کہئے کہ اللہ کے
سوا جن کو تم نے مالک و مختار اور قابل عبادت
سمجھ رکھا ہے انہیں تمہاری کسی تکلیف کے

کو دور کرنے اور ہٹا دینے کا کوئی اختیار حاصل
نہیں ہے (یعنی یہ محض تمہاری خام خیالی
ہے)۔

اور سورۂ یونس کے آخری رکوع میں بڑے اہتمام اور بڑی تفصیل کے ساتھ فرمایا
گیا ہے:-

قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنْ كُنْتُمْ فِي	اے نبیؐ! آپ کہیے کہ اے لوگو! اگر تمہیں
شَكٍّ مِنْ دِينِي فَلَا أَعْبُدُ الَّذِينَ	میرے دین کے بارے میں کوئی شک و شبہ
تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلَٰكِنْ	ہے تو سن لو، میں صاف صاف کہتا ہوں کہ
أَعْبُدُ اللَّهَ الَّذِي يَتَوَفَّاكُمْ وَأُمِرْتُ	میرا طریقہ اور میرا دین یہ ہے کہ اللہ کے سوا
أَنْ أَكُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ۝ وَأَنْ	تم جن کی عبادت اور پرستش کرتے ہو، میں
أَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا وَ	ان کی عبادت نہیں کرتا اور نہیں کروں گا
لَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝ وَلَا	بلکہ میں صرف اللہ کی عبادت کرتا ہوں اور
تَدْعُ مِنْ دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَنْفَعُكَ	کرتا رہوں گا، جو تمہیں موت دینے والا ہے
وَلَا يَضُرُّكَ فَإِنْ فَعَلْتَ فَإِنَّكَ إِذًا	اور مجھے اُسی اللہ کا حکم ہے کہ میں ایمان والوں
مِنَ الظَّالِمِينَ ۝ وَإِنْ يَمْسَسْكَ	میں سے ہو جاؤں اور یہ کہ تم سیدھا کرو
اللَّهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهُ إِلَّا هُوَ	اپنا رخ اللہ کی اطاعت اور عبادت کے
وَإِنْ يُرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَادَّ	لئے سب طرف سے یکسو ہو کر اور ہرگز نہ ہو،
لِفَضْلِهِ يُصِيبُ بِهِ مَنْ يَشَاءُ	مشرکوں میں سے اور نہ پکارو اللہ کے سوا
مِنْ عِبَادِهِ وَهُوَ الْغَفُورُ	ان ہستیوں کو جو نہ تمہیں کوئی نفع پہنچا سکتی

الرَّحِيْمُ ۝ (یونس - ع - ۱۱)

ہیں اور نہ کوئی تکلیف دے سکتی ہیں اور اگر
تم نے ایسا کیا تو پھر تم ظالموں میں سے ہو جاؤ
گے اور یقین کرو کہ اگر اللہ تمہیں کوئی تکلیف
پہنچائے تو اللہ کے سوا کوئی اس کو دور کر
سکنے والا نہیں، اور اگر وہ تمہارے لئے کسی
بھلائی کا ارادہ کرے اور اپنی رحمت سے
نوازنا چاہے تو اس کے فضل و کرم کو روک
سکنے والا اور ہٹانے والا کوئی نہیں، وہ
اپنے بندوں میں سے جس کو چاہے نوازے
اور نصیب فرمائے، وہ بہت بخشنے والا اور
بڑا مہربان ہے ۔"

پس ان آیتوں میں اور ان کے علاوہ سینکڑوں آیتوں میں مشرکین عرب کے جس شرک کا رد کیا گیا ہے، وہ یہی ہے کہ وہ کچھ ہستیوں کے متعلق یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ اگرچہ یہ اللہ کی مخلوق اور مملوک ہیں لیکن اللہ کے ساتھ ان کا تعلق اور اس کے کارخانہ میں ان کا ایسا عمل دخل ہے کہ یہ ہماری تکلیفیں دُور کر سکتے ہیں اور دولت اور عزت اور اولاد جیسی چیزیں ہمیں دے سکتے ہیں اور اسی عقیدے کی بنا پر وہ اپنی حاجتیں اُن سے مانگتے تھے ۔ دعائیں کرتے تھے اور انہیں خوش کرنے کے لئے ان کی عبادت کرتے تھے، یعنی جس طرح اللہ کو راضی کرنے کے لئے اور اپنی عاجزی اُس کے سامنے ظاہر کرنے کے لئے اس کی عبادت اور پرستش کی جاتی ہے، اسی طرح وہ اپنے ان معبودوں کی بھی عبادت کرتے تھے ۔ تو قرآن پاک نے

ان کے اس عقیدے کو بھی شرک قرار دیا اور عبادت واستعانت کے ان کے عمل کو بھی اوطان کو عوت دی کہ اللہ کے سوا کسی کو وہ نفع و ضرر کا مالک و مختار اور اپنے اختیار و ارادے سے متصرف نہ سمجھیں اور عبادت و استعانت میں اسکے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں۔

ان مشرکوں کے معبود کون تھے؟ یہاں ایک بات یہ بھی سمجھ لینی چاہیئے کہ یہ ہستیاں کون تھیں جن کے متعلق یہ مشرک ایسا عقیدہ رکھتے تھے؟ اور جن کو حاجت روا اور مشکل کشا سمجھ کر ان سے دعائیں اور اُن کی عبادت کرتے تھے؟

بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ مشرک لوگ یہ سارے معاملات پتھر کی مورتیوں ہی کے ساتھ کرتے تھے، لیکن اصل حقیقت یہ ہے کہ پتھر کی یہ مورتیاں ان کی اصل معبود نہیں تھیں، بلکہ مشرکین کا یہ مشرکانہ عقیدہ اور مشرکانہ عمل اُن بزرگ روحوں اور اُن روحانی ہستیوں کے ساتھ تھا جن سے یہ پتھر کے بُت منسوب تھے۔ قرآن مجید سورۂ نوح میں قوم نوح کے چند بتوں کے نام یہ آئے ہیں:۔ وَدّ، سُوَاع، یغُوث، یَعُوق، نسْر اور ان کے متعلق روایا میں ہے کہ دراصل یہ نام چند بزرگوں کے ہیں، جو واقعی بزرگ اور اہل اللہ تھے، جب وہ انتقال کر گئے تو کچھ زمانہ کے بعد اُن کے عقیدت مندوں نے اُن کی یاد کے لئے نشانی کے طور پر اُن کے مجسمے بنائے اور اُن کی تعظیم کرنے لگے، بعد کی نسلوں کو شیطان نے انکی عبادت کے راستہ پر لگادیا، اسی طرح مشرکین عرب جن بتوں کی پرستش کرتے تھے، وہ بُت بھی کچھ رُوحانی ہستیوں کی نشانی یا یادگار رکھے جاتے تھے اور دراصل عبادت اُن روحانی ہستیوں کی کی جاتی تھی اور انہیں کو حاجت روا اور مشکل کشا سمجھا جاتا تھا، جسطرح ہندوؤں میں مثلاً کرشن جی یا راجندر جی کی مورتی کی پوجا کی جاتی ہے، تو عبادت اور پوجا اس مورتی کی مقصود نہیں ہوتی، بلکہ کرشن جی اور راجندر جی کی شخصیت کی عبادت مقصود ہوتی ہے،

اور اس مورتی کو اُن کے دھیان اور اُن کی پوجا کا ذریعہ بنایا جاتا ہے اور اسی نسبت سے اس کا احترام کیا جاتا ہے اور جس طرح کہ بہت سے مسلمان کہلانے والے جاہل تعزیوں پر چڑھاوے چڑھاتے ہیں، اُن کو جھک جھک کر سلام کرتے ہیں اور سنا ہے کہ اُن پر عرضیاں تک لٹکاتے ہیں اور اُن کے ساتھ وہ سب حرکتیں کرتے ہیں جو بُت پرست اپنے بتوں کے ساتھ کرتے ہیں! لیکن یہ تعزیہ دار اور تعزیہ پرست دراصل کاغذ اور بانس سے بنے ہوئے اُس تعزیہ میں کوئی غیبی طاقت نہیں سمجھتے، بلکہ وہ یہ سب کچھ امام حسینؓ کے نام پر کرتے ہیں اور تعزیہ کو اُن کی نشانی اور یادگار سمجھتے ہیں، تو یہ بالکل وہی بُت پرستوں والی منطق ہے۔ ہاں بعض نہایت احمق قسم کے گنوار سنا ہے ایسے بھی ہوتے ہیں جو بانس اور کاغذ سے بنے ہوئے تعزیہ ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں، تو اسی طرح معلوم ہوتا ہے کہ عرب کے مشرکوں میں بھی بعض اتنے احمق تھے جو اپنے ہاتھ کے تراشے ہوئے پتھر کے بتوں ہی کو حاجت روا سمجھتے تھے اور اس لئے براہِ راست اُن ہی کی عبادت کرتے تھے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ایسے ہی لوگوں کے بارے میں فرمایا گیا ہے۔

اَتَعْبُدُوْنَ مَا تَنْحِتُوْنَ ۝ — کیا تم پتھر کی تراشی ہوئی ان مورتیوں کو معبود بناتے ہو جن کو خود تم نے اپنے ہاتھوں سے تراشا اور بنایا ہے

تو ایسی آیتیں دراصل اسی احمق طبقہ کے مشرکوں سے متعلق ہیں جو پتھر کے بتوں ہی میں کرشمہ سمجھتے تھے اور اُن ہی سے اپنی حاجتیں مانگتے اور اُن کی عبادتیں کرتے تھے اور جو مشرک اتنے احمق نہیں تھے اور وہ پتھر کے بتوں کو اصل معبود نہیں سمجھتے تھے، بلکہ کچھ واقعی یا فرضی بزرگ روحوں اور روحانی ہستیوں کو نفع و ضرر کا مختار اور حاجت روا سمجھتے تھے اور انہی کی دراصل عبادت کرتے تھے اور بتوں کو صرف ان کی نشانی یا ان کی جلوہ گاہ سمجھتے تھے، ان سے فرمایا گیا:۔

"اِنَّ الَّذِیْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ" (اعراف - ع - ۲۴)
جن ہستیوں کی تم عبادت کرتے ہو، وہ تو تمہاری ہی طرح ہمارے بندے ہیں۔

اور ایک دوسرے موقع پر سورۂ بنی اسرائیل میں فرمایا، کہ وہ تو خود ہمارے محتاج ہیں؛ ہمارے در کے بھکاری ہیں، اپنی ضرورتیں ہم سے مانگتے ہیں، ہمارے قرب کے طلبگار رہتے ہیں اور اس راستے میں برابر کوشش کرتے رہتے ہیں اور ہمارے رحم کے امیدوار اور ہمارے عذاب سے ترساں ولرزاں رہنے والے ہیں، آیت کے الفاظ یہ ہیں:۔

"اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ یَبْتَغُوْنَ اِلٰی رَبِّهِمُ الْوَسِیْلَةَ اَیُّهُمْ اَقْرَبُ وَیَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ وَیَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ" (بنی اسرائیل ع ۶)

پس اس قسم کی آیتوں میں اُن مشرکوں کے شرک کا رد کیا گیا ہے جو بتوں کو اصلی معبود اور حاجت روا نہیں سمجھتے تھے بلکہ کچھ مقرب روحانی ہستیوں کو ایسا سمجھتے تھے، اور بتوں کو ان کا نمائندہ یا ان کی نشانی یا جلوہ گاہ سمجھتے تھے اور افسوس ہے کہ یہی حال بہت سے مسلمان کہلانے والے جاہل تعزیہ پرستوں اور قبر پرستوں کا بھی ہے، وہ بزرگانِ دین کے متعلق اسی قسم کا عقیدہ رکھتے ہیں اور اسی بنا پر اُن کی قبروں اور تعزیوں کے سامنے جھکتے اور نذریں چڑھاتے ہیں۔

یہ مشرک لوگ اللہ کو سب سے بڑا اور اصل خالق و مالک ماننے کے باوجود دوسروں سے کیوں اپنی حاجتیں طلب کرتے تھے؟

شرک اور مشرکوں کے سلسلہ میں ایک اور بات بھی ہمیں سمجھ لینی چاہیے بہت سوں کے دل میں سوال پیدا ہوتا ہوگا اور پیدا ہونا چاہیے کہ یہ مشرک لوگ جب یہ جانتے اور مانتے تھے کہ ساری دنیا کا اصل خالق و مالک اور سارے کارخانۂ ہستی کا چلانے والا ایک اللہ ہی ہے اور جن کو وہ دیوی دیوتا اور حاجت روا و مشکل کشا سمجھتے ہیں وہ بھی اسی کے

ملوک اور مخلوق ہیں اور اگر ان کو کچھ اختیار بھی ہے تو وہ جزوی ہی ہے اور کلّی اختیار صرف اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے اور وہ اللہ موجود ہے اور اس سے بھی مانگا جا سکتا ہے، تو وہ اللہ کے ہوتے ہوئے اپنی حاجتیں ان دیویوں دیوتاؤں سے کیوں مانگتے تھے اور کیوں بجائے اللہ کے ان کی عبادت کرتے تھے؟۔

یہ سوال عرب کے پرانے زمانہ کے مشرکوں کے متعلق بھی پیدا ہوتا ہے اور ہمارے زمانہ کے مشرکوں مثلاً بت پرست ہندوؤں کے متعلق بھی پیدا ہوتا ہے، بلکہ مسلمان کہلانے والوں میں جو لوگ پیر پرست اور قبر پرست قسم کے لوگ ہیں اُن کے متعلق بھی پیدا ہوتا ہے، اور ہم نے اس پر بہت غور کیا ہے اور آخر میں ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ یہ سب مشرکین یہ سمجھتے تھے اور سمجھتے ہیں کہ اللہ کو راضی اور خوش کرنا اور پھر اُس سے اپنے کام کرالینا تو بہت مشکل ہے کیونکہ اللہ تو جب راضی ہوگا جب اُس کے بتلائے ہوئے سب مذہبی احکام پر چلا جائے، جھوٹ نہ بولا جائے، بے ایمانی نہ کی جائے، کسی کو دھوکہ نہ دیا جائے، کسی کا حق نہ مارا جائے، سارے حرام اور ناپاک کاموں سے بچا جائے اور پاک زندگی گزاری جائے اور یہ ان مشرکوں کے لئے بہت مشکل ہے، یہ تو ساری عمر کا پاپڑ بیلنا ہوا، اس لئے وہ اللہ کو راضی کر کے اُس سے اپنے کام کرانے سے تو مایوس ہو گئے اور اس کے سوا انہوں نے جن جھوٹی سچّی واقعی یا فرضی ہستیوں کو حاجت روا اور نفع و نقصان کا مختار سمجھ رکھا ہے، ان کے متعلق ان کا خیال ہے کہ ان کو صرف پانچ پیسے کے بتاشوں سے راضی کر کے یا ان کے سامنے بس ڈنڈوت اور سجدہ کر کے یا دو چار پیسے کے ہار پھول چڑھا کے اور ایک چراغ جلا کے سارے کام کرائے جا سکتے ہیں۔ ہمارے نزدیک تو سارے شرک کی جڑ بنیاد یہی شیطانی دھوکہ ہے۔

اس شیطانی دھوکہ سے نکلنے کی قرآنی تدبیر اللہ کی مخلوق کو شیطان کے اس فریب سے

نکالنے کی صورت یہی ہے کہ انہیں یہ بتایا جائے کہ اللہ کے سوا کسی کے اختیار میں کچھ بھی نہیں ہے نہ پیدائش، نہ پرورش، نہ موت نہ حیات، نہ تندرستی، نہ بیماری، نہ امیری، نہ غریبی، نہ عزت، نہ ذلت، بلکہ سب کچھ اللہ ہی کے اختیار میں ہے اور وہی کسی کو کچھ دے سکتا ہے اور ساری کائنات اسی کی محتاج ہے۔ جیسا کہ فرمایا گیا:۔

۰قُلِ اللّٰھُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ ؕ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۰ تُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۰ (آل عمران - ۳ - ۳)	کہو، اے اللہ! سارے ملک اور ساری کائنات کے مالک! تو ہی ہے، جس کو چاہے حکومت و بادشاہت دے اور جس سے تو چاہے چھین لے، جس کو چاہے عزت دے اور جسے چاہے رسوائی اور ذلت دے، ہر خیر اور ہر قسم کی بھلائی صرف تیرے ہی قبضہ اور اختیار میں ہے (اور صرف خیر اور بھلائی ہی نہیں، بلکہ) ہر چیز خواہ بھلی ہو یا بری) تیری قدرت میں ہے، تو ہی رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور رات دن کا یہ نظام تیرے ہی چلانے سے چل رہا ہے اور تو ہی زندہ کو مردہ سے اور مردہ کو زندہ سے نکالتا ہے اور جس کو تو چاہے بے حساب روزی دیتا ہے!

اور کہیں کہا گیا:۔

"بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ (یٰسین ع - ۵) ہر چیز کا اختیار صرف اسی کے ہاتھ میں ہے۔

کہیں فرمایا گیا:۔

"لَهٗ مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ" — زمین و آسمان کے سارے خزانوں کی کنجیاں اسی کے پاس ہیں۔

(شوریٰ - ع - ۲)

کہیں فرمایا گیا:۔

"مَا يَفْتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَةٍ فَلَا مُمْسِكَ لَهَا ۚ وَمَا يُمْسِكْ ۙ فَلَا مُرْسِلَ لَهٗ مِنْ بَعْدِهٖ ؕ" — اللہ آدمیوں کے لئے جس رحمت کا دروازہ کھلے اور جو نعمت کسی کو دینا چاہے کوئی نہیں ہے اسے روک سکنے والا اور جو نہ دینا چاہے اور روک لے تو کوئی نہیں ہے اس کے بعد اس کو دے سکنے والا اور جاری کرنے والا۔

(فاطر - ع - ۱)

قرآن مجید میں مشرکوں کو شرک سے بچانے کے لئے زیادہ تر یہی طریقہ اختیار کیا گیا ہے یعنی ان کو بتلایا گیا ہے کہ شیطان نے تمہیں یہ غلط باور کرا رکھا ہے کہ کسی اور کے ہاتھ میں بھی کچھ اختیار ہے اور اللہ کے سوا اور بھی کوئی ایسی ہستی ہے جس کے قبضہ میں تمہارا بنانا و بگاڑنا اور تمہاری حاجتیں ہیں، یہ شیطان کا نرا دھوکہ ہے، تمہارا نفع نقصان اور تمہاری ساری حاجتیں اللہ کے، اور صرف اللہ ہی کے قبضہ میں ہیں، لہٰذا بس اللہ ہی کو اپنا حاجت روا سمجھو اور جو مانگنا ہو اسی سے مانگو، اور اسی کی عبادت کرو۔

توحید اور شرک سے متعلق دو اہم سوال اس موقع پر دو باتیں اور بھی ایسی ہیں جن کا سمجھ لینا ضروری ہے، ایک یہ کہ عبادت کیا ہے؟ جس کا غیر اللہ کے لئے کرنا شرک ہے؟ اور دوسری بات یہ کہ اس عالم اسباب میں ہم بہت سی چیزوں سے فائدے اٹھاتے اور کام لیتے ہیں، جیسے پانی سے پیاس بجھاتے ہیں، آگ اور سورج سے روشنی اور گرمی حاصل کرتے ہیں، دوا سے شفا حاصل کرتے

چاہتے ہیں، اسی طرح اپنے جیسے بہت سے آدمیوں سے ہم بہت سے موقعوں پر مدد لیتے ہیں، مثلاً حکیموں، ڈاکٹروں سے علاج میں مدد لیتے ہیں، مقدمات میں وکیلوں سے مدد لیتے ہیں اسی طرح اپنے کاموں میں نوکروں، مزدوروں سے مدد لیتے ہیں، علیٰ ہذا القیاس بہت سے غریب لوگ فقیر امیروں سے مدد کے اور اعانت کے طالب ہوتے ہیں، تو اس کی کیا حیثیت ہے اور یہ شرک کیوں نہیں ہے؟۔ پہلے آپ دوسری بات کو سمجھ لیجئے!۔

عالم اسباب کی چیزوں سے مدد لینا کیوں شرک نہیں؟

اصل بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس عالم اسباب میں جن چیزوں میں یہ خاصیتیں اور جو تاثیریں رکھدی ہیں، جیسے پانی میں پیاس بجھانے کی تاثیر اور آگ اور سورج میں روشنی اور گرمی پہنچانے کی تاثیر اور دوا میں مرض کو دور کرنے کی تاثیر، تو سب جانتے ہیں کہ ان تاثیروں میں خود ان چیزوں کا کوئی اختیار نہیں ہے، بلکہ اللہ نے ان کو ہمارے لئے مسخر کر دیا ہے، اس لئے ان سے کام لینے میں شرک کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، ان چیزوں کی حیثیت تو ہمارے خادموں کی ہے اور ان سے کام لینا ایسا ہی ہے جیسا کہ ہم اپنے جانوروں گھوڑوں اور گدھوں سے کام لیتے ہیں۔

اسی طرح جن بندوں کو اللہ نے کوئی ایسی قابلیت دی ہے، جس سے وہ دوسروں کو بھی کوئی نفع یا امداد پہنچا سکتے ہیں، جیسے حکیم، ڈاکٹر، وکیل وغیرہ تو ان کے متعلق ہر ایک یہ سمجھتا ہے کہ ان میں کوئی غیبی طاقت نہیں ہے اور ان کے اپنے قبضہ میں کچھ بھی نہیں ہے اور یہ بھی ہماری ہی طرح اللہ کے محتاج بندے ہیں، بس اتنی بات ہے کہ اللہ نے انہیں اس عالم اسباب میں اس قابل بنا دیا ہے کہ ہم ان سے فلاں کام میں مدد لے سکتے ہیں، اس بنا پر ان سے کام لینے اور اعانت حاصل کرنے میں بھی شرک کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا، شرک جب ہوتا ہے جب کسی ہستی کو اللہ کے قائم کئے ہوئے اس ظاہری سلسلہ اسباب سے

الگ غیبی طور پر اپنے ارادہ اور اختیار سے کار فرما اور متصرف سمجھا جائے اور اس اعتقاد کی بنا ر پر اس سے اپنی حاجتوں میں مدد مانگی جائے اور اُسے راضی کرنے کے لئے اُس کی عبادت کی جائے۔

عبادت کسے کہتے ہیں دوسرا سوال عبادت کے متعلق تھا کہ عبادت کسے کہتے ہیں، عبادت دین اور شریعت کی ایک خاص اصطلاح ہے، کسی ہستی کو غیبی طور پر نفع و ضرر کا مختار اور حاجت روا سمجھ کر اُسے راضی اور خوش کرنے کے لئے اور اُس کا تقرب حاصل کرنے کے لئے جو تعبدی اور تعظیمی کام کئے جاتے ہیں، جیسے سجدہ، طواف، نذر، قربانی اور اُس کے نام کی وظیفہ خوانی وغیرہ وغیرہ تو ایسے اعمال کو دین کی خاص اصطلاح میں عبادت کہتے ہیں اور یہ عبادت صرف اللہ کا حق ہے[1] اور جو کوئی کسی غیر کے ساتھ ایسا معاملہ کرے وہ بلاشبہ مشرک ہے، اور پہلے تفصیل سے بتلایا جا چکا ہے کہ اکثر مشرک قوموں کا شرک یہی رہا ہے، کہ انہوں نے اللہ کے سوا بھی کچھ ہستیوں کو نفع و ضرر کا مختار سمجھا اور ان کے راضی کرنے کیلئے

---

[1] واضح ہے کہ اصل عربی زبان میں عبادت کے ایک معنی اطاعت و فرمانبرداری کے بھی ہیں، اور ان دونوں معنوں میں ایک کھلا ہوا اور عام فہم فرق یہ ہے کہ اصطلاحی عبادت اللہ کے سوا کسی کی بھی جائز نہیں بلکہ مطلقاً شرک ہے اور شرک عظیم ہے لیکن اطاعت مخلوق کی بھی جائز ہے بلکہ بعض اطاعتوں کا خود اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی حکم ہے، مثلاً رسول کی اطاعت کا حکم ہے اور اولو الامر کی اطاعت کا حکم ہے، اسی طرح اولاد کو ماں باپ کی اور بیوی کو شوہر کی خدمت و اطاعت کا حکم ہے پس جو لوگ اصطلاحی عبادت اور عبادت بمعنی اطاعت کے اس فرق کو ملحوظ نہیں رکھتے اور دونوں کو گڈمڈ کر دیتے ہیں، وہ دین کی تشریح میں بہت بڑی غلطی کرتے ہیں، اس سے توحید اور شرک کے معنی ہی بدل جاتے ہیں۔ انشاء اللہ آگے عبادات کے بیان میں عبادت کے مطلب و مقصد پر مزید روشنی ڈالی جائے گی۔

عبادت کی قسم کے کام کئے اور یہ شرک وہ ظلم عظیم ہے جس کی ہرگز معافی نہیں۔

بعض چھوٹے درجہ کے شرک یہاں تک ہم نے جس شرک کا بیان کیا ہے، یہ وہ حقیقی شرک ہے جس کے متعلق قرآن مجید میں اعلان فرمایا گیا ہے کہ اللہ کے یہاں اس جرم کی قطعاً معافی اور بخشش نہیں ہے اور جو لوگ اس شرک کی حالت میں دنیا سے جا چکے یا جائیں گے، اُن کے لئے اُسی طرح جہنم کا ابدی عذاب ہے جس طرح کہ اللہ و رسول کے منکروں کے لئے ہے۔

لیکن شریعت میں بعض ایسی چیزوں کو بھی شرک کہہ دیا جاتا ہے جن میں اس درجہ کا حقیقی شرک تو نہیں ہے، لیکن اس کا کچھ رنگ اور شائبہ ہے، یا اُن سے اس شرک حقیقی کا اندیشہ ہے جیسے کہ بعض حدیثوں میں غیر اللہ کی قسم کھانے کو شرک فرمایا گیا ہے، یا ٹونے ٹوٹکے کی قسم کی چیزوں کو شرک بتلایا گیا ہے، یا ریاکو شرک قرار دیا گیا ہے۔ تو اس سے وہ حقیقی شرک مراد نہیں ہے، بلکہ یہ اس سے کم درجہ کے شرک ہیں، اسی لئے "شِرْكٌ دُوْنَ شِرْكٍ" علماء کی ایک خاص اصطلاح ہے جس کا مطلب یہی ہے کہ بعض شرک اس بڑے اور حقیقی شرک سے کم درجہ کے بھی ہیں، یہاں تک کہ اہل اللہ جن کی توحید کامل ہوتی ہے، وہ تو دنیا اور دنیا کی چیزوں کی محبت کو بھی شرک کہتے ہیں، ان کے نزدیک حُبِّ مال شرک ہے، حُبِّ جاہ شرک ہے، بیوی بچوں کی وہ محبت جو اللہ کے ساتھ بندہ کے تعلق پر ذرا بھی اثر ڈالے اور اللہ کی طرف سے غفلت کا باعث ہو اُن کے نزدیک شرک ہے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ ان چیزوں کو بُت پرستی کی قسم کا شرک کہتے ہیں، بلکہ مطلب صرف یہ ہے کہ یہ چیزیں توحید کے اصل مقام کے منافی ہیں۔

نئے زمانہ کے نئے بت توحید اور شرک کے سلسلہ میں ایک چیز اور بھی قابلِ ذکر ہے، ہمارے اس زمانہ میں یورپ کے اثرات نے پُرانے زمانہ کے شرک سے تو لوگوں کو بہت کچھ بیزار کر دیا ہے، کیونکہ اس کی بنیاد محض توہم پرستی اور جہالت پر تھی، اب ہر پڑھا لکھا آدمی اگر اس میں ذرا بھی شعور ہو اور اُس نے پڑھ لکھ کر کچھ بھی سوچنا سیکھا ہو، وہ بتوں کی پوجا کو، ستاروں، درختوں اور دریاؤں کی پوجا کو، اسی طرح جانوروں کی پوجا کو انتہائی درجہ کی حماقت اور بیوقوفی سمجھتا ہے چاہے رسمی طور پر اپنے قومی کلچر کا جز سمجھتے ہوئے وہ خود بھی ان چیزوں کی پوجا کرتا ہو لیکن اس کا دل ضرور اس سے منکر ہو چکا ہے لیکن اسی یورپ کے اثرات نے ان پُرانے اور دقیانوسی بتوں کے بجائے کچھ نئے بت تراش کے دنیا میں پھیلا دیئے ہیں اور آجکل انہی کی پوجا کا دور ہے۔ ان بتوں کے نام یہ ہیں:۔

قوم ___ وطن ___ قومی مفاد ___ وطنی مفاد ___ پیسہ

دولت ___ حکومتی اقتدار وغیرہ وغیرہ

واقعہ یہ ہے کہ اپنی قوم اور اپنے وطن کی بہی خواہی اور اس سے محبت ہرگز کوئی بُری بات نہیں ہے بلکہ بالکل فطری چیز ہے اور ایک درجہ میں اس کا حکم ہے، اسی طرح قومی مفاد اور وطنی مفاد کا لحاظ اور معاش کی فکر، دنیا میں راحت اور عزت سے زندگی گزارنے کی خواہش اگر اس میں حلال و حرام کی تمیز اور دوسروں کے حقوق کی رعایت ہو تو ہرگز بُری چیز نہیں ہے، ایسے ہی کسی اچھے مقصد کے لئے مثلاً عدل و انصاف قائم کرنے کے لئے یا اعلاء کلمۃ اللہ کی خدمت کے ارادہ سے حکومتی اقتدار حاصل کرنے کی فکر اور اس کے لئے کوشش کرنا ہرگز غلط چیز نہیں ہے اور انبیاء علیہم السلام نے ان باتوں سے کبھی نہیں روکا ہے، بلکہ ان امور کے بارے میں احکام دیئے ہیں۔

لیکن ہمارے اس زمانہ میں ان چیزوں نے اپنی حدود سے بہت آگے بڑھ کر ایک درجہ کے معبودوں اور طاغوتوں کا درجہ حاصل کر لیا ہے۔ اب قوم اور وطن کی مصلحت اور قومی اور وطنی مفاد کی خاطر سب کچھ کر لینا ایک اصول اور عقیدہ بن گیا ہے، اگرچہ اس میں کیسی ہی بے انصافی ہو اور دوسروں پر اس کا کچھ ہی اثر پڑتا ہو۔ اسی طرح پیٹ اور دولت اور دولت اور حکومت کی خواہش کو بھی اللہ کے احکام سے آزاد سمجھ لیا گیا ہے، گویا پیٹ ایک معبود ہے جس کی جس طرح بھی پوجا کی جائے صحیح ہے، اسی طرح دولت اور حکومت گویا ایک دیوی ہے جس پر دین و اخلاق کے سارے اصول اور احکام قربان کئے جا سکتے ہیں۔

آج بہت سے انسانوں نے ان ہی چیزوں کو گویا اپنا معبود بنا لیا ہے اور دنیا اس زور میں بہی جارہی ہے، یہ وطن پرستی، قوم پرستی، شکم پرستی، دولت اور حکومت پرستی اس زمانہ کے نئے شرک ہیں اور اسلامی توحید میں ان کی کوئی گنجائش نہیں۔

ہمیں ان سب نئے پرانے مشرکوں کو سامنے رکھ کر امام توحید سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السّلام کے الفاظ میں کہنا چاہئے۔

"اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ"	ہمارا کوئی تعلق نہیں تم سے اور تمہارے ان خود ساختہ معبودوں سے جن کی پوجا تم نے اختیار کر رکھی ہے۔
(سورۂ ممتحنہ ۔ ع ۔ ۱)	

اور ان سب غلط پرستشوں کی جڑ نفس پرستی ہے یعنی اللہ کے احکام کی پابندی اور پیروی کے بجائے جو جی میں آئے اور جو من کو بھائے وہ کرنا۔ یہی ہر شرک بلکہ ہر برائی اور ہر معصیت کی بنیاد ہے، گویا اس لحاظ سے سب سے بڑا بُت ہمارا نفس ہے۔

ہم نے اپنے زمانہ کے بعض خاص خدا رسیدہ بزرگوں کو دیکھا ہے کہ وہ کلمہ شریف

کی تشریح کرتے وقت زیادہ زور اسی پہلو پر دیتے تھے، ان کے نزدیک توحید کا اور لاالہ الا اللہ کا خاص تقاضا اہم سے یہ ہے کہ جو جی چاہے وہ نہیں کرنا، بلکہ ہر معاملہ میں اللہ کا جو حکم ہو وہ کرنا۔ قرآن پاک میں بھی ایک جگہ خواہش نفس کو "الٰہ" کہا گیا ہے:۔

"اَرَاَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ ؕ (الفرقان۔ ع ۔۴)

اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص اللہ کے احکام سے بے پروا ہو کر اپنے جی کی چاہت پر چلتا ہے وہ گویا اپنے نفس کا پجاری ہے اور اس کا نفس اس کا معبود ہو گیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک حدیث روایت کی جاتی ہے:۔

"اعدیٰ اعد ائك نفسك التی بین جنبیك ؕ (احیاء العلوم) — تمہارا سب سے بڑا دشمن تمہارا وہ نفس ہے جو تمہارے پہلوؤں کے بیچ میں ہے۔

پس ہمیں لاالہ الا اللہ کے ذریعہ ان سب چیزوں کی نفی کرنی چاہیے جن میں معبودیت اور اطاعت کا کوئی بھی شائبہ ہے اور ہر قسم اور ہر درجہ کے شرک سے اپنی حفاظت اور اپنے اندر بیزاری پیدا کرنی چاہیے اور ہر پہلو سے اپنی توحید کو کامل اور خالص بنانا چاہیے جس طرح شرک اللہ تعالیٰ کو انتہائی مبغوض ہے اسی طرح توحید اس کو انتہائی محبوب ہے اور سارے دین کی روح اور جان ہے۔

خاتم النبیین ﷺ کی تکمیل توحید توحید اور شرک کے سلسلہ میں ایک خاص بات یہ بھی قابل ذکر اور یاد رکھنے کے لائق ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر چونکہ نبوت کا سلسلہ ختم کر دیا گیا ہے اور اب کبھی کوئی پیغمبر آنے والا نہیں ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ توحید کی تعلیم کو اس قدر مکمل کر دیا ہے جس کے بعد شرک تو کیا، شائبہ شرک کے لئے بھی کوئی گنجائش نہیں رہی اور ان سب راستوں کو بند کر دیا گیا جن سے شیطان

شرک کو لاسکتا تھا۔

سب سے بڑا خطرہ یہ تھا کہ جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اُمّت کو شیطان نے ان کے بارے میں گمراہ کیا، کہ وہ ان کو اللہ اور اللہ کا بیٹا کہنے لگی، اسی طرح یہ اُمّت شیطان کے فریب میں آکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کوئی مشرکانہ عقیدہ قائم نہ کر بیٹھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا دروازہ بند کرنے کے لئے صاف صاف فرمادیا ہے :۔

• لَا تُطْرُوْنِیْ کَمَا اَطْرَتِ النَّصَارٰی عِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ فَاِنَّمَا اَنَا عَبْدُہٗ فَقُوْلُوْا عَبْدُ اللّٰہِ وَرَسُوْلُہٗ۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

یعنی نصاریٰ نے جس طرح اپنے پیغمبر عیسیٰ بن مریم کو حد سے بڑھایا تم میرے ساتھ یہ معاملہ نہ کرو، میں بس اللہ کا بندہ ہوں، اس لئے مجھے اُس کا بندہ اور رسول ہی کہو۔

بعض اگلی امتوں نے اپنے پیغمبروں کی قبروں کو سجدہ گاہ بنالیا تھا، آپ نے اُن کا حوالہ دیتے ہوئے اپنی اُمّت کو آگاہی دی اور فرمایا :۔

• اِنَّ مَنْ کَانَ قَبْلَکُمْ کَانُوْا یَتَّخِذُوْنَ قُبُوْرَ اَنْبِیَائِھِمْ مَسَاجِدَ فَلَا تَتَّخِذُوْا الْقُبُوْرَ مَسَاجِدَ اِنِّیْ اَنْھَاکُمْ عَنْ ذٰالِکَ (مسلم)

تم سے پہلی بعض امتوں نے اپنے پیغمبروں کی قبروں کو سجدہ گاہ بنالیا تھا، تم ایسا نہ کرنا دیکھو خبردار! میں تم کو اس سے منع کرتا ہوں!

اور اپنے آخری مرض میں اللہ سے دُعا فرمائی :۔

اَللّٰھُمَّ لَا تَجْعَلْ قَبْرِیْ وَثَنًا یُعْبَدُ۔ (مؤطا امام مالک)

اے اللہ! میری قبر کو بُت نہ بنانا، جس کی پوجا کی جائے۔

ایک روایت میں آتا ہے کہ بعض صحابہ نے کسی ملک میں دیکھا کہ لوگ اپنے اکابر

کو سجدہ کرتے ہیں تو انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت چاہی کہ ہم آپ کو سجدہ کریں، آپ نے پہلے اُن سے پوچھا کہ بتاؤ جب میں اس دنیا سے چلا جاؤں گا تو کیا تم میری قبر کو بھی سجدہ کرو گے ؟ اُن صحابی کو چونکہ قبر کے سجدہ کے بارے میں کوئی غلط فہمی نہ تھی اور وہ سمجھتے تھے کہ اسلام کی توحید میں اس کی کوئی گنجائش ہو ہی نہیں سکتی، اس لئے انہوں نے صاف فرمایا کہ حضرت میں حضور کی قبر کو تو سجدہ نہیں کروں گا، تو آپ نے ان سے فرمایا۔

فَلَا تَفْعَلُوْا ـــــ (ابوداؤد)

یعنی جب تم جانتے ہو کہ میں ایک فانی ہستی ہوں اور ایک دن مر کر قبر میں جانے والا ہوں اور اسکے بعد تم بھی مجھے سجدہ کے قابل نہ سمجھو گے، تو پھر ایسے شخص کے لئے سجدہ کی کیا گنجائش ہے۔

ایک دوسرے صحابی (سلمان فارسیؓ) نے جب آپ کو سجدہ کرنے کی خواہش ظاہر کی تو اُن سے بھی آپؐ نے ایسی ہی بات کہی اور آخر میں فرمایا۔

"فَلَا تَسْجُدْ لِيْ وَاسْجُدْ لِلْحَيِّ الَّذِيْ لَا يَمُوْتُ" (دیلمی، کنز العمال)

پس تم مجھے سجدہ نہ کرو، بلکہ سجدہ اُسی اللہ کے لئے مخصوص رکھو، جو ہمیشہ زندہ اور باقی رہنے والا ہے اور جس کو کبھی فنا اور موت نہیں ہے۔

اور سجدہ تو سجدہ، حدیثوں میں ہے کہ آپ نے اپنے لئے صحابہ کو قیام تعظیمی سے بھی منع فرمایا، دراصل یہ سارے احکام اور یہ ساری احتیاطیں اسی لئے تھیں کہ شرک کیلئے کوئی گنجائش اور کوئی رستہ باقی نہ رہ جائے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اسی سلسلہ کی روک تھام اور راہ بندی کا اندازہ اس

واقعہ سے خوب کیا جاسکتا ہے کہ حضورؐ کے شیر خوار صاحبزادے حضرت ابراہیم (علی ابیہ وعلیہ الصلوٰۃ والسلام) کی جس دن وفات ہوئی، اتفاق سے اُسی دن سورج گرہن لگا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اندیشہ ہوا کہ کہیں پُرانے جاہلی اعتقادات اور خیالات کے مطابق لوگ یہ نہ سمجھ لیں کہ سورج کو یہ گرہن میرے گھر کی اس غمی کی وجہ سے لگا ہے، اس لئے آپ نے اعلان کرا کے تمام مسلمانوں کو اُسی وقت مسجد میں جمع کیا اور سورج گرہن کی نماز پڑھنے کے بعد خطبہ دیا، جس میں اللہ کی حمد و ثنا کے بعد ارشاد فرمایا:۔

اِنَّ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ اٰیَتَانِ مِنْ اٰیَاتِ اللّٰهِ لَا یَنْکَسِفَانِ لِمَوْتِ اَحَدٍ وَّلَا لِحَیٰوتِہٖ۔	لوگو! حقیقت یہ ہے کہ سورج اور چاند اللہ کی قدرت کی نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں کسی کی موت و حیات سے ان کے گہن کا کوئی تعلق نہیں۔

یہ دراصل عقیدۂ توحید ہی کی حفاظت کے لئے حضورؐ نے فرمایا۔

آپؐ نے اس کو بھی برداشت نہیں کیا کہ کسی کو سورج کے گہن میں آنے کے متعلق یہ خیال ہو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کی غمی کی وجہ سے یہ ہوا ہے۔ اسی طرح شریعت کے احکام میں بھی توحید کی حفاظت کا اور شرک کی روک تھام کا انتہائی لحاظ کیا گیا ہے۔

مثلاً سورج کے طلوع اور غروب کے وقت اور نصف النہار کے وقت نماز سے منع فرما دیا گیا، تاکہ آفتاب پرستوں سے ظاہری مشابہت بھی نہ ہو اور کسی کو غلط فہمی نہ ہو۔

اسی کی دوسری مثال یہ دیکھئے ہر نماز میں رکوع و سجدہ ضروری ہے اور بغیر رکوع و سجدہ کے گویا نماز ہوتی ہی نہیں، لیکن جنازہ کی نماز میں سے رکوع و سجدہ نکال لیا گیا، تاکہ کسی دیکھنے والے کو بھی یہ شبہ نہ ہو کہ ہم اس میت کے سامنے جھک رہے ہیں یا سجدہ

کر رہے ہیں۔

اللہ کی شان ہے اور شیطان کی کامیابی لائق صد رنج اور قابل عبرت ہے کہ جس دین میں شرک کے راستوں کو اس طرح بند کیا گیا تھا، اُسی کے نام لیواؤں میں شرک کی تمام وہ قسمیں آج موجود ہیں جن میں اگلی امتیں مبتلا ہو کر مشرک ہوئی تھیں۔

الحمد للہ توحید اور شرک کا بیان کافی تفصیل سے ہو گیا، ہم نے اپنے نزدیک اس کی کوشش کی، کہ اس موضوع سے متعلق کوئی ضروری بات بیان سے رہ نہ جائے۔

الحمد للہ الذی بعزتہٖ وجلالہ تتم الصٰلحٰت۔

عقیدۂ آخرت

جن حقیقتوں پر ہمارے لئے ایمان لانا ضروری ہے اُن میں سے ایک آخرت کا عقیدہ ہے قرآن مجید میں اکثر مقامات پر "ایمان باللہ" کے ساتھ "ایمان بالیوم الآخر" کا ذکر کیا جاتا ہے، مثلاً کہیں فرمایا گیا ہے:۔

"مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ"

کہیں ارشاد ہوا:۔

"يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ"

آخرت پر ایمان لانے کا مطلب کیا ہے؟ آخرت پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی بتلائی ہوئی اس حقیقت کو تسلیم کیا جائے اور اس پر یقین کیا جائے کہ اس دنیا کی زندگی کے بعد ایک اور زندگی اور ایک اور عالم آنے والا ہے اور وہاں انسان کو اس دنیا میں کئے ہوئے اُس کے بُرے اور بھلے اعمال کی جزا اور سزا ملے گی، یہ اس عقیدہ کا اجمال ہے، قرآن و حدیث میں اس کی پوری پوری تفصیل فرمائی گئی ہے۔

آخرت عقلاً بھی ضروری ہے! آخرت کے بارے میں اتنی اجمالی بات تو ہر شخص کی سمجھ میں خود بھی آسکتی ہے کہ ہماری اس زندگی کے بعد کوئی اور ایسی زندگی ضرور ہونی چاہیئے جس

میں لوگوں کو اُن کے اعمال کی جزا اور سزا ملے، کیونکہ یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے لوگ عمر بھر بڑی بڑی برائیاں کرتے ہیں، ڈاکے ڈالتے ہیں، غریبوں کا خون چوستے ہیں، رشوتیں لیتے ہیں، کمزوروں پر ظلم کرتے ہیں، لوگوں کے حق مارتے ہیں اور زندگی بھر عیش اڑاتے رہتے ہیں اور اسی حال میں مر جاتے ہیں، اسی طرح بہت سے لوگوں کو دیکھا جاتا ہے کہ وہ بیچارے بڑی نیکی کی زندگی گزارتے ہیں، کسی پر ظلم نہیں کرتے، کسی کے ساتھ دغا اور دھوکا نہیں کرتے، کسی کا حق نہیں مارتے، اللہ کی عبادت بھی کرتے ہیں، اس کی مخلوق کی خدمت بھی کرتے ہیں، اس کے باوجود ان کی زندگی تنگی اور تکلیف سے گزرتی ہے کبھی کوئی بیماری آزاری ہے، کبھی کوئی تکلیف اور پریشانی ہے اور اسی حال میں اس دنیا سے چلے جاتے ہیں۔

تو جب یہ دنیا اللہ کی پیدا کی ہوئی دنیا ہے اور وہ ہمارے سب اچھے بُرے اعمال کو دیکھتا ہے اور ہم آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ یہاں اس دنیا میں نہ نیکوں کو اُن کی نیکی کا صلہ اور انعام مل رہا ہے اور نہ مجرموں پاپیوں کو ان کے پاپ اور ظلم کی کوئی سزا دی جا رہی ہے تو خود بخود یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ پھر اللہ کی طرف سے یہ جزا اور سزا کسی دوسری زندگی میں ملنی چاہیئے، یہ تو نہیں ہو سکتا کہ اللہ کے یہاں ایسا اندھیر ہو کہ نہ نیکوں کی نیکی کی کوئی قدر ہو اور نہ ظالموں اور بدکاروں کی بدمعاشی اور بدکاری اور ان کے ظلم و ستم پر کوئی باز پرس ہو اور سارے پارساؤں اور پرہیزگاروں اور چوروں ڈاکوؤں کے ساتھ اندھیر نگری والا ایک ہی برتاؤ ہو، اللہ تعالیٰ کی ہستی تو بہت بلند ہے، یہ طرزِ عمل تو کسی بھلے آدمی کے بھی شایانِ شان نہیں کہ وہ شریفوں اور شریروں اور ظالموں اور مظلوموں کے ساتھ ایک ہی سا برتاؤ کرے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے:۔

أَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِيْنَ كَالْمُجْرِمِيْنَ   کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ ہم فرمانبرداروں اور نافرمانوں کیساتھ یکساں برتاؤ کریں۔

(سورۂ قلم - ع - ۲)

الغرض اس دنیا میں جزا اور سزا کے نہ ہونے سے خود بخود یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اس دنیوی زندگی کے بعد کوئی اور زندگی ایسی ہونی چاہیے جس میں لوگوں کو اُن کے کئے کی جزا اور سزا ملے۔

یہی بات ایک دوسرے عنوان سے اور دوسرے طریقوں پر یوں بھی کہی جاسکتی ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس دنیا کی ہر چیز کے کچھ خواص اور آثار ہیں، مثلاً آگ کی خاصیت جلانا ہے پانی کی خاصیت بجھانا اور صفائی کرنا ہے، اسی طرح ہر جڑی بوٹی میں بھی کچھ خاصیتیں ہیں، ایسے ہی انسان کے مادی اعمال کے بھی خواص اور آثار ہیں جو لازماً ظاہر ہو کے رہتے ہیں، مثلاً وہ کھانا کھاتا ہے تو اس سے اس کی بھوک مرتی ہے آسودگی آتی ہے، اسی طرح پانی پینے سے پیاس بجھتی ہے، اگر کوئی سخت چیز کھالی جائے تو پیٹ میں درد ہوجاتا ہے، بہت زیادہ کھالیا جائے تو بدہضمی ہوجاتی ہے، زہر کھانے سے آدمی مرجاتا ہے دوا استعمال کرنے سے مرض جاتا رہتا ہے، کوئی ٹانک اور قوی دوا کھانے سے طاقت اور توانائی آجاتی ہے اور ظاہر ہے کہ انسان کے اخلاقی اعمال خواہ وہ اچھے ہوں یا بُرے اس کے مادی اعمال سے زیادہ اہم اور اعلیٰ ہیں، اس لئے ایسا نہیں ہوسکتا کہ اُس کے اخلاقی اعمال کا کوئی اثر کوئی نتیجہ اور کوئی خاصیت ہی نہ ہو۔ مثلاً ایک شخص اپنا کھانا خود کھانے کے بجائے کسی دوسرے بھوکے کو کھلا دیتا ہے اور خود بھوکا رہتا ہے یا کسی پیاسے کو پانی پلاتا ہے اور اور خود پیاس کی تکلیف اٹھاتا ہے، یا کسی لاوارث بیمار کی محض اللہ واسطے خدمت اور تیمارداری کرتا ہے، یا غریبوں یتیموں اور بیواؤں کی خبرگیری کرتا ہے اور اپنی محنت سے کمایا ہوا مال اُن پر خرچ کرتا ہے، پھر اس سب کے ساتھ اللہ کی عبادت اور بندگی بھی کرتا

ہے۔ تو انسانی عقل اور فطرت کا یہ کھلا ہوا تقاضا اور فیصلہ ہے کہ ان نیک اعمال کے بھی اثرات اور نتائج ظاہر ہونے چاہئیں اور وہ مادی اعمال کے نتائج و آثار سے بہت زیادہ اہم اور اعلیٰ ہونے چاہئیں۔

اسی طرح اگر ایک شخص ظلم کرتا ہے، زیردستوں اور کمزوروں کو ستاتا ہے، امانت میں خیانت اور معاملات میں دھوکہ بازی کرتا ہے، رشوت لیتا ہے یا ڈاکے ڈالتا ہے، قزاقی کرتا ہے، بے رحم ہے، بے درد ہے، جلاد ہے، اللہ کے بیگناہ بندوں کا خون بہاتا ہے، اللہ کو کبھی بھولے سے یاد نہیں کرتا، غرض اپنے وقت کا فرعون اور نمرود ہے، تو ہماری عقل کہتی ہے کہ اس کی ان بداعمالیوں کے نتائج بھی نہایت سنگین ہونے چاہئیں اور سامنے آنے چاہئیں۔ آخر انسان جب اپنی معمولی سے معمولی ہر مادی غلطی کا خمیازہ بھگتتا ہے تو اتنی بڑی بڑی اخلاقی غلط کاریوں کا نتیجہ نہ بھگتے گا۔ ؎

گندم از گندم بروید جو ز جو
از مکافاتِ عمل غافل مشو

اسی کو قرآن مجید نے ایک جگہ فرمایا:۔

اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ اجْتَرَحُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَوَآءً مَّحْيَاهُمْ وَ مَمَاتُهُمْ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ۝

(جاثیہ - ع - ۲)

جن لوگوں نے پیٹ بھر کے بدکاریاں اور بدمعاشیاں کی ہیں کیا وہ گمان کرتے ہیں کہ ہم ان مجرموں کو اپنے ان نیک بندوں کی طرح کردیں گے جو ایمان لائے اور نیک اعمال کئے اور ان کا انجام اور جینا مرنا برابر اور یکساں ہوگا، بہت نادرست اور بالکل بیہودہ ہے اُن کا یہ خیال۔

بہرحال جب ہم یہ بات کھلی آنکھوں دیکھ رہے ہیں کہ انسان کے مادی اعمال کا نتیجہ اور اثر تو یہاں ظاہر ہوتا ہے لیکن اس کے اخلاقی اور روحانی اعمال کا کوئی اثر اور کوئی نتیجہ یہاں ظاہر نہیں ہوتا، تو ہماری عقل و فطرت اور ہماری سمجھ بوجھ ضروری قرار دیتی ہے کہ پھر اس دنیوی زندگی کے بعد کوئی اور زندگی ایسی ہونی چاہیئے جس میں ان اچھے یا بُرے اخلاقی اور روحانی اعمال کے آثار و خواص اور نتائج ظاہر ہوں اور انسانوں کو اُن کی نیکو کاریوں اور بدکاریوں کی جزا اور سزا ملے۔

جزا اور سزا اس دنیا میں کیوں نہیں دیجاتی؟ اور اس میں حکمت یہ ہے کہ اگر اسی دنیا میں ہر بُرائی اور بھلائی کی سزا اور جزا مل جایا کرتی، تو پھر یہ زندگی امتحانی زندگی نہ رہتی، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کو امتحان کی دنیا بنایا ہے اور جزا و سزا کو یعنی عذاب و ثواب کو غیب کے پردہ میں رکھ کر انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ یہ اعلان کرایا ہے کہ جو کوئی یہاں میرے احکام کی فرمانبرداری کرے گا اور نیکی کی زندگی گزارے گا، میں اُس کو آئندہ زندگی میں یہ انعام دوں گا اور جو کوئی سرکشی کرے گا اور نافرمانی و بدکرداری کی زندگی گزارے گا میں اُس کو ایسی ایسی سزائیں دوں گا، تو اگر بالفرض ہر بُرائی بھلائی کا بدلہ اسی دنیا میں ہاتھ کے ہاتھ اور نقد مل جایا کرتا، تو یہ امتحان نہیں ہو سکتا تھا، پھر تو ہر آدمی نافرمانی سے اسی طرح بچتا جس طرح آگ میں کودنے سے ہر ایک بچتا ہے اور نیکی کرنے کیلئے ہر ایک اسی طرح مجبور ہوتا جس طرح کھانے پینے کیلئے مجبور ہوتا ہے اور پھر عذاب و ثواب بے معنی ہوتا۔

اس کے علاوہ ایک وجہ جزا اور سزا کو دوسرے عالم میں رکھنے کی یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے فرمانبردار بندوں کو جو صلہ اور انعام دینا چاہتا ہے اور جیسی چین و آرام والی زندگی انہیں بخشنا چاہتا ہے، اس دنیا میں اس کا کوئی امکان ہی نہیں ہے اور اسی

طرح اپنے نافرمانوں کو وہ جو سخت ترین سزا اور عذاب دینا چاہتا ہے اس کی برداشت کی بھی ہماری اس دنیا میں طاقت نہیں ہے، یعنی وہ اتنا سخت ہے کہ اگر وہ اس دنیا میں ظاہر ہو جائے تو یہاں کا سارا چین و آرام ختم ہو جائے اور یہ دنیا سوخت ہو کر رہ جائے، یہ دنیا تو بڑی کمزور اور بہت محدود طاقت رکھنے والی دنیا ہے اور پھر اس کا نظام ایسا ہے کہ اس میں راحتیں اور تکلیفیں ملی جلی ہیں، تو اللہ تعالیٰ اپنے فرمانبردار بندوں کو ان کی روحانی اور اخلاقی نیکیوں کے صلہ میں جو چین و آرام کی زندگی دینا چاہتا ہے وہ کسی ایسی ہی جگہ اور ایسے ہی کسی عالم میں ممکن ہے جہاں کسی تکلیف کا گذر نہ ہو اور وہاں صرف بہار ہی بہار ہو اور اسی طرح اپنے مجرموں اور نافرمانوں کو ان کی اخلاقی اور روحانی بدکرداریوں کی جو سخت سزا اور جو دردناک عذاب وہ دینا چاہتا ہے وہ کسی ایسے ہی عالم میں ممکن ہے جہاں بس دکھ ہی دکھ اور تکلیف ہی تکلیف ہو۔

بہرحال اللہ تعالیٰ کا فیصلہ یہی ہے کہ وہ بندوں کے اچھے بُرے اعمال کی جزا اور سزا اس دنیوی زندگی کے بعد والی زندگی میں اور دوسرے عالم میں دے گا، بس وہی عالم آخرت کا عالم ہے اور اس کے دو حصے ہیں، ایک جنت اور ایک دوزخ، جنت میں اللہ کے انعام اور اس کے خاص فضل و کرم کا ظہور ہوگا اور دوزخ میں اس کے صرف قہر و غضب کا ظہور ہوگا اور یہ دونوں ظہور اعلیٰ پیمانہ پر ہوں گے اور بس وہیں پوری الٰہی شان ظاہر ہوگی۔

اللہ کی شان اور اس کے جلال و جمال کے ظہور کے لئے بھی آخرت کی ضرورت ہے!

تو عالم آخرت کی اور جنت و دوزخ کی ضرورت اسلئے بھی ہے کہ اللہ کے مہر و قہر اور جلال و جمال کا ظہور اعلیٰ پیمانہ پر ہو سکے، ہماری اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کی ان صفات کا اگرچہ ظہور ہے لیکن پورے ظہور کی اس دنیا میں برداشت نہ ہونے کی وجہ سے یہ ظہور بہت محدود ہے، یعنی

یہاں اللہ کی جن جمالی صفات کا ظہور ہو رہا ہے وہ بھی محدود ہے اور جن جلالی صفات کا ظہور ہو رہا ہے وہ بھی محدود ہے اپورے اور کامل ظہور کی ہماری یہ دنیا تاب ہی نہیں لاسکتی بہرحال اس لئے بھی ایک ایسے عالم کی ضرورت ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی صفاتِ جلال و جمال کا کامل ظہور ہوسکے۔

دراصل یہ ظہور ہی تو عالم کی تخلیق کا خاص مقصد ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے دنیا کی یہ بساط اسی لئے بچھائی ہے کہ اس کی صفاتِ کمال کا ظہور ہو، پس آخرت کو اگر نہ مانا جائے تو یہ مقصد کہاں پورا ہوگا، لہٰذا اس وجہ سے بھی اس دنیا کے خاتمہ کے بعد عالم آخرت کا برپا ہونا ضروری اور ناگزیر ہے۔

عقیدۂ آخرت کا اثر انسان کی زندگی پر انسانی اعمال کی جزا و سزا کے لئے اور اللہ تعالیٰ کے جلال و جمال اور قہر و مہر کے کامل ظہور کے لئے عالم آخرت کا از روئے عقل ضروری ہونا تو معلوم ہو چکا، اس کے بعد اس پر بھی غور کیجئے کہ انسانی زندگی کے سدھار میں عقیدۂ آخرت کو کتنا دخل ہے، دنیا کی تاریخ سے واقفیت اور غور و فکر کی کچھ صلاحیت رکھنے والا کوئی آدمی بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کرسکتا کہ برائیوں اور بداخلاقیوں سے انسانوں کو آخرت کا یقین وایمان جس قدر بچاتا ہے اور بچاسکتا ہے کوئی دوسری چیز اور کوئی دوسرا انسانی انتظام اس قدر نہیں بچاسکتا۔

بے شک حکومت کا قانون اور تہذیبی ترقی یا بُرائی بھلائی کا احساس اور نفس کی شرافت بھی انسان کو برائیوں اور بداخلاقیوں سے بچانے والی چیزیں ہیں لیکن یہ اتنی مؤثر اور کارگر نہیں ہوتیں جتنا کہ مرنے کے بعد کی جزا و سزا کا یقین اور آخرت پر ایمان بشرطیکہ زندہ یقین اور حقیقی ایمان ہو، صرف نام کا ایمان اور بے جان عقیدہ نہ ہو۔

یہ کوئی خالی منطق کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ تجربہ اور مشاہدہ ہے کہ برائیوں اور بداخلاقیوں کی گنجائش اسی معاشرہ میں ہوتی ہے جو آخرت اور مرنے کے بعد کی اللہ کے سامنے پیشی اور جزا وسزا کے یقین سے خالی ہو، ورنہ جن کے دلوں میں یقین و ایمان کا نور موجود ہو، اُن کا حال تو یہ ہوتا ہے کہ وہ بُرے خیالات اور بُرے وسوسوں سے بھی گھبراتے ہیں اور اپنے دل کو بُرائی کے خیال سے بھی پاک رکھنا ضروری سمجھتے ہیں۔

جو لوگ دنیا کی تاریخ سے کچھ واقف ہیں، وہ جانتے ہیں کہ اس دنیا میں سب سے زیادہ پاکیزہ ستھری اور مہذب و مبارک زندگی اُن ہی بندگانِ اللہ کی رہی ہے جو مرنے کے بعد کی پیشی اور آخرت کی جزا وسزا پر یقین رکھتے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ یقین آدمی کو بُرائی کے ارادہ سے وہاں بھی روکتا ہے جہاں کوئی دیکھنے والا نہ ہو اور دنیا میں کسی قانونی پکڑ اور سزا کا خطرہ نہ ہو۔

الغرض اس دنیا کے خاتمہ کے بعد عالمِ آخرت کا برپا ہونا، اللہ کے پیغمبروں اور اس کی کتابوں کی بتائی ہوئی ایک حقیقت بھی ہے اور خود ہماری عقل کا تقاضہ بھی ہے، اور اس پر ایمان و عقیدہ ہماری ایک بہت بڑی مصلحت بھی ہے۔

آخرت کی تفصیلات نبوت ہی کے راستہ سے معلوم ہو سکتی ہیں!

لیکن جزا وسزا کے اُس عالم کی تفصیلات نبوت ہی کے راستہ سے معلوم ہو سکتی ہیں اور یہ بالکل یقینی بات ہے کہ اپنے اپنے وقت میں اللہ کے سب پیغمبروں نے اپنی اپنی امتوں کو آخرت کی اور جنت و دوزخ کی ضروری تفصیلات بتلائی تھیں، لیکن ان امتوں نے پوری طرح ان کو محفوظ نہیں رکھا اور اب محفوظ اور مستند بیان صرف اللہ کے آخری نبی سیدنا حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اور ان کی لائی ہوئی اللہ کی کتاب قرآن مجید کا ہے، جو جوں کا توں

محفوظ ہے اور اس میں ایک بات بھی ایسی نہیں ہے جس سے عقلِ انسانی انکار کر سکے اور وہ ناممکن اور محال ہو۔

آخرت کی تفصیلات میں شبہ علم وعقل کی نارسائی کی وجہ سے ہوتا ہے!

ہاں چونکہ عالمِ آخرت کی چیزیں ہماری دیکھی بھالی نہیں ہیں اور ہم نے ان کا کبھی تجربہ اور مشاہدہ نہیں کیا ہے، اس لئے وہ ہمیں اچنبھے کی سی معلوم ہوتی ہیں اور ان کا سمجھنا بعض لوگوں کے لئے مشکل ہوتا ہے لیکن یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ کسی بچے سے جو ابھی اپنی ماں کے پیٹ ہی میں ہو اگر کسی آلہ کے ذریعہ یہ کہا جائے کہ اے بچے! تو عنقریب ایک ایسی دنیا میں آنے والا ہے جہاں لاکھوں میل کی زمین ہے اور اس سے بھی بڑے سمندر ہیں اور آسمان ہے، چاند، سورج اور لاکھوں ستارے ہیں اور وہاں ہوائی جہاز اُڑتے ہیں، ریلیں دوڑتی ہیں، اور لڑائیاں ہوتی ہیں جن میں توپیں گرجتی ہیں اور ایٹم بم چلتے ہیں، تو وہ بچہ اگر کسی طرح ان باتوں کو سمجھ بھی لے تو اس کے لئے ان باتوں کا یقین کرنا بڑا مشکل ہوگا کیونکہ وہ جس دنیا میں ہے اور جس کو دیکھتا اور جانتا ہے وہ تو بس اس کے ماں کے پیٹ کی ایک بالشت بھر کی دنیا ہے۔

بالکل ایسا ہی معاملہ آخرت کے بارے میں اس دنیا کے انسانوں کا ہے، واقعہ یہ ہے کہ عالمِ آخرت اس دنیا کے مقابلہ میں اسی طرح بے حد وسیع اور بے انتہا ترقی یافتہ ہوگا، جس طرح ماں کے پیٹ کے مقابلہ میں ہماری یہ زمین و آسمان والی دنیا بے حد وسیع اور ترقی یافتہ ہے اور جس طرح بچہ ماں کے پیٹ سے اس دنیا میں آنے کے بعد وہ سب کچھ دیکھ لیتا ہے جس کو وہ ماں کے پیٹ کے زمانہ میں سمجھ بھی نہیں سکتا تھا، اسی طرح آخرت کے عالم میں پہنچ کر سب انسان وہ سب کچھ دیکھ لیں گے جو اللہ کے پیغمبروں نے وہاں کے متعلق بتلایا ہے۔

بہرحال نبوت کے راستہ سے آخرت کے متعلق جو تفصیلات ہمیں معلوم ہوئیں ہیں وہ سب یقینی اور حق ہیں اور ان میں کوئی چیز بھی ناممکن اور محال نہیں ہے، ہاں چونکہ یہاں ہمارا علم و خیال بہت محدود اور ناقص ہے اسلئے بعض لوگوں کو وہ باتیں اچنبھے کی سی معلوم ہوتی ہے اور کم عقل لوگ اپنی نادانی سے ان میں شبہ کرتے ہیں لیکن ایمان کا اور عقل سلیم کا فیصلہ یہی ہے کہ اللہ نے اور اس کے صادق ومصدق رسول نے آخرت کے بارے میں اور وہاں کی جزا سزا کے متعلق جو کچھ بتلایا ہے اس سب کو حق مانا جائے اور اس پر یقین کیا جائے۔

یہ بالکل عقلی اور فطری بات ہے کہ جس چیز کو ہم نہیں جانتے اور ہم نے خود اس کو نہیں دیکھا اسکے متعلق ہم اُن سچے لوگوں کے بیان پر اعتماد کریں جن کو اس کا علم کسی مستند ذریعہ سے ہوگیا ہے، یا جنہوں نے اسکو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور جن کی سچائی اور پاکبازی بھی ثابت ہو چکی ہے، پس مرنے کے بعد عالم برزخ اور قبر کے بارے میں اور پھر قیامت کے بارے میں اور حشر نشر اور حساب کے بارے میں اور جنت دوزخ کے بارہ میں جو کچھ قرآن پاک نے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتلایا ہے اس سب پر ہمارا ایمان ہے اور ہم کو یقین ہے کہ وہ سب کچھ بالکل اسی طرح ہونے والا ہے جس طرح کہ بتلایا گیا ہے، بس یہی معنی ہیں آخرت پر ایمان لانے کے۔ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ۔

اللہ اور آخرت پر ایمان کا لازمی تقاضہ اس کے بعد یہ بتلانے کی ضرورت نہیں رہتی کہ اللہ اور آخرت پر ایمان لانے کے بعد آپ سے آپ ہم پر یہ لازم ہوجاتا ہے کہ ہم جانوروں کی سی من مانی زندگی نہ گزاریں، بلکہ اللہ کی بندگی اور فرمانبرداری والی زندگی گزاریں، تاکہ ہمارا خالق اور مالک جس کے قبضہ میں سب کچھ ہے وہ ہم سے راضی ہو اور آخرت کی کبھی نہ ختم ہونے والی زندگی میں ہم اسکے غضب اور عذاب سے بچ سکیں اور وہ جنت اور وہ انعامات حاصل کر سکیں جن کا اس نے اپنے فرمانبردار اور اطاعت شعار بندوں کے لئے وعدہ فرمایا ہے۔ ⁂

رسالت

رسالت کی ضرورت | جب اللہ کو اور آخرت کو ماننے کے بعد ہمارے لئے یہ ضروری ہو گیا، کہ اس دنیا میں ہم اللہ کی بندگی اور فرمانبرداری والی زندگی گزاریں تو ہم اس کے محتاج ہو گئے کہ کسی طرح سے ہمیں یہ معلوم ہو کہ اللہ نے کیا حکام ہمارے لئے کیا ہیں اور اس کی طرف سے کن کاموں کی اجازت ہے اور کن کاموں اور کن باتوں کی ممانعت ہے اور یہ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر انسان کو براہ راست یہ باتیں بتلاتا نہیں اور جو تھوڑی سی عقل اور سمجھ بوجھ انسانوں کو ملی ہوئی ہے وہ اس دنیا کی روزمرہ کی ضرورتوں کے لئے تو کسی حد تک کافی ہے، لیکن یہ معلوم کرنا اس کے بس میں بالکل نہیں کہ اللہ ہم سے کیا چاہتا ہے اور وہ کن کاموں سے راضی اور کن سے ناراض ہوتا ہے، پس ہماری اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے رسالت اور پیغمبری کا سلسلہ قائم فرمایا۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے جس طرح ہماری ضرورت کے لئے سورج پیدا فرمایا جس سے ہم گرمی اور روشنی حاصل کرتے ہیں اور جس طرح اس نے ہمارے لئے غذا کی پیداوار کا نظام قائم کیا، اسی طرح اس نے ہماری اور صرف ہماری ضرورت کیلئے نبوت کا نظام قائم فرمایا، یعنی طے فرمایا کہ اپنے خاص اور منتخب نمائندوں کے ذریعہ عام بندوں تک وہ اپنی ہدایت اور اپنا قانون پہنچایا کرے گا۔ پس معلوم ہوا کہ نبوت و شریعت درحقیقت خود ہماری ضرورت ہے اور اللہ تعالیٰ کی صفتِ رحمت و ربوبیت کا

تقاضہ ہے بالکل اسی طرح جس طرح کہ سورج اور ہوا پانی وغیرہ ہماری ضرورتیں ہیں اور اللہ کی رحمت وربوبیت نے ہماری ضرورت کے لئے ان سب چیزوں کو پیدا کیا ہے۔

پس وہ لوگ بڑے جاہل اور حقیقت ناشناس ہیں جو دین اور شریعت کے متعلق سمجھتے ہیں کہ یہ ایک بوجھ ہے جو اللہ کی طرف سے انسانوں پر لاد دیا گیا ہے اور اس کا تعلق اللہ کی بس صفتِ حاکمیت اور مالکیت سے ہے۔ بہرحال نبوت اور شریعت ہماری ضرورت اور اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے کیونکہ بندے اسی کے راستہ سے اللہ کی رضا کے مقام تک اور جنت تک پہنچیں گے۔

رسول کون ہونا چاہیئے؟ اب ایک سوال یہ سامنے آتا ہے کہ نبی کون ہونا چاہیئے؟ اس بارے میں بعض قوموں کو بڑے مغالطے لگے ہیں بعضوں نے کہا ہے کہ خود اللہ کسی روپ میں آکر انسانوں کو اپنا قانون بتاتا ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ بادشاہ اپنی رعیت کے پاس اپنا حکم نامہ بھیجنا چاہتا ہے اور خود ہی پوسٹ مین کی وردی پہن کر اور اس کا روپ بھر کر اپنا حکم نامہ گھر گھر بانٹتا پھرتا ہے۔

ایسی مہمل اور لطلطیات ان ہی لوگوں نے کہی اور ان ہی لوگوں نے قبول کی جنہوں نے اللہ کی شان کو بالکل نہیں سمجھا۔

سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُونَ ٥

نبی فرشتہ نہیں بلکہ انسان ہی ہو سکتا ہے! اور بعضوں نے خیال کیا کہ نبی فرشتہ ہونا چاہیئے کیونکہ فرشتہ اللہ کی بڑی مقدس اور سراپا نورانی مخلوق ہے لیکن ان لوگوں نے یہ نہیں سمجھا کہ نبی اور پیغمبر کے لئے مقدس ہونے کی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ اس کی ضرورت ہے کہ جن انسانوں کی ہدایت کا کام اس کو کرنا ہے وہ ان کے رجحانات، ان کے مزاج اور

ان کے احساسات اور جذبات سے واقف ہو اور فرشتے بے شک مقدس اور نورانی تو ہیں، لیکن انسانی جذبات اور احساسات اور انسانی مزاج اور اس کی خواہشات سے وہ بیچارے نہ صرف یہ کہ ناواقف ہیں، بلکہ وہ تو ان کو سمجھ بھی نہیں سکتے۔ مثلاً بھوک، پیاس، غصہ، حسد، نفسانی شہوت ان چیزوں کی حقیقت کو فرشتہ سمجھ ہی نہیں سکتا۔ یہ بات معمولی غور و فکر سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ انسان کی زندگی میں بہت سی کیفیتیں ایسی ہیں جو اسی وقت سمجھ میں آتی ہیں جب انسان اُن سے گزرتا ہے، مثلاً جس شخص میں شہوت کا مادہ ہی نہ ہو یعنی وہ فطرتاً اس سے خالی ہو، وہ شہوت کی حقیقت کو سمجھنے سے بالکل قاصر رہے گا، اسی طرح جس شخص نے کبھی سوتے میں خواب نہ دیکھا ہو اس کو ہزار سمجھایا جائے وہ خواب کی حقیقت کو کبھی نہیں سمجھ سکتا اور ایک شہوت یا خواب ہی پر منحصر نہیں اکثر انسانی احساسات کا حال یہی ہے جس نے کبھی آم نہیں چکھا، اس کو کسی طرح آم کا ذائقہ نہیں سمجھایا جاسکتا، مادرزاد اندھے کو گلاب کے پھول کی رنگت اور اس کی حسین صورت دو گھنٹے کی تقریر سے بھی نہیں سمجھائی جاسکتی۔ بہرحال انسان کی ہدایت اور رہنمائی کے لئے یہ ضروری ہے کہ جو ہدایت کرنے والا ہو وہ انسان کے حالات سے اور اس کے رجحانات اور احساسات سے پوری طرح واقف ہو اور یہ بات چونکہ انسان ہی کو حاصل ہوسکتی ہے اسلئے اللہ تعالیٰ نے نبی ہمیشہ انسانوں ہی میں سے بھیجے اور جو بے وقوف اور احمق یہ کہتے تھے کہ نبی فرشتہ ہونا چاہیئے، قرآن مجید میں اُن سے کہا گیا کہ:۔

قُلْ لَّوْ كَانَ فِي الْأَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ

لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا ۝ (بنی اسرائیل ع ۱۱)

اس کا مطلب یہی ہے کہ نبی اور رسول اسی جنس میں سے ہونا چاہیئے، جن کی طرف

اور جن کی ہدایت کے لئے وہ بھیجا جائے تو اگر زمین میں بجائے انسانوں کے فرشتے آباد ہوتے اور رسول ان کی ہدایت کے لئے بھیجنا ہوتا تو ہم کسی فرشتہ ہی کو نبی بنا کر بھیجتے، لیکن جب زمین میں مستقل آبادی انسانوں ہی کی ہے اور ان ہی کی ہدایت و رہنمائی کے لئے نبی کی ضرورت ہے تو یہ ضرورت تو انسان ہی سے پوری ہو سکتی ہے، کیونکہ وہی انسانوں کے مسائل اور ان کے احوال اور ان کے طبعی تقاضوں کو اچھی طرح سمجھ سکتا ہے۔

نبی اگر اللہ یا اللہ کا اوتار یا فرشتہ ہو تو نبوت کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے

اس کے علاوہ، اگر نبی کو انسان نہ مانا جائے، بلکہ اللہ یا اللہ کا بیٹا یا اللہ کا اوتار یا فرشتہ سمجھا جائے تو نبوت و رسالت کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے، کیونکہ پھر نبی اور رسول کی زندگی اُن انسانوں کیلئے نمونہ اور مثال نہیں بن سکتی، جن کی ہدایت اور رہنمائی کے لئے وہ بھیجا گیا تھا، انسان کسی انسان کی پیروی اور نقل تو کر سکتا ہے اور اُس سے اس کا مطالبہ بھی کیا جا سکتا ہے لیکن اللہ کی یا فرشتہ کی نقل کرنا اُس بیچارے کے بس کی بات نہیں اور نہ اس سے اس کا مطالبہ ہی کیا جا سکتا ہے۔

نبیوں کو اللہ کا اوتار یا فرشتہ ماننے کے بعد اُنکی زندگیوں میں کوئی کمال بھی نہیں رہتا!

علاوہ ازیں نبیوں اور رسولوں کو اللہ یا اللہ کا اوتار یا فرشتہ قرار دینے کے بعد ان کی زندگی میں کوئی خاص کمال بھی نہیں رہتا۔ مثال کے طور پر غور کیجئے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اگر انسان مانا جائے تو ان کی زندگی ایک نہایت کامل اور بلند ترین انسان کی زندگی نظر آئے گی، جس میں ظلم کے مقابلہ میں صبر ہے، حلم ہے، زہد ہے، توکل ہے، علم و حکمت ہے، محبت و ہمدردی ہے، دلسوزی و غمخواری ہے اور اسی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے عطا کئے گئے معجزات ہیں جو گویا اُن کی سچائی کی سند اور نشانی ہیں، لیکن اگر ان کو اللہ یا اللہ کا بیٹا یا اللہ

کا اوتار یا فرشتہ مانا جائے تو اس معیار سے ہماری عقل ان کی زندگی میں حیرتناک نقائص اور کمزوریاں محسوس کرے گی، پھر ان کا کھانا پینا، مریم کے پیٹ سے پیدا ہونا، یہودیوں کا ان کو طرح طرح سے ستا سکنا اور ان کی بے انتہا توہین و تذلیل کرنا اور انجیلوں کے بیان کے مطابق، اُن کا سولی پر چڑھایا جانا۔ یہ سب باتیں بجائے کمال کے نقائص نظر آئیں گی، جن کی کوئی توجیہ بھی نہ کی جا سکے گی۔ بلکہ پھر تو اُن کے معجزات میں بھی کوئی ندرت اور خصوصیت نہیں رہے گی، کیونکہ اللہ کی قدرت کے تو ان معجزوں سے بھی بڑے بڑے نمونے دنیا کے اس کارخانہ میں ہم ہر وقت دیکھتے رہتے ہیں۔

الغرض اس مسئلہ پر جو شخص کچھ بھی غور کرے گا وہ اسی نتیجہ پر پہنچے گا کہ انسانوں کی ہدایت کے لئے آنے والے نبی اور رسول اُن ہی کی جنس سے ہونے چاہئیں اور نبیوں اور رسولوں کو اللہ یا اللہ کا اوتار یا فرشتہ قرار دینا ایک جاہلانہ اور احمقانہ گمراہی کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ اسی لئے قرآن مجید میں جا بجا اس حقیقت کا اعلان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی ہدایت کے لئے جتنے پیغمبر بھی اس دنیا میں بھیجے وہ سب انسان ہی تھے ـــــ ارشاد ہے:۔

قرآن مجید کا اعلان کہ سارے پیغمبر انسان ہی تھے

مَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْ اِلَيْهِمْ ۔ (سورہ یوسف ع ۱۲)

اے رسول! ہم نے تم سے پہلے بھی جو پیغمبر بھیجے وہ سب آدمی ہی تھے جن کی طرف ہم وحی بھیجتے تھے!

اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے بار بار اس کا اعلان کرایا کہ میں تو بس انسانوں میں سے ایک انسان ہوں، اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنا پیغمبر بنایا ہے۔

هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا ۔ میں اس کے سوا کچھ نہیں کہ انسان ہوں، اور اللہ کا پیغمبر ۔
(بنی اسرائیل ۔ ع ۔ ۱۰)

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۔ آپ اعلان کر دیجئے کہ میں تو بس تم جیسا ایک انسان ہی ہوں ۔
(الکھف ۔ ع ۔ ۱۲)

قرآن مجید نے اس مسئلہ کو اتنا روشن کیا ہے کہ سارے نبیوں کا انسان اور بشر ہونا مسلمانوں کے ایمان کا جزء ہوگیا ہے ۔ اسلامی عقائد کی کتابوں میں نبی کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ وہ انسان ہوتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ اپنی ہدایت اور اپنا پیغام دے کر اپنے بندوں کی طرف بھیجتا ہے اور پیغمبرانہ ذمہ داریاں اس کے سپرد کرتا ہے ۔

یہاں تک کی گفتگو سے یہ معلوم ہوگیا کہ نبوت و رسالت ہماری زندگی کی ایک ناگزیر ضرورت ہے اور یہ بھی معلوم ہوگیا کہ نبی اور رسول انسانوں ہی میں سے ہونا چاہئے، نیز یہ بھی معلوم ہوگیا کہ اسلامی عقیدہ اور قرآن مجید کی تعلیم بھی یہی ہے ۔

دنیا میں انبیاء برابر آتے رہے ہیں اس کے بعد آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ جو بڑا رحیم و کریم ہے اور جس نے انسان کے لئے وہ سب چیزیں پیدا کیں ہیں جن کی انسان کو اپنی زندگی میں ضرورت ہے، اُس نے انسان کی اس سب سے بڑی ضرورت کو بھی ہمیشہ پورا کیا ہے یعنی جب سے اس دنیا میں انسانوں کا سلسلہ شروع ہوا ہے اُسی وقت سے نبوت کا سلسلہ بھی جاری ہے اور ضرورت وقت کے مطابق مختلف زمانوں اور مختلف ملکوں اور علاقوں میں اس کے پیغمبر آتے رہے ہیں ۔ ہم یہ تو نہیں بتلا سکتے ہیں کہ کُل پیغمبر کتنے آئے قرآن مجید میں ان کی تعداد نہیں بتلائی گئی اور نہ اس کی ضرورت تھی، لیکن یہ صاف صاف فرمایا گیا ہے کہ کوئی ملک اور کوئی مقام ایسا نہیں جہاں ہم نے رسول نہ بھیجا ہو ۔ ایک جگہ

فرمایا گیا ہے:۔

وَلِکُلِّ اُمَّۃٍ رَّسُوْلٌ ۔(یونس ع ۵) یعنی ہر قوم کے واسطے پیغمبر آئے ہیں۔

دوسری جگہ فرمایا گیا:۔

وَاِنْ مِّنْ اُمَّۃٍ اِلَّا خَلَا فِیْھَا نَذِیْرٌ یعنی کوئی قوم ایسی نہیں جس کے پاس ڈرانے والا رسول نہ پہنچا ہو۔ (فاطر ع ۳)

ایک اور جگہ ارشاد فرمایا گیا:۔

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ کُلِّ اُمَّۃٍ رَّسُوْلًا ۔ (نحل ع ۵) یعنی ہم نے ہر قوم میں اپنے پیغمبر بھیجے ہیں۔

ان پیغمبروں میں سے چند خاص پیغمبروں کے نام اور ان کے کچھ احوال بھی قرآن مجید میں بیان فرمائے گئے ہیں اور باقیوں کا کوئی تذکرہ نہیں کیا گیا، لیکن ہمارے لئے یہ فرض ہے کہ ہم ان سب پر ایمان لائیں اور ان سب کو یکساں طور پر اللہ کے راستباز اور پاک باز بندے سمجھیں اور ان سب کا ادب کریں، ان کے بغیر ہم مومن نہیں ہو سکتے۔ قرآن مجید میں ایمان والوں کا اصول اور عقیدہ یہ بیان کیا گیا ہے:۔

لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِہٖ ۔ (بقرہ ع ۴۰)

کہ ہم اللہ کے پیغمبروں میں کوئی تفریق نہیں کرتے، بلکہ سب کو مانتے ہیں۔

ایمان سب نبیوں پر اور پیروی صرف نبی وقت کی

بہرحال مومن ہونے کیلئے سب پیغمبروں پر ایمان لانا ضروری ہے ہاں اطاعت اور پیروی صرف نبی وقت کی کی جاتی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ نبی جو احکام لاتا ہے وہ اس کے اپنے احکام نہیں ہوتے، بلکہ اللہ کے احکام ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کا منشا یہی ہوتا ہے کہ جس زمانہ کے لئے وہ جو احکام بھیجے ان ہی کا اتباع

کیا جائے، نئے احکام آنے کے بعد پہلے احکام منسوخ ہو جاتے ہیں۔

پہلی شریعتوں کی منسوخی کی ایک عام فہم مثال اس کو آپ مثال سے یوں سمجھ سکتے ہیں کہ فرض کیجئے ایک ملک ہے اس کے رہنے والے بہت کمزور اور پست حالت میں ہیں، غربت بھی ہے، جہالت بھی ہے، صحتیں بھی خراب ہیں، تو حکومت ان کے لئے بہت ہلکے قوانین مقرر کرتی ہے اور بہت سی رعایتیں اور سہولتیں دیتی ہے، لیکن جب کچھ عرصہ کے بعد ملک ترقی کر جاتا ہے اور لوگوں کی حالت کچھ اچھی ہو جاتی ہے تو پھر اس حالت کے مطابق نیا قانون بنا دیا جاتا ہے، اب اس نئے قانون کے بعد اگر کوئی انسان اُسی پہلے قانون پر چلے اور نئے قانون کو نہ مانے تو وہ مجرم اور سزا کے قابل ہوگا، کیونکہ وہ حکومت کی نافرمانی کرتا ہے اور حکومت کے امتیازی اختیارات خود استعمال کرنا چاہتا ہے۔

بس انبیاء علیہم السلام کی لائی ہوئی شریعتوں کا حال بھی ایسا ہی سمجھ لیجئے، اللہ تعالیٰ نے کسی قوم اور کسی زمانہ کے لوگوں کی حالت کے مطابق اپنے کسی پیغمبر کے ذریعہ ایک قانون بھیجا، پھر ایک مدت کے بعد جب حالات کچھ بدل گئے اور دوسرے پیغمبر کو بھیجا گیا، تو قانون میں بھی کچھ تبدیلی کر دی گئی، تو اُس وقت بندوں کا فرض ہوگا کہ ایمان تو پہلے پیغمبروں پر بھی لائیں اور احترام سب کے لائے ہوئے قوانین کا کریں (کیونکہ سب اللہ ہی کے قوانین ہیں) لیکن ہر زمانہ میں پابندی اُسی قانون کی کی جائے گی جو اُس وقت کے نبی کے ذریعہ اس زمانہ کے لئے اللہ کی طرف سے آیا ہوا ہوگا، حتیٰ کہ اگر پہلے زمانہ کے کوئی پیغمبر بھی اپنی قبر سے اُٹھ کر بعد والے زمانہ میں آجائیں تو ان کو بھی اسی بعد والے قانون کی اور بعد والی شریعت کی پیروی اور پابندی کرنی پڑے گی، اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔

لَوْ كَانَ مُوْسٰى حَيًّا مَا وَسِعَهٗ اِلَّا اِتِّبَاعِيْ۔ مسند احمد و شعب الایمان بیہقی (مشکوٰۃ)	یعنی اللہ کے جلیل القدر پیغمبر موسیٰ علیہ السلام بھی اگر آج زندہ ہوتے تو ان کو بھی میری ہی شریعت کی پیروی کرنی ہوتی۔

اور یہی وجہ ہے کہ آخر زمانہ میں جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام صحیح حدیثوں کی اطلاع کے مطابق اس دنیا میں دوبارہ تشریف لائیں گے تو ان کا عمل شریعت محمدی ہی پر ہوگا کیونکہ اس زمانہ اور اس دور کے لئے حکم الٰہی یہی ہے اور پہلی شریعتوں اور پہلے الٰہی قوانین کو خود اللہ تعالیٰ نے منسوخ قرار دے دیا ہے اور اب ان پر چلنا گویا اللہ کی نافرمانی ہے۔

بہرحال یہ ایک ایمانی اصول ہے کہ ایمان تو بلا تفریق اللہ کے سب پیغمبروں پر لایا جائے اور سب کا ادب و احترام یکساں طور پر کیا جائے، چاہے وہ کسی قوم اور کسی ملک میں اور کسی زمانہ میں آئے ہوں اور چاہے ان کی زبان کوئی بھی رہی ہو لیکن پیروی ہر زمانہ میں صرف اُس پیغمبر کی شریعت کی جائے جو اُس دَور اور اُس زمانہ کا پیغمبر ہو۔

انبیاءؑ شریعت ساز نہیں بلکہ شریعت رساں ہوتے ہیں اوپر جو کچھ بیان کیا گیا اُس سے ایک بات آپ کو یہ بھی معلوم ہوگئی کہ انبیاء علیہم السلام شریعت ساز نہیں ہوتے ہیں بلکہ شریعت رساں ہوتے ہیں (یعنی ان کا منصب یہ نہیں ہے کہ وہ اپنی طرف سے عقائد یا احکام تجویز کریں، بلکہ وہ اللہ کی طرف سے صرف لانے والے اور پہنچانے والے ہوتے ہیں، اور اپنی جانب سے وہ اس میں کوئی کمی بیشی اور کسی قسم کا تغیر و تبدل بھی نہیں کر سکتے۔

قرآن مجید میں کئی جگہ یہ مضمون ہے کہ کفار کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کبھی کبھی کہتے تھے کہ آپ جو کچھ ہمیں سناتے اور بتلاتے ہیں اس میں سے بعض باتیں ہمیں پسند نہیں اگر آپ ان میں ہمارے حسب منشا کچھ ترمیم و تبدیلی کر دیں، تو ہم بھی آپ کے ساتھ ہو چلیں

گے۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کا جواب دیتے تھے کہ میرا کام تو صرف اللہ کی بات کو جوں کا توں پہنچانا ہے، مجھے کسی ترمیم و تبدیلی کا بالکل اختیار نہیں۔ چنانچہ اس بارہ میں ایک جگہ ارشاد ہے:۔

"قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآءِ نَفْسِيْ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ۔ (یونس ع ۲)	یعنی میں اپنی طرف سے ذرا بھی رد و بدل نہیں کر سکتا، اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو کچھ مجھے وحی کی جاتی ہے اور جو کچھ حکم بھیجا جاتا ہے میں تو بالکل اسی کی پیروی کرتا ہوں۔

ایک دوسرے موقع پر قرآن مجید میں فرمایا گیا:۔

"وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى" (النجم۔ ع ۔ ۱)	یعنی ہمارے یہ رسول دین کی جو تعلیم دیتے ہیں تو یہ ان کے اپنے جی کی باتیں نہیں ہیں، بلکہ یہ وحی ہے جو ہماری طرف سے ان کی طرف بھیجی جاتی ہے[۱]۔

---

[۱] بعض لوگوں کی گفتگوؤں سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اس آیت کا مطلب شاید یہ سمجھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ کلام فرماتے تھے وہ سب وحی ہوتا تھا اور وحی کے سوا آپ کوئی لفظ بولتے ہی نہ تھے۔ یہ باننا اسطرح صحیح نہیں ہے۔ بلکہ آیت کا مطلب صرف یہ ہے کہ آپ پیغمبرانہ حیثیت سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو کلام فرماتے ہیں اور جو احکام پہنچاتے ہیں وہ سب وحی ہے، اس میں ایک بات بھی ایسی نہیں ہوتی جو آپ اپنی طرف سے اور اپنی طبیعت سے فرماتے ہوں، الغرض اس آیت کا تعلق انہی باتوں سے ہے جو آپ اللہ تعالیٰ کے حکم اور پیغام کی حیثیت سے پہنچاتے تھے، ورنہ اپنے اہل خانہ سے اور اپنے خدام اور اصحاب کرامؓ سے آپ جو بھی گفتگوئیں فرماتے تھے، ظاہر بات ہے کہ وہ وحی الٰہی نہیں ہوتی تھی۔

الغرض انبیاء علیہم السلام کے متعلق یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ جو احکام وہ لاتے ہیں وہ ان کے اپنے تجربہ کئے ہوئے احکام نہیں ہوتے بلکہ اللہ کے احکام ہوتے ہیں اور وہ ان کے صرف لانے والے اور پہنچانے والے ہوتے ہیں۔

انبیاءؑ کے اجتہاد کی حیثیت ہاں کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کوئی معاملہ پیش آگیا اور اس بارے میں وحی کے ذریعہ کوئی واضح حکم ان کے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں آیا ہوا ہے تو اس صورت میں اجتہاد بھی کرتے ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو احکام ان کے پاس پہلے آ چکے ہیں اور جو علم پہلے مل چکا ہے وہ اس کی روشنی میں غور و خوض کر کے اس معاملہ کا حکم بیان فرماتے ہیں۔ ایسا نہیں ہوتا کہ وہ اپنی طبیعت سے اور اپنی ذاتی رائے سے جو چاہیں فیصلہ فرما دیں اور حکم دے دیں، بلکہ پہلے آئے ہوئے اللہ کے احکام ہی سے جو کچھ ان کی سمجھ میں آتا ہے اسی کو وہ شریعت کے حکم کی حیثیت سے بیان فرما دیتے ہیں اور انبیاء علیہم السلام کے ایسے اجتہادات عموماً صحیح ہی ہوتے ہیں اور اگر کبھی لغزش ہوتی ہے تو فوراً وحی کے ذریعہ ان کو اطلاع دے دی جاتی اور اس کی تصحیح کر دی جاتی ہے اور جب وحی کے ذریعہ کوئی تصحیح نہ کی جائے تو یہ متعین ہو جاتا ہے کہ حکم الٰہی وہی ہے جو نبی نے اپنے اجتہاد سے سمجھا اور پھر وہ مسئلہ اجتہادی نہیں رہتا، بلکہ "حکم بالوحی" ہو جاتا ہے یعنی اس کا درجہ وہی ہو جاتا ہے جو وحی کے ذریعہ آنے والے احکام کا ہوتا ہے۔

آئمۂ مجتہدین کا اجتہاد جب اجتہاد کا ذکر آگیا ہے تو یہیں آئمہ کے اجتہاد کی نوعیت اور حیثیت کو بھی سمجھ لیا جائے۔

کچھ مسائل تو وہ ہیں جو قرآن مجید میں یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت میں قطعی طور سے بیان کر دیئے گئے ہیں، ان کے بارہ میں تو اجتہاد کا کوئی سوال پیدا ہی نہیں ہوتا لیکن

ان کے علاوہ بہت سے ایسے حوادث اور واقعات پیش آتے ہیں جن کا حکم قرآن پاک میں بالاحادیث نبوی میں نہیں ملتا، تو ان کے بارے میں مجتہدین کو اجتہاد سے کام لینا پڑتا ہے یعنی ان حضرات نے قرآن وحدیث سے تشریع اور قانون سازی کے جو اصول اور اساس کی جو بنیادیں سمجھی ہیں وہ ان سے ان حوادث اور واقعات کا حکم نکالتے ہیں۔ حدیثوں میں آتا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو یمن کا قاضی اور والی بناکر بھیجا تو اُن سے دریافت کیا کہ:۔

"تمہارے سامنے جو مقدمات اور مسائل آئیں گے اُن کا فیصلہ تم کس طرح کیا کروگے؟"

انہوں نے عرض کیا کہ:۔

"پہلے تو میں کتاب اللہ کی طرف اور اس کے بعد آپ کی سنّت کی طرف یعنی آپ کے طرزِ عمل اور آپ کے ارشادات اور فیصلوں کی طرف رجوع کروں گا اور اگر دونوں جگہ سے مجھے اُس معاملہ کا حکم نہیں ملے گا تو پھر میں اجتہاد کروں گا"[1]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُن کے اس جواب سے بہت خوش ہوئے اور ان کو شاباش دی اور اللہ کی حمد کی اور اُس کا شکر ادا کیا۔ یہ حدیث گویا مجتہدین کے اجتہاد کی بنیاد ہے۔

امت کے مجتہدین جن صحابۂ کرام کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و تربیت میں فقاہت کا مقام حاصل ہوگیا تھا وہ سب حسبِ ضرورت اجتہاد فرماتے تھے، پھر پہلی صدی ہجری کے آخر میں اور دوسری صدی میں اور اس کے بعد بھی ایسی بہت سی شخصیتیں پیدا ہوئیں جنہوں

---

[1] ترمذی و ابوداؤد (مشکوٰۃ)

نے اپنی زندگی کا سرمایہ اس کام پر لگا دیا اور انہوں نے دین کی یہی خاص خدمت کی کہ قرآن و حدیث میں اور فقہاء صحابہ کے طرز عمل میں غور کر کے تشریح کے اصول نکالے اور پھر ان کی روشنی میں ان مسائل کا حکم دریافت کرنے کی کوشش کی جن کا قرآن و حدیث میں واضح بیان ہم کو نہیں ملتا اور اس طرح شریعت اسلامی کا فقہ مرتب اور مدون ہوا۔ دین کی یہ خدمت اور کوشش بہت سے مجتہدین نے کی تھی، لیکن ان میں سے آئمہ اربعہ کا فقہ غالباً زیادہ مرتب اور جامع ہونے کی وجہ سے زیادہ مقبول ہوا۔

اجتہاد کا حق کس کو ہے؟ اجتہاد کے سلسلہ میں ایک یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ یہ ہر ایک کا کام نہیں ہے، جن بزرگوں نے یہ کام کیا، ان کا کتاب و سنت کا علم نہایت ہی وسیع تھا، انہوں نے ان لوگوں کو دیکھا تھا، بلکہ ان ہی سے علم دین حاصل کیا تھا، جنہوں نے دینی تعلیم و تربیت براہ راست صحابہ کرامؓ سے یا اُن کے خاص شاگردوں سے حاصل کی تھی، پھر اس مستند اور وسیع علم اور اس تعلیم و تربیت کے علاوہ ان میں تعلق باللہ اور تقویٰ اعلیٰ درجہ کا تھا، دراصل یہ کام انہیں کا تھا جن سے اللہ تعالیٰ نے اس کو لیا۔

نئی روشنی کے بے علم مجتہد لیکن آج اجتہاد کو ایسی معمولی بات سمجھ لیا گیا ہے کہ بعض لوگ دین سے متعلق اردو کے چند رسالے پڑھ کر یا زیادہ سے زیادہ قرآن و حدیث کے چھپے ہوئے ترجمے دیکھ کر اپنے کو اجتہاد کا حق دار سمجھنے لگتے ہیں اور مسائل میں بالکل مجتہدانہ انداز میں رائے زنی کرتے ہیں، ایسے ہی لوگوں کے بارے میں حدیث شریف میں آیا ہے کہ:۔

"ضَلُّوْا وَاَضَلُّوْا۔" وہ خود بھی گمراہ ہیں اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں۔

(صحیح بخاری و صحیح مسلم، مشکوٰۃ)

اجتہاد اور مجتہدین کا یہ ذکر تو انبیاء علیہم السلام کے اجتہاد کے تذکرہ کے ساتھ جملہ معترضہ

کے طور پر یہاں آگیا، ورنہ اس وقت موضوع بحث تو نبوت و رسالت ہے اور اسی سے متعلق کچھ ضروری باتیں ابھی مجھے اور عرض کرنی ہیں۔

نبوت وہبی ہے، کسبی نہیں نبوت کے متعلق ایک بات یہ بھی سمجھنے اور جاننے کی ہے کہ وہ وہبی ہے کسبی نہیں، اس کو آپ یوں سمجھئے کہ اس دنیا میں کچھ چیزیں تو ایسی ہیں جن کو کسب اور کوشش سے حاصل کیا جاتا ہے (یعنی اگرچہ وہ ملتی تو ہیں اللہ تعالیٰ ہی کے حکم اور اس کی عطا سے، لیکن ان کے حاصل ہونے میں انسان کی سعی اور کوشش کو بھی کچھ دخل ہوتا ہے) مثلاً کوئی خاص علم اور فن حاصل کرنا، یا کھیتی کے ذریعہ غلہ حاصل کرنا، یا صنعت و تجارت کے ذریعہ دولت حاصل کرنا، تو ایسی تمام چیزوں کو کسبی کہا جاتا ہے اور کچھ چیزیں وہ ہیں جو محض اللہ کی عطا سے حاصل ہوتی ہیں اور کسی کی کوشش اور جد و جہد کو ان کے حاصل کرنے میں کوئی دخل نہیں ہوتا، جیسا کہ مثلاً پیدائشی خوبصورتی، فطری ذہانت و دانشمندی تو اس قسم کی چیزوں کو وہبی کہا جاتا ہے اور نبوت اسی قسم کی چیز ہے، یعنی وہ سعی اور کوشش سے حاصل نہیں کی جاتی، بلکہ وہ محض اللہ تعالیٰ کی عطا سے کسی کو ملتی ہے۔

معجزات نبوت کے سلسلہ میں معجزات کو بھی سمجھ لینا چاہیئے، کبھی کبھی انبیاء علیہم السلام کے ہاتھوں پر ایسے غیر معمولی واقعات ظاہر ہوتے ہیں جو ان کی اپنی حیثیت اور طاقت سے بالاتر ہوتے ہیں، یعنی ان جیسا دوسرا انسان ان کو کر کے نہیں دکھا سکتا، ایسے واقعات کو معجزات کہتے ہیں۔

معجزہ نبی کا نہیں، بلکہ اللہ کا فعل ہوتا ہے اور یہ معجزات اس نبی کا ذاتی فعل نہیں ہوتے بلکہ درحقیقت اللہ کا فعل ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کے ذریعہ سے اپنے اس پیغمبر کی سچائی ظاہر فرماتا ہے ہماری عقائد کی کتابوں میں معجزہ کی تعریف عام طور سے یہی کی گئی ہے

کہ معجزہ اللہ تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے جو اُس کے بھیجے ہوئے نبی کی سچائی اور صداقت ظاہر کرنے کے لئے اُس نبی کے ہاتھ پر ظاہر ہوتا ہے۔ بہرحال معجزہ کا وجود اور ظہور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے اور وہ براہِ راست اُسی کا فعل ہوتا ہے اور نبی صرف اُسکے مظہر ہوتے ہیں۔

معجزہ بھی انسانوں کی ضرورت ہے انسانوں میں بعض طبیعتیں ایسی غبی اور اس درجہ کم فہم ہوتی ہیں جو کسی پیغمبر کی پیغمبری کی جب ہی قائل ہوتی ہیں جب اُس کے ہاتھوں پر بعض ایسے غیر معمولی واقعات ظاہر ہوں، تو اللہ تعالیٰ ایسے غبیوں کے لئے اپنے نبیوں کو معجزات بھی دیتے ہیں اور جو لوگ ذکی اور سلیم الفطرت ہوتے ہیں ان کو پیغمبر کی زندگی اور اس کا پیغام ہی معجزہ ہوتا ہے، اکابر صحابہ میں غالباً ایک بھی ایسے نہیں ہیں جن کو ایمان لانے کیلئے معجزہ دیکھنے کی ضرورت ہوئی ہو۔ بہرحال معجزہ پیغمبر کو یا پیغمبری کی ضرورت نہیں ہے بلکہ غبی انسانوں کی ضرورت ہے، اسی لئے یہ ممکن ہے کہ کسی پیغمبر کے ہاتھ پر کوئی بھی معجزہ ظاہر نہ ہو اور اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ اللہ کے ایک رسول جن کا درجہ بڑا اور بلند ہو اُن کو معجزے کم دیئے جائیں اور جن کا درجہ اتنا بلند نہ ہو ان کی قوم میں غبیوں اور ہٹ دھرموں کی کثرت کی وجہ سے معجزے زیادہ دے دیئے جائیں۔ الغرض معجزہ نہ تو نبی کا فعل ہے نہ نبوت کی شرط ہے اور نہ فضیلت کا معیار ہے، بلکہ جیسا کہ عرض کیا گیا وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبیوں کی سچائی کی شہادت اور نشانی کے طور پر حسب ضرورت ظاہر کیا جاتا ہے اور جب اللہ چاہتا ہے جب ہی ظاہر ہوتا ہے۔ اسی سے آپ نے سمجھ لیا ہوگا کہ معجزہ دکھانا نبی کے اپنے اختیار میں بھی نہیں ہے کہ نبی جب چاہے معجزہ دکھادے بلکہ وہ صرف اللہ ہی کے قبضہ میں ہے۔

قرآن مجید کا بیان کہ معجزے اللہ ہی کے اختیار میں ہیں قرآن مجید میں اس کا جا بجا ذکر ہے کہ مکہ کے شریر اور معاند کافر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہتے تھے کہ اگر آپ سچے نبی ہیں تو فلاں

معجزہ دکھایئے، فلاں معجزہ دکھلایئے! اس کے جواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے حکم سے یہی فرماتے تھے کہ معجزے دکھانا میرے اختیار میں نہیں ہے، نہ میں اس کا دعویٰ کرتا ہوں، میرا کام تو صرف اللہ کا پیغام پہنچانا ہے۔

سورۂ بنی اسرائیل میں تفصیل سے بیان فرمادیا گیا ہے کہ کافروں نے آپ سے کیا کیا معجزے دکھلانے کی فرمائش کی اور آخر میں آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ہے:۔

"قُلْ سُبْحَانَ رَبِّیْ هَلْ كُنْتُ إِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا"

(بنی اسرائیل۔ ع۔ ۱۰)

آپ ان جاہلوں سے کہہ دیجئے کہ میں تو بس اللہ کا پیغام پہنچانے والا ایک انسان ہوں ہاں میرے بھیجنے والے پروردگار کے قبضہ میں سب کچھ ہے اور وہ ہر نقص اور کمزوری سے پاک ہے۔

مطلب یہ ہے کہ میں نے کب دعویٰ کیا ہے کہ ایسے معجزے دکھانا بھی میرے قبضہ میں ہے جو تم مجھ سے ایسی لغو فرمائشیں کرتے ہو۔ اسی طرح ایک دوسرے موقع پر آپ کو حکم دیا گیا۔

"قُلْ إِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ"

(عنکبوت ع ۵)

یعنی آپ ان جاہلوں سے کہہ دیجئے کہ جو نشانیاں اور معجزے تم چاہتے ہو وہ اللہ ہی کے پاس اور اُسی کے قبضہ میں ہیں، وہ جب چاہے دکھائے یا نہ دکھلائے۔

مطلب یہ کہ یہ چیزیں میرے اختیار سے باہر ہیں، اسلئے تمہارا مجھ سے یہ فرمائشیں کرنا غلط ہے۔

معجزہ ہی کے ساتھ کرامت اور استدراج کو سمجھ لینا چاہیئے:۔

کرامت جس طرح اللہ تعالیٰ اپنے نبی کی سچائی ظاہر کرنے کے لئے اس کے ہاتھ پر ایسے غیر معمولی اور خارقِ عادت واقعات ظاہر کرتا ہے جو اُس جیسے دوسرے انسانوں سے نہیں ہو سکتے اور ان کے ظہور سے غبی سے غبی انسان بھی یہ سمجھ سکتا ہے کہ در حقیقت یہ اللہ کا نبی ہے اور اللہ کی تائید اس کے ساتھ ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ اپنے کسی سچے نبی کے بعض نیک اور مقبول اُمتیوں کے ہاتھ پر بھی کبھی کبھی ان کی مقبولیت کی نشانی کے طور پر ایسے خارقِ عادت واقعات ظاہر فرمادیتا ہے، بس ان ہی واقعات کو کرامت کہتے ہیں اور جس طرح معجزہ نبی کا ذاتی اور اختیاری فعل نہیں ہوتا بلکہ اللہ کا فعل ہوتا ہے، اسی طرح کرامت بھی ولی کا فعل نہیں ہوتا بلکہ اللہ کا فعل ہوتا ہے اور اللہ ہی کے ارادہ اور اختیار سے اس کے مقبول بندہ کے ہاتھ پر ظاہر ہوتا ہے اور وہ صرف اُس کا مظہر ہوتا ہے۔ عقائد اور تصوف کی کتابوں میں کرامت کی تعریف ہی یہ کی جاتی ہے، کہ:۔

" هُوَ فِعْلُ اللّٰهِ تَعَالٰی خَارِقٌ لِّلْعَادَةِ يَظْهَرُ عَلٰى يَدِ عَبْدٍ ظَاهِرٍ صَلَاحُهٗ وَتَقْوَاهُ "

جس کا مطلب یہ ہوا کہ کرامت اللہ کا وہ غیر معمولی اور خارقِ عادت فعل ہے جو اُس کے کسی ایسے بندہ کے ہاتھ پر ظاہر ہو جس کی زندگی بالکل علانیہ طور پر صلاح و تقوے کی زندگی ہو۔

ولی کون ہوتا ہے؟ اسلامی شریعت اور قرآن و حدیث کی اصطلاح میں ایسے ہی شخص کو ولی کہا جاتا ہے اور اس کے ہاتھ پر جو غیر معمولی واقعات ظاہر ہوں بس ان کو کرامت کہا جاتا ہے، بغیر صلاح و تقویٰ اور بغیر اتباعِ شریعت کے ولایت اور کرامت کا کوئی امکان نہیں ہے، قرآن مجید میں صاف ارشاد ہے:۔

"أَلَآ إِنَّ أَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ — اللہ کے ولیوں کو نہ خوف ہوگا، نہ غم وہ وہی

عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ٥
اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ٥
(یونس - ع - ۷)

وہ لوگ ہیں جو صاحبِ ایمان اور صاحبِ تقویٰ ہیں یعنی پیغمبرِ وقت پر جو ایمان لائے ہوئے ہیں اور اللہ سے ڈرتے اور اُسکی شریعت پر چلتے ہیں۔

تو ایسے بندگانِ اللہ کے ہاتھ پر اگر کوئی غیر معمولی اور خارقِ عادت چیز ظاہر ہو تو وہ کرامت کہلاتی ہے اور وہ ان کی ولایت اور مقبولیت کی نشانی ہوتی ہے۔

استدراج اور جن لوگوں کی زندگی میں تقویٰ اور اتباعِ شریعت علانیہ طور سے نہ ہو اور اس کے باوجود اُن سے ایسی چیزیں ظاہر ہوں تو اگر وہ جادو اور شعبدے کے قسم کی کوئی فنی چیز اور کوئی کرتب نہیں ہے تو پھر بندوں کے ابتلاء اور امتحان کے لئے اللہ تعالیٰ کیطرف سے استدراج ہے جیسا کہ حدیثوں میں دجّال کے متعلق آتا ہے کہ وہ اپنے حکم سے بارش برسا کے اور مردے زندہ کر کے دکھلائے گا۔ تصوف کی کتابوں میں حضرت بایزید بسطامیؒ سے نقل کیا گیا ہے آپ فرماتے تھے۔

"لو نظرتم إلى رجل اعطى من الكرامات حتّٰى يرتقى فى الهواء فلا تغتروا به حتّٰى تنظروه كيف تجدونه عند الامر و النهى وحفظ الحدود واداء الشريعة"

(فتوحاتِ مکیہ (تعلیم الدین)

اگر تم کسی شخص کو دیکھو کہ اُسکے ہاتھ پر کرامتیں یعنی خارقِ عادات امور ظاہر ہوتے ہیں یہاں تک کہ وہ ہوا میں اُڑتا ہے تو دھوکہ نہ کھانا (اور صرف ان باتوں کو دیکھ کر اس کو ولی اور اللہ کا مقبول بندہ نہ سمجھ لینا) جب تک یہ نہ دیکھ لو کہ اللہ کے احکام اوامر و نواہی اور اللہ کے مقرر کئے ہوئے حدود کے بارے میں اس کا طرزِ عمل کیا ہے اور شریعت پر ٹھیک

ٹھیک ٹھیک چلتا ہے یا نہیں!

کرامت ولایت کی شرط نہیں ہے کرامت کے متعلق ایک بات یہ بھی یاد رکھنی چاہیئے کہ ہر ولی سے کرامات کا ظہور بالکل ضروری نہیں، بلکہ اکثر اولیاء اللہ وہی ہوتے ہیں جن سے مدت العمر میں کوئی کرامت بھی ظاہر نہیں ہوتی، بلکہ ہو سکتا ہے کہ ایسا ولی جس سے کوئی کرامت ظاہر نہ ہوئی ہو درجہ میں اس دوسرے ولی سے بڑا ہو جس سے بہت سی کرامتیں ظاہر ہوئی ہوں، فضیلت کا معیار بس تقویٰ ہے۔ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقَاکُمْ۔

اولیاء اللہ سے عناد کا نتیجہ اللہ سے دشمنی ہے اسی جگہ ایک بات یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ کسی ولی کو ولی ماننا شرطِ ایمان تو نہیں ہے لیکن جو واقعی اولیاء اللہ ہیں خواہ وہ اس دنیا سے جاچکے ہوں یا موجود ہوں، اُن سے عداوت اور بغض و عناد رکھنا سخت محرومی اور بڑا وبال ہے، صحیح حدیث قدسی ہے:-

"مَنْ عَادٰی لِیْ وَلِیًّا فَقَدْ اٰذَنْتُهٗ بِالْحَرْبِ" (صحیح بخاری)

یعنی اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے، جس نے میرے کسی ولی سے دشمنی کی، تو میری طرف سے اس کو اعلانِ جنگ ہے۔ اسلئے اولیاء اللہ کے ساتھ ہمارا رویہ ہمیشہ ادب اور عظمت کا ہونا چاہیئے، ہاں اسکی گنجائش ہے کہ ادب اور عظمت کے باوجود کسی خاص معاملہ میں ہمیں ان کی رائے سے اختلاف ہو کیونکہ وہ پیغمبروں کی طرح معصوم اور واجب الاطاعت نہیں ہیں۔

یہاں ولایت و کرامت کا یہ تذکرہ تو ضمناً آگیا تھا، ورنہ بیان معجزہ کا ہو رہا تھا معجزہ کی حقیقت اور نوعیت تو آپ سمجھ چکے، اب آگے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات کے متعلق کچھ عرض کرنا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات تاریخ اور سیرت کی روایات کے علاوہ صحیح احادیث میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت سے روشن معجزات کا ذکر ہے اور وہ چیزیں اتنی مشہور ہیں کہ آپ سب حضرات ان کو یقیناً جانتے ہوں گے، اسلئے یہاں میں اُن کے ذکر کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا، وہ سب اب تاریخی باتیں ہیں اور اس وقت کی دنیا کے سامنے نہیں ہیں۔ یہاں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صرف اس زندۂ جاوید معجزے کے متعلق کچھ عرض کرتا ہوں جو اس وقت بھی اپنی اُسی اعجازی شان کے ساتھ زندہ ہے اور حضور کی نبوت کی دلیل دے رہا ہے جس شان کے ساتھ وہ اب سے قریباً چودہ سو برس پہلے ظاہر ہوا تھا یعنی "قرآن مجید"۔

قرآن مجید بحیثیتِ معجزہ اگرچہ اتنی بات اجمالی طور پر ہر مسلمان جانتا ہے اور اس پر عقیدہ رکھتا ہے کہ قرآن شریف حضورؐ کا معجزہ ہے، لیکن میں اس وقت آپ کے سامنے اس کی کچھ تفصیل کرنا چاہتا ہوں۔

اعجاز قرآن کے چند عام فہم پہلو قرآن پاک بہت سے پہلوؤں سے معجزہ ہے، لیکن میں اس وقت صرف اُن پہلوؤں کو بیان کرنا چاہتا ہوں جن کو ہر شخص سمجھ سکتا ہے اور جن پر غور کر کے ہر منصف مزاج آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کا یقین آج بھی حاصل کر سکتا ہے۔

قرآن پاک کی معجزانہ محفوظیت میں سب سے پہلے قرآن مجید کی محفوظیت کو لیتا ہوں، یہ ایک کُھلی ہوئی حقیقت ہے کہ قرآن مجید کے زیادہ تر مضامین وہ ہیں جن سے اُس دور کے اہل عرب ناواقف اور نامانوس تھے، پھر اس کی زبان اگرچہ عربی ہے، لیکن ان کی عام بول چال والی عربی اور ان کی شاعری اور خطابت کی زبان سے بھی بہت زیادہ ممتاز اور نرالی ہے، یہاں

تک کہ جاننے والے اس حقیقت کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ حدیث کی یعنی خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان اور طرز بیان میں بھی بہت بڑا فرق ہے، ان وجوہ سے قرآن مجید کا حفظ کرنا اہل عرب کیلئے بھی زیادہ آسان نہ تھا، پھر قرآن لکھے ہوئے صحیفہ کی شکل میں نازل نہیں ہوا، بلکہ تھوڑا تھوڑا کرکے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلبِ مبارک پر نازل کیا گیا، پھر چونکہ عرب میں اس وقت نوشت وخواند کا عام رواج نہ تھا، اس لئے ایسا بھی نہیں ہوا کہ اس کے متعدد نسخے ساتھ ساتھ تیار ہوتے رہتے ہوں انتہا یہ ہے کہ خود حضورؐ لکھنا پڑھنا بالکل نہیں جانتے تھے، اسلئے آپ نے کبھی قرآن مجید کی ایک آیت بھی قلمبند نہیں کی اور اگر کبھی کسی دوسرے نے کوئی آیت یا سورت لکھی، تو آپ خود اُس کو ملاحظہ فرماکر اسکی تصحیح نہیں فرما سکتے تھے، پھر وہ دو چار ورق کا کوئی چھوٹا سا صحیفہ نہیں بلکہ اچھی خاصی ضخیم کتاب ہے ان سب تاریخی حقیقتوں کو سامنے رکھ کر سوچا جائے کہ جس کتاب کی یہ تاریخ اور یہ سرگزشت ہو اُس کا چودہ سو برس تک اس طرح محفوظ رہنا کہ مشرق ومغرب، عرب وعجم، یورپ وایشیا، افریقہ وامریکہ، ہر جگہ کے مسلمانوں کے پاس ایک ہی قرآن ہے، جس میں اوّل سے آخر تک ایک آیت بلکہ ایک حرف کا بھی فرق نہیں ہے تو انصاف پسندوں کے لئے سوچنے کی بات ہے کہ کیا یہ اس بات کی روشن دلیل نہیں ہے کہ قرآن اللہ تعالیٰ کی نازل کی ہوئی کتاب ہے اور صرف اللہ کی قدرت نے اس کو اسطرح محفوظ رکھا ورنہ اس عالم میں جو ہر قسم کے انقلابات اور تغیرات کی آماجگاہ رہا ہے اس کو اس طرح محفوظ نہ رہنا چاہیئے تھا اسی طرح قرآن مجید کے سوا کسی اور کتاب کا کوئی نام نہیں بتا سکتا جس کی ایسی تاریخ اور سرگزشت ہو، اور پھر وہ ایسی محفوظ ہو۔

اس کی معجزانہ علمی شان قرآن مجید کے اعجاز کا دوسرا پہلو اس کی معجزانہ علمی شان ہے

آپ اس پر یوں غور کیجئے کہ قرآن پاک کو اللہ کی کتاب بتلاتے ہوئے ایک ایسے شخص نے دنیا کے سامنے پیش کیا جو زندگی کے کسی ایک دن بھی کسی مدرسہ کا طالبعلم نہیں رہا، بلکہ ایک ایسی بستی میں پیدا ہوا جس میں کوئی مدرسہ اور مکتب نہ تھا، نہ علمی چرچے تھے نہ علمی صحبتیں تھیں، نہ تحصیل علم کے لئے وہ کہیں باہر گیا، وہ اپنی عمر کے چالیسویں سال تک علوم و معارف سے اسی طرح بیگانہ، اپنی سادہ فطرت پر ایک نہایت شریف اور سچا انسان تھا، عمر کے چالیس سال پورے ہونے پر اچانک اُس کی زندگی اور اس کے طرز عمل میں ایک غیر معمولی تبدیلی ہوئی اور اس نے بتایا کہ اللہ نے اس کو نبوت سے سرفراز کیا ہے اور اس پر وحی آتی ہے، اب اس نے اپنی بستی والوں کو قرآن مجید سنانا شروع کیا اور کہا کہ یہ میرا نہیں بلکہ اللہ کا کلام ہے، اور یہی کلام قرآن مجید کے نام سے ہمارے سامنے موجود ہے یہ ایک حقیقت ہے کہ اس میں اللہ کی توحید اور ذات و صفات کے متعلق جو کچھ دنیا کو بتایا گیا ہے وہ بلاشبہ علم و معرفت کا آخری نقطہ ہے اور اس بارے میں ہم پوری علمی دنیا کو چیلنج کر سکتے ہیں، پھر اس میں مشکل مسائل کو مثلاً آخرت اور حشر نشر کو جس طرح سمجھایا گیا ہے وہ تفہیم و استدلال کا عجیب و غریب نمونہ ہے، اسی طرح اس میں جو اخلاقی نصیحتیں ہیں کسی بڑے سے بڑے حکیم اور معلم اخلاق کی نصیحتیں اس سے بہتر بلکہ اس درجہ کی بھی نہیں دکھلائی جا سکتیں، پھر اس میں جو قانون ہے انسانوں کے لئے اس سے بہتر قانون نہ آج تک وضع ہوا ہے نہ وضع ہو سکتا ہے، ہم اس مسئلہ پر بھی دنیا کو چیلنج کر سکتے ہیں کہ انسانوں کی فطرت کیلئے کوئی قانون بھی قرآن کے پیش کردہ قانون سے بہتر وضع نہیں کیا جا سکتا۔

اسی طرح عبادات کا جو نظام قرآن مجید میں انسانوں کے لئے پیش کیا گیا ہے اگر دنیا بھر کے سوچنے والے بھی سوچیں تو ہرگز اس سے بہتر نہیں سوچ سکتے، اصرف نمازہی پر غور

کیا جائے اور اس کی ترتیب اور اس کے اذکار میں آنکھ اور تدبر کیا جائے تو عقل دنگ رہ جاتی ہے اور اس میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں رہتی کہ یہ نسخۂ کیمیا ہرگز کسی اُمّی انسان کا تصنیف کیا ہوا نہیں ہو سکتا۔ بہرحال قرآن مجید کے اعجاز کا یہ ایک عام فہم پہلو ہے کہ اس میں جو علوم ومعارف اور جو نصائح اور قوانین ہیں اور انسانی زندگی کے مختلف شعبوں کے متعلق جو تعلیمات اور ہدایات ہیں اُن کو ہرگز عرب کے ایک ایسے اُمّی کی داغی محنت اور سوچ و فکر کا نتیجہ نہیں کہا جا سکتا جس نے نہ کبھی کوئی کتاب پڑھی نہ کسی لکھے پڑھے آدمی کی کبھی اُسے صحبت ملی۔ ایک ایسے سادہ فطرت اُمّی کے ہاتھوں سے قرآن پاک جیسے علمی شاہکار کا مناطلی دنیا کی نگاہ میں مُردوں کو جلانے اور اندھوں کو سوانکھا کرنے سے بھی بڑا معجزہ ہے اور آپ کو یہ زندۂ جاوید علمی معجزہ اسی لئے دیا گیا کہ آپ کا دور علمی روشنی کا دور ہے، پہلی دنیا عجیب باتوں اور محیرالعقول کرشموں سے زیادہ متاثر ہونے والی تھی اور ہماری یہ دنیا بخاص طور سے ہمارا یہ دور علوم وفنون کا دور ہے اور اس زمانہ میں علوم کی قیمت اور قدر علمی کرشموں سے بہت زیادہ بڑھی ہوئی ہے۔

قرآن پاک کی معجزانہ فصاحت وبلاغت قرآن پاک کے اعجاز کا ایک مشہور عام پہلو یہ بھی ہے کہ فصاحت اور بلاغت میں وہ آپ ہی اپنی نظیر ہے اور اُس جیسا فصیح وبلیغ کلام پیش کرنے سے دنیا ہمیشہ عاجز رہی ہے اور عاجز رہے گی۔ یہ بات صرف خوش عقیدگی کی نہیں ہے، بلکہ یہ بالکل کھلی حقیقت ہے، عربی زبان وادب کے بےشمار قدیم و جدید نمونے دنیا میں موجود ہیں، مصنفوں کی تصنیفیں ہیں، خطیبوں کے خطبے ہیں شاعروں کے قصیدے اور ان کے دیوان ہیں اسی طرح فنداق پر تاریخ وسیر پر قانون پر [illegible] سے موضوعات پر مختلف زمانوں کی لکھی ہوئی عربی کتابیں کتب خانوں میں بھری پڑی ہیں، خود

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چھوٹے بڑے ہزاروں ارشادات اور آپ کے ممتاز صحابہ کرام کے خطبات اور ملفوظات احادیث و آثار کی کتابوں میں محفوظ ہیں۔ قرآن مجید کی چھوٹی سے چھوٹی سورت کو ان سب نمونوں کے ساتھ رکھ کر دیکھا جائے، ہر عربی داں کو بالکل بدیہی طور پر یہ محسوس ہوگا کہ قرآن کا اسلوبِ بیان ان سب سے الگ، سب سے ممتاز اور سب سے بالاتر ہے۔

میں آپ کے سامنے اسی زمانے کے ایک واقعہ کا ذکر کرتا ہوں، اسی سے انشاء اللہ آپ حضرات بھی قرآن مجید کے اس اعجازی پہلو کو کسی حد تک سمجھ سکیں گے۔ شاید آپ نے علامہ طنطاوی جوہری کا نام سنا ہو، یہ ہمارے اسی زمانہ کے ایک مصری عالم ہیں، "جواہر القرآن" کے نام سے ان کی ایک تفسیر بھی چند برس ہوئے مصر سے شائع ہوئی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جدید مغربی علوم خصوصاً سائنس اور فلسفہ پر ان کی بڑی نظر ہے اور طبیعات کے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ بڑے ہی ماہر ہیں، انہوں نے خود اپنا یہ واقعہ لکھا ہے کہ میں جرمنی میں تھا ایک دن وہاں کے چند مستشرق دوستوں کے ساتھ (یعنی عربی زبان اور عربی علوم سے دلچسپی رکھنے والے چند جرمنی فضلاء کے ساتھ) بیٹھا ہوا تھا ان میں سے ایک ممتاز فاضل نے مجھ سے پوچھا کہ کیا آپ بھی عام مسلمانوں کی طرح قرآن کے بارے میں یہ خیال رکھتے ہیں کہ وہ عربیت اور فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے بھی معجزہ ہے؟ میں نے کہا ہاں میں اس پر یقین رکھتا ہوں، اُس نے بڑی حیرت کا اظہار کیا اور کہا میں نہیں سمجھتا تھا کہ تم جیسا صاحبِ علم اور روشن خیال آدمی بھی ایسا عامیانہ خیال رکھتا ہوگا۔ میں نے کہا، اس میں تعجب کی کیا بات ہے یہ تو ایک علمی مسئلہ ہے اور ابھی اس کا امتحان ہو سکتا ہے، میں ایک بات کہتا ہوں، آپ سب حضرات خوب غور و فکر کرکے

اس کو فصیح وبلیغ عربی میں ادا کریں۔ لیجئے وہ بات یہ ہے کہ جہنم بے حد بسیع ہے" ان سب نے دیر تک غور وفکر کرکے چند جملے بنائے۔

" اِنَّ جَهَنَّمَ لَوَسِيْعَةٌ " ۔ " اِنَّ جَهَنَّمَ لَفَسِيْحَةٌ "

اوراس سے ملتے جلتے چنداور جملے۔ اورمیرے سامنے رکھ دیئے۔ میں نے کہا کہ اور محنت کر لیجئے اور جتنا جی چاہے وقت لے لیجئے، لیکن انہوں نے کہا کہ ہم اپنی محنت اور غور وفکر ختم کرچکے۔ اس کے بعد میں نے کہا کہ اب ذرا دیکھئے کہ قرآن مجید نے اسی مضمون کو کس طرح ادا کیا ہے۔ ارشاد ہے:۔

"يَوْمَ نَقُوْلُ لِجَهَنَّمَ هَلِ امْتَلَأْتِ وَتَقُوْلُ هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ ٥" — اوراس دن جبکہ ہم جہنم سے کہیں گے کہ کیا تو بھرگئی؟ اور وہ کہے گی کیا اور کچھ بھی ہے؟

علامہ طنطاوی لکھتے ہیں کہ جیسے ہی میں نے سورۂ قٓ کی یہ آیت پڑھی، چونکہ وہ عربی داں اور سخن شناس تھے اُچھل پڑے اور انہوں نے اپنی رانیں پیٹ ڈالیں اور اقرار کیا کہ بیشک ہم عاجز ہیں۔

بہرحال کسی منصف مزاج عربی داں کو اس میں قطعاً شک نہیں ہو سکتا کہ قرآن مجید اپنی فصاحت وبلاغت کے لحاظ سے بھی معجزہ ہے اور وہ ہرگز محمد رسول اللہ علیہ وسلم جیسے کسی ایسے اُمّی انسان کی تصنیف نہیں ہو سکتا جس کو فن شعر وخطابت سے کبھی کبھی کوئی تعلق نہ رہا ہو۔

ان سب پہلوؤں سے قرآن پاک آج بھی معجزہ ہے قرآن پاک ان سب پہلوؤں سے جس طرح اب سے چودہ سو برس پہلے کی دنیا کے لئے معجزہ تھا، بالکل اسی طرح وہ آج کی دنیا کے لئے بھی معجزہ ہے اور ہم اس کو ہاتھ میں لے کر ساری دنیا کو پکار کر کہتے ہیں کہ

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت چونکہ قیامت تک کے لئے ہے اسلئے
اللہ تعالیٰ نے آپ کے اس معجزہ کو بھی قیامت تک کے لئے باقی اور روشن رکھنے کا فیصلہ کیا
ہے اور ختم دنیا تک پیدا ہونے والے سب انسانوں کے لئے یہ اللہ کی حجت ہے، جس
کو کوئی شک و شبہ ہو وہ ذرا سے غور و فکر سے کام لے کر اطمینان حاصل کر سکتا ہے اور
صداقت اور سچائی کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے، اس کے بعد بھی جو لوگ سچا اور
دیکھنا نہیں چاہتے، وہ وہی ہیں جنہیں اپنے اللہ کو راضی کرنے کی اور اپنے انجام کی کوئی
فکر نہیں ہے، اس لئے اُن کا انجام جہنم کے ابدی عذاب کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔

آنحضرتؐ کا ایک دوسرا زندہ تاریخی معجزہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسی طرح کا ایک
اور عام اور زندہ تاریخی معجزہ وہ محیر العقول روحانی اور ایمانی انقلاب ہے جو آپ کے
ذریعہ دنیا میں برپا ہوا تھا اور تاریخ نے اس کو بعد والوں کے لئے ہمیشہ کے واسطے پوری طرح
محفوظ کر دیا ہے۔ اسلام کی اور عرب کی تاریخ جاننے والے دوست دشمن سب جانتے ہیں
کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت عربوں کی دینی اخلاقی اور تہذیبی
حالت کیا تھی، وہ اللہ سے کتنے بے تعلق اور مرنے کے بعد والی زندگی سے کتنے بے فکر تھے
ان میں کس درجہ وحشت اور جہالت تھی، لڑائی بھڑائی، لوٹ مار، قتل و غارت، بے حیائی اور
بے شرمی، قمار و شراب، ظلم و جفا اور اسی طرح کے دوسرے فواحش و منکرات ان میں کس
قدر عام تھے۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صرف چند سال کی دعوت و تبلیغ اور تعلیم
و تربیت نے ان کی کیسی کایا پلٹی، وہ کیسے خدا پرست بن گئے، ان پر فکر آخرت کا کتنا غلبہ ہو
گیا وہ کیسے مہذب اور حسن اخلاق کا کتنا اعلیٰ نمونہ بن گئے، انصاف اور رحمدلی میں وہ
دنیا سے کتنے ممتاز ہو گئے اور اس وقت کی دنیا کی سب سے بڑی دو شہنشاہیوں روم اور

فارس کو زیر کرکے ان کے تخت وتاج کا وارث بن جانے کے بعد بھی وہ کیسے خدا پرست اور خدا ترس بنے رہے۔

تاریخ نے عرب کے اس روحانی اور ایمانی انقلاب کی پوری تفصیلات کو محفوظ رکھا ہے اور اسلام کا کوئی متعصب سے متعصب دشمن بھی اس تاریخی حقیقت سے انکار کی جرأت نہیں کرسکتا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت وتبلیغ اور تعلیم وتربیت سے عربوں کی زندگی میں یہ انقلاب برپا ہوا تھا۔

اور اس کے بعد میں کہتا ہوں کہ یہ بلاشبہ آپ کا معجزہ تھا اور جس کو اس کے معجزہ ہونے سے انکار ہو وہ اپنے سارے علمی اور عقلی اور رُوحانی اور مادی ذرائع کو استعمال کر کے اس سے چھوٹے پیمانے پر ایسا انقلاب سو برس میں برپا کر کے دکھلائے۔

ایک بڑا دلچسپ اور بصیرت افروز مکالمہ اس سلسلہ میں ایک بڑا دلچسپ واقعہ میرے علم میں ہے اور اس لائق ہے کہ میں یہاں اس کا ذکر کروں، امید ہے کہ انشاء اللہ اس سے آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس معجزے کو بڑی صفائی کے ساتھ سمجھ سکیں گے۔

میرے ایک چچا تھے، حقیقی چچا (اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے) ابھی چند سال ہوئے ان کا انتقال ہوا ہے، بڑے ذہین اور حاضر دماغ تھے، عالم فاضل تھے اور فطری مناظر تھے اور طبیب بھی کامیاب تھے خود انہوں نے مجھے یہ واقعہ سنایا کہ وہ سفر میں تھے اور لکھنؤ کے اسٹیشن پر انہیں کسی ٹرین کے انتظار میں دو تین گھنٹے ٹھہرنا تھا، انہوں نے سوچا کہ یہ وقت کسی کام میں لگنا چاہئے اور غور کرنے کے بعد یہ طے کیا کہ رسالہ "نگار" کا دفتر تلاش کرکے نیاز فتحپوری صاحب سے کچھ باتیں کی جائیں چنانچہ تانگہ کرایہ پر کیا اور نگار کے دفتر پہنچ گئے، نیاز صاحب موجود تھے، چچا صاحب نے ان سے کہا کہ میں آپ

سے ایک نہایت اہم مسئلہ پر بات کرنا چاہتا ہوں اور اس کے لئے آپ کا ایک گھنٹہ لینا چاہتا ہوں، نیاز صاحب نے (شاید ان کی مولویانہ صورت دیکھ کر) پہلے تو اتنا وقت دینے سے انکار کیا، لیکن بالآخر ان کے اصرار اور ان کی منطق نے انہیں مجبور کر دیا اور وہ ہمہ ہو کر بیٹھ گئے۔ چچا صاحب نے ان سے کہا کہ میں کبھی کبھی آپ کا رسالہ "نگار" دیکھتا ہوں اس لئے آپ کی ذہانت اور آپ کے زورِ قلم اور آپ کی علمی خصوصیات سے واقف ہوں، میں اس وقت آپ کے پاس اس لئے آیا ہوں کہ اس صلاحیت اور قابلیت کو ایک بڑے اور بہت مفید کام میں لگانے کی آپ سے درخواست کروں، آپ دیکھتے ہیں کہ دنیا میں برائیاں اور بد اخلاقیاں کتنی بڑھ گئی ہیں اور ساری دنیا کو چھوڑ دیجئے اپنے اسی شہر لکھنؤ کو دیکھئے خالص انسانی اور اخلاقی نقطۂ نگاہ سے بھی یہاں کے عام باشندے بچارے کس قدر پست حالت میں ہیں، کتنی بڑی تعداد ہے جو جاہل ہے، اُجڈ ہے، تنگ نظر ہے، گندگی پسند ہے، پھر ہر کام اور ہر پیشہ میں جھوٹ ہے، دھوکہ ہے، خود غرضی ہے، بے ایمانی ہے، غرض جو چیزیں انسانوں میں نہیں ہونی چاہئیں وہ سب موجود ہیں اور جو اچھی باتیں ہونی چاہئیں وہ بالکل نہیں ہیں، تہذیب نہیں ہے، شرافت نہیں ہے، امانت نہیں ہے سچائی نہیں ہے، ایسی حالت میں آپ جیسی قابلیت رکھنے والوں کا فرض ہے کہ وہ سب کام چھوڑ کے اس بگڑی ہوئی انسانیت کو درست کرنے پر اپنی ساری قوتیں لگا دیں، آپ جیسے حضرات اگر اس کام کے لئے کھڑے ہو جائیں اور جس طرح منصوبے بنا کر قوموں اور ملکوں میں بڑے بڑے کام کئے جاتے ہیں، اسی طرح اس کام کو آپ کریں تو بہت جلدی دنیا کی کایا پلٹ جائے گی اور سب سے پہلے اسی لکھنؤ سے شروع کیجئے، اس کام کے لئے میں اپنی پوری خدمات آپ کے حوالے کرتا ہوں، ہمیں امید ہے کہ بس سال دو سال میں ہم لکھنؤ

کر تو ایک نیا اور ساری دنیا کے لئے نمونہ کا لکھنؤ بنا دیں گے، ہمیں اس ہم میں ہر شریف اور معقول آدمی کی ہمدردی اور اس کا تعاون حاصل ہوگا اور پھر تھوڑے عرصہ میں ساری دنیا کو ہم ایک اچھی شریف دنیا بنا سکیں گے۔

نیاز صاحب نے یہ سن کر کہا، مولانا! آپ کس خواب وخیال میں ہیں، آپ بڑے سیدھے آدمی معلوم ہوتے ہیں، میرے اور آپ کے جیسے اگر سینکڑوں آدمی بھی ہوں تو یہ کام پھر بھی نہیں ہو سکتا۔

چچا صاحب نے کہا کیوں نہیں ہو سکتا؟ آپ بہترین لکھنے والے ہیں، آپ کے ہاتھ میں پریس کی طاقت ہے اور غالباً آپ تقریر بھی بہترین کرتے ہوں گے اور مجھے بھی کچھ ٹوٹا پھوٹا لکھنا بولنا آتا ہے اور جس دن ہم یہ کام شروع کریں گے ہمیں یقین رکھنا چاہئے کہ کتنے اخبارات اور رسائل ہمارا ساتھ دیں گے اور سینکڑوں ہزاروں لکھنے اور بولنے والے ہمارے ساتھ اٹھ کھڑے ہوں گے اور آپ دیکھیں گے کہ چند دنوں میں فضا بالکل پلٹ جائے گی اور دنیا میں ایک نئی بہار آجائے گی، اگر ہم ساری دنیا کو نہیں بدل سکتے، تو کم از کم اپنے ملک کو یا اپنے صوبہ کو تو بدل ہی ڈالیں گے، آپ ہمت کیجئے اور پھر دیکھئے کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ سب ہو جائے گا۔

نیاز صاحب نے پھر کہا کہ مولانا آپ بہت ہی سیدھے آدمی معلوم ہوتے ہیں اور اس دنیا کو شاید آپ بالکل نہیں جانتے، اس دنیا کا بدلنا ہمارے آپ کے بس کی بات نہیں ہے۔

چچا صاحب نے کہا، اچھا میں ایک بات پوچھتا ہوں مجھے اندازہ ہے کہ تاریخ پر آپ کی خوب نظر ہے اور آپ یقیناً اس سے واقف ہوں گے کہ اب سے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے عرب میں ایک دفعہ ایسا کام ہوا تھا اور اس قوم میں ہوا تھا جو تعلیم وتہذیب میں بالکل

کوری تھی اور جہالت اور اُجڈپن میں اور تمام برائیوں اور بداخلاقیوں میں ہماری اس دنیا کے جاہلوں اور غنڈوں سے بہت بڑھی ہوئی تھی اور ایک ایسی شخصیت کے ذریعہ ہوا تھا جو نوشت وخواند سے بالکل ناآشنا تھی، نہ اُس کے ہاتھ میں پریس تھا، نہ کوئی اخبار یا رسالہ اُس کی آواز کو بلند کرنے والا تھا، نہ اُس کے ساتھ مقرروں کی کوئی ٹیم تھی، نہ اس کے پیغام کو قوم میں پھیلانے والے شاعر اُس کے ساتھ تھے، تو جب اس بے سروسامانی کی حالت میں ایک اکیلے اُمّی انسان نے ایک پوری قوم کو بدل دیا، تو ہم اور آپ جیسے پڑھے لکھے آدمی جن کے ہاتھ میں قلم اور پریس کی طاقت بھی ہے اور ہزاروں ہم جیسے اور آدمی بھی ہمارا ساتھ دینے کو دنیا میں موجود ہیں اور حکومتیں بھی ہمارے اس کام میں یقیناً ہم سے پورا تعاون کریں گی، تو پھر آپ کیوں مایوس ہیں، میں تو کہتا ہوں کہ اگر عرب میں وہ انقلاب ۲۰ سال میں ہوا تھا، تو ہم اپنے ان وسائل کی وجہ سے ایک سال میں وہ انقلاب برپا کرسکیں گے، بس اس کی ضرورت ہے کہ ہم آپ ہمت کرکے فیصلہ کریں، اور دوسرے سارے کام چھوڑ کے اپنی ساری قوتوں کو اس پر لگادیں۔

نیاز صاحب نے کہا، مولانا! میں آپ کو سمجھا نہیں سکتا، لیکن بات یہی ہے کہ یہ کام ہمارے اور آپ کے بس کا نہیں ہے اور آپ میرے اور اپنے متعلق اور اس دنیا کے متعلق بڑی غلط قسم کی خوش فہمیوں میں مبتلا ہیں۔

چچا صاحب نے کہا، اچھا یہ تو بتائیے کہ آپ ایک تاریخ داں کی حیثیت سے اس تاریخی واقعہ کو بھی تسلیم کرتے ہیں یا نہیں، کہ اب سے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے عرب میں ایسا انقلاب ہوچکا ہے۔

نیاز صاحب نے کہا، ہاں! یہ ایک مسلّم واقعہ ہے اور اس سے کون انکار کرسکتا ہے۔

چچا صاحب نے کہا، مجھے آپ سے بس یہی جواب لینا تھا۔ کچھ عرصہ ہوا میں نے معجزات کے انکار پر آپ کا ایک مضمون پڑھا تھا، یہ وقت میں نے آپ سے اسی لئے لیا تھا کہ آپ کو معجزے کی حقیقت سمجھا دوں اور آپ کو بتا دوں کہ آپ بھی معجزہ کے قائل ہیں، اللہ کے پیغمبر کے ذریعہ جو ایسی چیز ظاہر ہو، جس کے کرنے سے اُس جیسے دوسرے انسان عاجز ہوں بس وہی معجزہ ہے آپ نے اس وقت بار بار اقرار کیا ہے کہ اللہ کے اُمّی پیغمبر (حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کے ذریعہ عرب میں جو اصلاحی انقلاب برپا ہوا تھا، آپ ہر طرح کے بہتر سے بہتر وسائل رکھنے کے باوجود اپنے کو اس سے عاجز سمجھتے ہیں کہ صرف شہر لکھنؤ میں ہی ایسا انقلاب برپا کر سکیں۔

چچا صاحب فرماتے تھے کہ اس بات کے ختم ہونے کے ساتھ میرے وقت کی گنجائش بھی ختم ہو گئی اور اگرچہ نیاز صاحب (شاید اپنے ابتدائی رویہ کی تلافی کے لئے) اور کچھ دیر بیٹھنے پر اصرار کر رہے تھے، لیکن وقت میں گنجائش نہ ہونے کی وجہ سے میں فوراً اسٹیشن آ گیا۔

حقیقت یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت اور تعلیم و تربیت سے جو روحانی اور ایمانی انقلاب عرب میں برپا ہوا وہ بھی قرآن مجید کی طرح آپ کا ایک زندہ تاریخی معجزہ ہے مگر افسوس ہم مسلمانوں کی موجودہ حالت نے اس پر بہت ہی غلیظ پردے ڈال دیئے ہیں اور دنیا کے لئے اس کا سمجھنا مشکل بنا دیا ہے۔

ایک اور زندہ معجزہ میں معجزات کے سلسلے میں آپ کے ایک اور علمی معجزہ کا ذکر کرتا ہوں وہ بھی الحمد للہ محفوظ اور زندہ ہے اور جس کا جی چاہے آج بھی اس میں ذرا غور کر کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت اور آپ کی نبوت و رسالت کا یقین کر سکتا ہے اور خود میرا

حال یہ ہے کہ الحمدللہ میں زیادہ تر اسی میں غور کرکے اپنے ایمان کو تازہ کیا کرتا ہوں اور وہ ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعائیں۔ اللہ تعالیٰ حضرات محدثین کو بہتر سے بہتر جزائے اور ان کی قبروں کو اپنے انوارِ رحمت سے بھر دے، انہوں نے حضورؐ کے دوسرے اقوال وافعال کی طرح آپ کی مختلف اوقات اور مختلف حالات کی دعاؤں کو بھی ہمارے لئے اپنی کتابوں میں محفوظ کر دیا، پھر بعد میں اللہ کے بعض بندوں نے ان دعاؤں کو الگ کتابی شکل میں بھی مرتب کر دیا اور اب چھوٹی بڑی بیسیوں کتابیں ایسی موجود ہیں جن میں صرف حضورؐ کی دعاؤں ہی کو کسی خاص ترتیب سے جمع کیا گیا ہے[1]۔ جس شخص میں خداپرستی اور روحانیت کا کوئی ذرہ بھی موجود ہو یا اس کو ان چیزوں کی ذرا بھی حس ہو، وہ اگر ان دعاؤں پر یا ان کے ترجموں ہی پر غور کرے تو اس کو اس پر شک نہیں رہ سکتا کہ یہ دعائیں صرف اسی منور قلب سے نکل سکتی ہیں جس کو انسانیت بلکہ ساری کائنات کا بھی زیادہ سے زیادہ عرفان حاصل ہوا اور اللہ کی معرفت میں بھی اُس کا مقام بلند سے بلند تر ہوا اور اس کے دل میں ذرہ برابر بھی کھوٹ نہ ہو۔ الحمدللہ ثم الحمدللہ اس عاجز کو تو حضورؐ کی ہر دعا سے یہ نورِ یقین نصیب ہوتا ہے اور میں صاف کہتا ہوں کہ شاید میری افتادِ طبع کی وجہ سے میرا ذوق و وجدان حضورؐ کی نبوت و رسالت کے بارے میں دوسری تمام چیزوں سے زیادہ تسکین اور یقین آپ کی دعاؤں سے حاصل کرتا ہے۔ بہرحال حضورؐ کی محفوظ دعائیں بھی آپ کا نہایت روشن اور زندۂ جاوید معجزہ ہیں، بلکہ سچی بات یہ ہے کہ اللہ نے کسی کے دل کو ذرا بھی روشنی

---

[1] حضورؐ کی دعاؤں کا ایک مکمل مجموعہ "حصنِ حصین" ہے جو اردو ترجمہ کے ساتھ شائع ہو چکا ہے یہ کتاب خاصی ضخیم ہے اور ایک مختصر مگر جامع اور کافی وافی مجموعہ "مناجاتِ مقبول" ہے، جو مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کے ترجمہ اور تشریحی نوٹوں کے ساتھ بھی شائع ہوا اور تعلیم یافتہ حضرات کے لئے اس کا مطالعہ زیادہ مفید ہے۔

دی ہو تو اُس کے لئے حضورؐ کی زندگی کا ہر پہلو بلکہ اس کی ہر ادا معجزہ ہے۔

معجزات کے سلسلے میں میری گفتگو بہت طویل ہو گئی، لیکن الحمدللہ بعض باتیں ایسی ذکر میں آ گئیں جن سے انشاء اللہ ہم سب کے ایمان و یقین میں تازگی پیدا ہوئی ہو گی اور آئندہ بھی ان کو یاد کرکے بوقتِ ضرورت یہ تازگی پیدا کی جا سکے گی اور جو انسان اپنی قسمتی سے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہیں رکھتے ہیں، انشاء اللہ یہی چند باتیں بوقت ضرورت اور موقع پر آپ اُن کے سامنے بھی رکھ سکیں گے اور ان کو غور و فکر کی دعوت دے سکیں گے۔

اب میں نبوت و رسالت ہی کے متعلق ایک آخری بات اور کہنا چاہتا ہوں۔

مقامِ نبوت اور کسی کو نبی ماننے کا مطلب جب آپ نے نبوت و رسالت کی حقیقت سمجھ لی، تو یہ بات بھی آپ پر واضح ہو گئی ہو گی کہ کسی کو نبی اور رسُول ماننا ایسی بات نہیں ہے جیسے کہ کسی کو شاعر مان لینا یا کسی کو قوم کا لیڈر مان لینا، یا کسی کو حکیم یا ڈاکٹر مان لینا کسی کو شاعر یا لیڈر یا حکیم یا ڈاکٹر ماننے کے بعد ہمارے لئے یہ ضروری نہیں ہو جاتا کہ ہم اُس کے فن میں بھی اُس کی ہر بات کو قبول کریں، لیکن کسی کو نبی و رسُول ماننے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہم نے اس حقیقت کو تسلیم کر لیا کہ غیبی حقیقتوں کے بارے میں جو کچھ ہمیں بتلاتا ہے اور ہم کو جو ہدایات دیتا ہے سب اللہ کی طرف سے دیتا ہے اور اس کی یہ ساری باتیں گویا اللہ کی باتیں ہیں، اس لئے یہ سب حق ہی حق ہیں اور ان میں کسی کو چون و چرا اور شک و شبہ کی بالکل گنجائش نہیں ہے۔ اس واسطے ہر انسان کا فرض ہے کہ کسی ہستی کو نبی اور رسُول ماننے کے بارے میں تو ہرگز سہل انگاری سے کام نہ لے، بلکہ خوب دیکھ بھال

کے اور چاہے ہم یہ کہہ کے کسی کو اللہ کا نبی یا رسول مانے، لیکن جب دل اور دماغ کسی ہستی کو نبی اور رسول مان لیں اور ان کی نبوت و رسالت پر آدمی ایمان لے آئے تو پھر عقل کا فیصلہ بھی یہی ہے کہ اُن کی ہر بات کی تصدیق کی جائے اور اُن کی ہر اطلاع پر آمنا و صدقنا کہا جائے اور ان کے ہر حکم کو اللہ کا حکم سمجھ کر اس کی اطاعت کی جائے۔

آپ خالص عقل کی روشنی میں غور کیجئے، جب کسی ہستی کے متعلق یہ تسلیم کر لیا گیا کہ وہ اللہ کا پیغمبر ہے تو اسی کے ساتھ یہ بھی تسلیم کر لیا گیا کہ وہ جھوٹا نہیں ہے، مکار نہیں ہے، کسی بیماری یا دھوکہ میں مبتلا نہیں ہے، اس پر اللہ کی وحی آتی ہے اور جو غیبی حقیقتیں ہمارے مشاہدہ اور ادراک کی دسترس سے باہر ہیں اُن کے بارے میں وہ جو کچھ بتلاتا ہے اور جو احکام ہم کو دیتا ہے اُن سب کا علم اللہ کی وحی سے اس کو حاصل ہوتا ہے، اب آپ ہی سوچئے کہ یہ سب کچھ مان لینے کے بعد پیغمبر کی کسی دی ہوئی اطلاع میں اس بنیاد پر شک کرنا کہ وہ ہماری سمجھ میں نہیں آتی، یا کسی حکم کے بارے میں اسلئے متردد اور مذبذب ہونا کہ اس کی حکمت اور فلاسفی کو ہم نہیں سمجھتے، کس قدر جاہلانہ اور احمقانہ بات ہے، لیکن آج کل کے بہت سے پڑھے لکھے مدعیانِ عقل جب دین و مذہب کے موضوع پر بات کرتے ہیں تو اسی حماقت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ میرے نزدیک تو یہ بات صریح کفر ہے، یعنی پیغمبر کا صاف انکار کرنے سے بھی زیادہ غیر منطقی ہے۔

اطمینان قلب کیلئے دلیل یا حکمت دریافت کرنے میں مضائقہ نہیں

ہاں اس میں مضائقہ نہیں کہ ایک شخص پیغمبر پر ایمان لانے کے بعد اور اصولی طور پر اس بات کو قبول کر لینے کے بعد کہ یہ اللہ کے نبی ہیں اور جن باتوں کی خبر دیتے ہیں اور جو احکام سناتے ہیں وہ سب حق ہیں، اور اللہ کی طرف سے ہیں اور میں نے ان سب کو قبول کر لیا اور مان لیا (تو اس اصولی اور

قطعی ایمان کے بعد اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ) وہ شخص مزید اطمینان اور قلبی انشراح حاصل کرنے کے لئے دین کی ہر بات کو سمجھنے اور ہر حکم کی حکمت جاننے کی کوشش کرے اور اس کے لئے خود غور و فکر کرے یا اس قسم کی کتابیں دیکھے، یا ایسے لوگوں سے استفادہ کرے جو اس کے اہل ہوں۔

الحمد للہ ہمیں اس میں ذرا بھی شک نہیں ہے کہ اللہ کے پیغمبروں نے جو کچھ بتلایا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ صحیح اور مستند طریقہ سے ہم تک پہنچا ہے، وہ بالکل عقل و فطرت کے مطابق ہے اور اس میں ایک بات بھی ایسی نہیں ہے جو عقل و حکمت کے معیار پر پوری نہ اترتی ہو، لیکن کیا ہر شخص کے پاس معیاری عقل و حکمت موجود ہے؟

ہماری عقلوں کی پرواز ہماری عقلوں کا حال تو یہ ہے کہ جب تک وہ خوردبین ایجاد نہیں ہوئی تھی جس سے پانی کے جراثیم دیکھے جاتے ہیں، اگر اس وقت کوئی ہم سے کہتا کہ پانی کے ایک ایک قطرے میں ہزاروں زندہ کیڑے ہوتے ہیں تو ہم اس کو گپ سمجھتے، اسی طرح اب سے دو سو سال پہلے اگر کوئی کہتا کہ ایک ایسی جاندار سواری بھی ہوتی ہے جو سیکڑوں آدمیوں کو سوار کر کے پانچ سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے آسمانی فضا میں اڑتی ہے تو سننے والے اس کو نرا جھوٹ سمجھتے، لیکن آج یہ دونوں چیزیں واقعہ بن کر ہمارے سامنے آچکی ہیں۔

پس جن بیچاری عقلوں کا یہ حال ہے کہ چند دنوں بعد جو چیزیں اس دنیا میں سامنے آنے والی ہیں اُن کو بھی وہ نہیں سمجھ سکتیں، اُن غریب عقلوں کو انبیاء علیہم السلام کی باتوں کے لئے میزان اور معیار بنانا یقیناً حماقت ہے۔

الغرض صحیح اور دانشمندانہ طرزِ عمل یہ ہے کہ آدمی کسی کو اللہ کا نبی تو خوب دیکھ بھال کر اور جانچ پرکھ کے مانے، لیکن مان لینے کے بعد آنکھ بند کر کے اس کی ہر بات کی تصدیق

کرے اور اُس کے ہر حکم کو واجب الاطاعت جانے، یہی عقل کا تقاضہ ہے اور یہی انبیاء علیہم السلام کی تعلیم ہے۔

پیغمبر کی بعض باتوں کو ماننا اور بعض کو نہ ماننا بھی کفر ہے اسی لئے وہ شخص مومن نہیں جو اللہ کے پیغمبر کی بعض باتوں کو مانے اور بعض کو نہ مانے، پیغمبر کے ہر فیصلہ کا ماننا قرآن شریف میں شرطِ ایمان قرار دیا گیا ہے۔ ارشاد ہے:-

"فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا" (نساء - ع - ۹)

اے پیغمبر! تمہارے رب کی قسم یہ لوگ مومن نہیں جب تک کہ اپنے اختلافات میں تم کو حکم نہ مانیں اور پھر جب تم کوئی فیصلہ دے دو تو اپنے دلوں میں اس سے کوئی تنگی اور ناگواری نہ پائیں اور اس کو بالکل تسلیم کر لیں۔

اور ایک دوسرے موقع پر فرمایا گیا ہے:-

"وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ" (احزاب - ع - ۵)

اور کسی ایمان والے مرد یا ایمان والی عورت کو جب اللہ اور رسول کسی بات کا حکم دے دیں تو ان کو اپنے اس معاملہ میں کوئی اختیار باقی نہیں رہتا (بلکہ اُن کا کام صرف ماننا اور تسلیم کرنا ہے)

بہرحال اس بات کو قرآن پاک میں بھی بار بار بیان کیا گیا ہے اور عقلی طور پر بھی یہ بات سمجھ میں آنے والی ہے کہ کسی کو اللہ کا پیغمبر مان لینے کے بعد اس کے ہر حکم اور اس کی ہر دینی بات کا ماننا ضروری ہے۔ اور اس کی کسی بات کا انکار بھی اس کی پیغمبری کا انکار ہے۔

منکرینِ حدیث کی گمراہی اس موقع پر اس زمانہ کے بعض لوگوں کی ایک گمراہی کا ذکر کر دینا

بھی مناسب معلوم ہوتا ہے، آپ نے سنا ہوگا کہ کچھ لوگ اس کے قائل ہیں کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث دین میں حجت نہیں، یعنی اس کا ماننا اور اس پرعمل کرنا فرض نہیں، صرف قرآن کا ماننا ضروری ہے اور بس وہی دینی حجت ہے، دراصل یہ گمراہی نبوت کا مقام نہ سمجھنے سے پیدا ہوتی ہے، ان لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بس ایک چٹھی رساں کی طرح سمجھا ہے، جس کا کام صرف خط پہنچا دینا ہے، ان کا خیال ہے کہ دین میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کام بس اتنا ہی تھا کہ قرآن اُن پر نازل ہوا اور انہوں نے اس کو پہنچا دیا۔ حالانکہ نبی دین کے اصول واحکام بیان کرنے میں بھی اللہ کا نائب ہوتا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جس طرح یہ ایک کام تھا کہ قرآن مجید کو انہوں نے اللہ کے بندوں تک پہنچایا اسی طرح یہ بھی ایک کام تھا کہ قرآن پاک میں جس ایمانی زندگی کے صرف اصول بیان کئے گئے ہیں، ان کی تفصیلات اور ان کی عملی صورتیں بھی آپ لوگوں کو بتائیں مثلاً قرآن پاک میں نماز کا حکم تو سیکڑوں جگہ دیا گیا ہے لیکن اس کے پڑھنے کا طریقہ اور اس کے تفصیلی احکام ایک جگہ بھی نہیں بیان کئے گئے، اسی طرح کھانے پینے میں کیا چیزیں حلال ہیں اور کیا حرام اس کا بھی قرآن پاک میں بہت مجمل اور مختصر بیان فرمایا گیا ہے مثلاً کتا کھانا جائز ہے یا ناجائز، زمین کے کیڑے کوڑوں کا کھانا حلال ہے یا حرام، قرآن پاک میں اس بارے میں کوئی صاف اور واضح حکم موجود نہیں ہے بلکہ مجملاً بس یہ فرمایا گیا ہے کہ

"یُحِلُّ لَھُمُ الطَّیِّبٰتِ وَیُحَرِّمُ عَلَیْھِمُ الْخَبٰٓئِثَ۔" ہمارے یہ رسُول ان لوگوں کیلئے پاکیزہ چیزوں کا حلال ہونا اور گندی چیزوں کا حرام ہونا بیان کرتے ہیں!

بہرحال اس قسم کی ساری چیزوں کی تفصیل بیان کرنے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

اللہ تعالیٰ کے مامور اور نائب ہیں اور آپ نے اس قسم کے جو تفصیلی احکام اُمت کو دیئے، وہ سب اللہ کی وحی سے اور اس کے بخشے ہوئے علم سے دیئے اور آپ کے ان ہی احکام سے اسلامی زندگی کا نقشہ تیار ہوتا ہے۔

خود قرآن مجید میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک کام جس طرح یَتْلُوْا عَلَیْہِمْ اٰیٰتِہٖ بتایا گیا ہے، (جس کا مطلب یہ ہے کہ آپ لوگوں کے سامنے اللہ کی آیات کی تلاوت کرتے ہیں اور اللہ کی باتیں اللہ ہی کے الفاظ میں ان لوگوں کو سناتے اور پہنچاتے ہیں)، اسی طرح دوسرا کام "یُعَلِّمُہُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ" اور تیسرا کام "یُزَکِّیْہِمْ" بھی بتلایا گیا ہے (جس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے یہ رسول ہماری کتاب کی اور حکمت کی تعلیم بھی دیں گے اور لوگوں کے تزکیہ کا کام بھی کریں گے)۔

اسی طرح ایک دوسری جگہ قرآن مجید ہی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا گیا ہے کہ:۔ "لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَانُزِّلَ اِلَیْہِمْ" یعنی آپ کو یہ کام بھی کرنا ہے کہ جو کتاب ہماری طرف سے لوگوں پر نازل کی گئی ہے آپ اُن کے سامنے اُس کی تبیین کریں، یعنی اس میں جو چیزیں مجمل چھوڑ دی گئی ہیں آپ اُن کی تفصیل بیان کریں۔

پس جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ آپ کا کام بس قرآن پہنچا دینا تھا اور وہی حجت ہے بس وہی ہے جو قرآن میں ہے اُس کے سوا اپنے دین کے لئے ہمیں کسی اور چیز کی یعنی حدیث و سنت کی ضرورت نہیں، وہ دراصل اللہ کی بات "یُعَلِّمُہُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ وَیُزَکِّیْہِمْ" اور "لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَانُزِّلَ اِلَیْہِمْ" سے انکار کرتے ہیں۔

حدیث و سنت کا سارا مستند ذخیرہ دراصل ان ہی آیات کی تفسیر ہے اور ہم اس ذخیرے کے ذریعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس پیغمبرانہ کام یعنی کتاب و حکمت کی

تعلیم اور تزکیہ اور تبیین سے قریب قریب اسی طرح استفادہ کرسکتے ہیں جس طرح سے صحابۂ کرام نے کیا تھا۔

علاوہ ازیں اگر اللہ تعالیٰ صرف قرآن ہی بھیجنا چاہتا تھا تو اس کی تو زیادہ بہتر شکل یہ ہوتی کہ آسمان سے ایک صحیفہ آتا اور کعبہ کی چھت پر اُتار دیا جاتا، یا کعبہ کی دیواروں سے وہ کلام اہلِ مکہ کو سنوا دیا جاتا، جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ایک درخت سے سنوایا گیا تھا بلکہ اس سے اہلِ مکہ زیادہ متاثر ہوتے، رسالت کیلئے انسانوں کا انتخاب تو اسی لئے ہوتا ہے کہ انسان پیغمبر ہی اللہ کے پیغام کی مراد واضح کرسکتا ہے اور اُس زندگی کی تفصیلات بتاسکتا ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے چاہتا ہے اور وہی اپنی زندگی سے اُس کا نمونہ پیش کرسکتا ہے۔

الغرض حدیث وسنت کا انکار کرنے والا طبقہ جو قرآن پاک کا مقدس نام لے کر اُمت کو دھوکا دیتا ہے، یہ اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر ایمان لانے کی مدعی ہے لیکن درحقیقت اس نے مقامِ نبوت کو سمجھا نہیں ہے اور اس کی بات ایسے لوگوں کو بڑی اچھی اور بڑی آسان معلوم ہوتی ہے جو مسلمان رہنا بھی چاہتے ہیں، مگر شریعت کی پابندیوں سے بھاگتے ہیں، انکارِ حدیث کے اصول کو مان لینے کے بعد ان کے لئے ہر آوارگی اور ہر نفس پرستی کے جائز ہونے کا راستہ نکل آتا ہے کیونکہ قرآن مجید ایمان اور عمل صالح والی اور تقوے والی جس زندگی کا مطالبہ کرتا ہے اس کی تفصیلات جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی تھیں، وہ حدیث وسنت ہی سے معلوم ہوتی ہیں، قرآن پاک میں تو نماز کی بھی تفصیل نہیں بتلائی گئی ہے۔

دراصل یہ فتنہ بڑا اسلام سوز اور دین کش فتنہ ہے۔

وحدتِ ادیان کے مبلغین اور حدیث کے منکرین کی مشترک غلطی

آپ کو شاید معلوم ہوگا کہ ہمارے ملک کے بعض اچھے پڑھے لکھے اور مذہبی خیالات رکھنے والے ہندو صاحبان "وحدتِ ادیان" کے نظریے کے قائل ہیں اور وہ اپنے اس عقیدے کی تبلیغ بھی کرتے ہیں کہ نجات کے لئے کسی خاص دین پر چلنا ضروری نہیں، بلکہ تمام مذاہب یکساں طور پر سچے ہیں اور اس لئے ہر مذہب پر چلنے سے نجات حاصل ہوسکتی ہے، پنڈت سندر لال جی الہ آبادی ان لوگوں میں خاص شہرت اور امتیاز رکھتے ہیں اور میں ان کو ذاتی طور پر بھی کچھ جانتا ہوں، دلوں کا بھید تو اللہ ہی جانتا ہے لیکن میں اپنی دانست میں ان کو نیک نیت اور نیک دل سمجھتا ہوں، اُن کا یہ خاص مشن ہے، وہ مسلمانوں کو خصوصیت سے اس کی تبلیغ کرتے ہیں، وہ خود ہندو ہوتے ہوئے اور ہندو مذہب کے پابند ہوتے ہوئے بھی یہ سمجھتے ہیں کہ وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا پیغمبر مانتے ہیں اور قرآن پاک کو اللہ کی کتاب سمجھتے ہیں[1]۔ مسلمانوں سے جو چند باتیں وہ خاص طور پر کہا کرتے ہیں اُن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جس شریعت کو وہ "اسلامی شریعت" کہتے ہیں۔ (جو مسلمانوں کو دوسرے اہل مذاہب سے جدا کرتی ہے)۔ وہ قرآن میں نہیں ہے حتیٰ کہ جو نماز مسلمان پڑھتے ہیں وہ بھی قرآنی نہیں ہے، بلکہ غیر قرآنی ہے، قرآن میں صرف "الصلوٰۃ" کا حکم ہے،

---

[1] بظاہر یہ بات بڑی عجیب سی ہے لیکن جو شخص نبوت اور پیغمبری کی حقیقت نہ جانتا ہو اس سے کچھ مستبعد نہیں، گاندھی جی جیسے بڑے آدمی بھی غلطی میں اسی وجہ سے مبتلا تھے کہ وہ اپنی ساری صلاحیتوں کے باوجود نبوت کی حقیقت اور مقام نبوت سے آشنا نہیں تھے، اُنکے نزدیک حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دل سے رسول ماننے میں اور ہندو مذہب کے مطابق زندگی گزارنے میں کوئی تضاد نہیں تھا، وہ نبی کی لائی ہوئی شریعت کا اتباع ضروری نہیں سمجھتے تھے، بہرحال مقام نبوت نہ جاننے ہی کا یہ نتیجہ تھا۔

اور اگر کوئی مندر میں بیٹھ کر ایشور کا دھیان کرتا ہے یا پارٹھنا کرتا ہے تو وہ بھی صلوٰۃ کے قرآنی حکم پر عمل کرنے والا ہے۔ عجب زمانہ ہے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بتلائی اور سکھلائی ہوئی نماز اور آپ کی لائی ہوئی شریعت سے مسلمانوں کو توڑنے کے لئے اب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے قرآن ہی کو استعمال کیا جاتا ہے۔

دراصل مسلمانوں میں منکرین حدیث و سنت اور ہندوؤں میں پنڈت سندر لال جی جیسے حضرات کی غلطی کی بنیاد ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ دونوں گروہ مقام نبوت سے ناآشنا ہیں اور دونوں کی بات ماننے کا نتیجہ یہی ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن پاک کے اصولی مطالبوں کے ادا کرنے کی جو تفصیلی شکل اللہ کی طرف سے اُمت کو بتلائی ہے (جو حدیث و سنت ہی سے معلوم ہوتی ہے اور جس سے اسلامی زندگی کی عمارت مکمل ہوتی ہے) ہم اس سے خدانخواستہ مسلمان ہٹ جائیں۔

اس وقت کی گفتگو کا موضوع دراصل یہ فتنے اور یہ مسئلے نہیں تھے، بلکہ عقائد اور ایمانیات کے سلسلے میں نبوت اور رسالت کے متعلق بات ہو رہی تھی اور عرض یہ کیا جا رہا تھا کہ کسی کو نبی ماننے کے بعد اُس کی ہر اُس بات کو تسلیم کرنا اور دل سے اس کا ماننا اور اس پر عمل بھی ضروری ہو جاتا ہے، جو وہ اللہ کے دیئے ہوئے خاص علم سے ہم کو بتلائے۔ اس سلسلہ میں منکرین حدیث کا اور پھر ان کی وجہ سے "وحدتِ ادیان" والوں کا یہ تذکرہ درمیان میں آگیا اور اچھا ہوا کہ آگیا، اس کی بھی ضرورت تھی۔ اب پھر اصل موضوع پر آجایئے! اب تک جن تین عقیدوں پر گفتگو کی گئی ہے، یعنی توحید، آخرت، رسالت، یہ "امہات العقائد" (یعنی بنیادی عقیدے) کہلاتے ہیں۔

امہات العقائد کی خصوصیت اگرچہ ان کی علاوہ اور بھی چند ایسے اہم عقیدے ہیں جن

پر ایمان لانا اور یقین کرنا مسلمان ہونے کی شرط ہے لیکن ان تین عقیدوں کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام جس زندگی کا پیغام اللہ تعالیٰ کی طرف سے لاتے ہیں، اس کا پورا نظام ان ہی تین بنیادوں پر قائم ہوتا ہے اور وہی شخص اس زندگی کو اپنا سکتا ہے جو ان تین بنیادی باتوں کو تسلیم کرے، گویا اسلامی نظامِ زندگی کی یہ تین فکری اور اعتقادی بنیادیں ہیں، اسی لئے دین میں ان کی خاص اہمیت ہے اور اسی واسطے ان کو "امہات العقائد" کہتے ہیں، الحمدللہ ان تینوں کا بیان اچھی خاصی تفصیل سے ہو گیا۔

باقی عقائد اب ان کے علاوہ باقی عقائد کے متعلق کچھ عرض کرنا ہے۔

اوپر پوری تفصیل سے یہ بات ذکر کی جا چکی ہے کہ کسی کو نبی و رسول ماننے کے بعد یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ اُس کی ہر اس بات پر ایمان لایا جائے جو وہ اللہ کی طرف سے بتلائے اور اُس کی کسی ایک بات کا انکار بھی اُس کی نبوت کا انکار اور کفر ہے اس لئے ہر اُس حقیقت پر یقین کرنا اور اس پر عقیدہ رکھنا ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے جس کی اطلاع رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دی۔ البتہ جن مسلمانوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مبارک زمانہ نہیں پایا اور آپ کی دینی تعلیم اُن کو بالواسطہ پہنچی (جیسا کہ ہمارا حال ہے) اُن کے لئے یہ حیثیت صرف اُن ہی تعلیمات اور ان ہی عقائد کی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسے قطعی اور یقینی طریقے سے ثابت ہیں جس میں کسی شک و شبہ کی اور کسی تاویل کی گنجائش نہیں اور ہر دَور میں ان کی شہرت بھی اتنی عام رہی ہے کہ دین سے معمولی واقفیت رکھنے والے عوام بھی ان سے واقف رہے ہیں اور جن چیزوں کی قطعیت اور شہرت اس درجہ کی نہیں ہے (اگرچہ ان کا ثبوت ہمارے لئے قابلِ اطمینان ہو) تو ان کی حیثیت اور ان کا حکم یہ نہیں ہے، یعنی ان کا انکار کرنا بھی اگرچہ ایک درجہ کی گمراہی ہے

لیکن کفر نہیں ہے۔

عقائد کی دو قسمیں جب یہ اصولی بات آپ نے سمجھ لی، تو خود بخود یہ بھی آپ کی سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ عقائد دو قسم کے ہیں، یا یوں کہئے کہ دو درجے کے ہیں۔

ایک وہ جن کا ثبوت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسا قطعی اور یقینی ہے جس میں کسی شک کی گنجائش نہیں اور ہر دور میں ان کو ایسا تواتر اور ایسی عام شہرت حاصل رہی ہے کہ اس کی وجہ سے ان میں کسی تاویل کی بھی گنجائش نہیں۔

دوسرے وہ جن کا ثبوت اگرچہ قابل اطمینان اور پکا ہے، لیکن اس درجہ کی قطعیت اور ایسا تواتر ان کو حاصل نہیں جس کے بعد کسی احتمال اور تاویل کی بھی گنجائش نہیں رہتی۔

"امہات العقائد" یعنی توحید، رسالت، قیامت و آخرت پہلی قسم کے عقیدے ہیں، ان کے علاوہ قرآن مجید کا کتاب اللہ ہونا، آخرت میں جنت اور دوزخ کا ہونا، فرشتوں کا ایک مستقل مخلوق ہونا، اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے دنیا میں بہت سے نبیوں کا آنا اور آپ کا خاتم النبیین یعنی سب سے آخری نبی ہونا اور سلسلۂ نبوت کا آپ پر ختم ہونا، یہ سب بھی اسی درجے کے عقیدے ہیں کہ ان کا ثبوت بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسا ہی یقینی اور قطعی ہے جیسا کہ توحید، رسالت اور قیامت کا اور ان کو اسی درجہ کا تواتر اور ہر دور میں اسی قسم کی عام شہرت امت میں حاصل رہی ہے اس لئے ان سب باتوں کا حکم بھی یہی ہے کہ ان میں سے کسی ایک بات کا انکار کر کے بھی آدمی مسلمان نہیں رہ سکتا، اگرچہ اس کا یہ انکار کسی تاویل کی آڑ لیکر ہو۔

ضروریاتِ دین جن چیزوں کا ثبوت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس درجہ کا ہو،

اہل علم کی خاص اصطلاح میں ان کو "ضروریاتِ دین" کہتے ہیں، یعنی وہ دینی باتیں اور یقینی حقیقتیں جن کا تعلیمِ رسول ہونا بالکل یقینی ہو اور ان کو ہر دور میں ایسا تواتر اور ایسی عام شہرت حاصل رہی ہو کہ ان میں کسی تاویل کی بھی گنجائش نہ ہو۔

دوسرے درجہ کے عقائد دوسرے درجہ کے عقائد کی مثال میں عذابِ قبر، قیامت اور آخرت کی بعض تفصیلات مثلاً میزان، صراط، شفاعت، رویتِ باری تعالیٰ وغیرہ کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ قیامت سے پہلے دجّال کے ظہور اور حضرت مسیح کے نزول اور اسی طرح بعض اور علاماتِ قیامت کا درجہ بھی یہی ہے، یعنی ان کا ثبوت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اگرچہ قابلِ اطمینان اور پکا ہے، لیکن "ضروریاتِ دین" کے معیار کا نہیں، اس لئے کسی شبہ یا کسی تاویل کی بنیاد پر ان میں سے کسی چیز کا انکار کرنا اگرچہ سخت درجہ کی گمراہی ہے، لیکن اس کو کفر یا ارتداد نہیں کہا جاسکتا۔

بیانِ عقائد ہی کے سلسلہ میں ایک بات اور بھی یہاں سمجھ لینی چاہئے!

امت میں اختلافِ عقائد کا آغاز صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے درمیان عقائد میں کوئی اختلاف نہیں تھا، لیکن ان ہی کے زمانہ میں مختلف قوموں اور مختلف ملکوں کے جو بے شمار لوگ اسلام میں داخل ہوئے وہ اپنے ساتھ اپنے پُرانے خیالات اور اپنا طرزِ فکر بھی لے کر آئے اور ان سب کے خیالات کی پوری اصلاح اور تصحیح نہیں ہو سکی (اور اس عالمِ اسباب میں یہ ممکن بھی نہیں تھا) بس اُن ہی سے عقائد کا اور طرزِ فکر کا وہ اصولی اختلاف شروع ہوا جس نے امت میں بہت سے فرقے پیدا کئے، فروع میں اور غیر اہم مسائل میں رائے اور تحقیق کا اختلاف ایسی چیز نہیں ہے جس سے فرقہ بندی پیدا ہو، بلکہ یہ تو ناگزیر اور قدرتی ہے، فرقے جس اختلاف سے بنتے ہیں وہ عقائد اور اصول کا اختلاف ہے اور جیسا کہ میں نے عرض کیا یہ صحابۂ کرام

میں بالکل نہیں تھا، اپنے عقائد اور اپنے طرز فکر کے لحاظ سے وہ سب ایک جماعت تھے، پھر بعد میں جو فرقے پیدا ہوئے اگرچہ وہ بے گنتی ہیں لیکن اصولی طور پر ہم ان کو "اہل السنۃ والجماعۃ" اور "غیر اہل السنۃ والجماعۃ" کہہ سکتے ہیں۔

اہل السنۃ والجماعۃ کا اصول "اہل السنۃ والجماعۃ" کا امتیاز یہ ہے کہ وہ قرآن مجید کو دین کی اصل واساس ماننے کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت یعنی آپ کے ارشادات اور آپ کے طرز عمل کو اس کی شرح اور اس کے اجمال کی تفصیل سمجھتے ہیں اور جو چیزیں قرآن مجید میں بیان نہیں کی گئی ہیں اور سنت میں، ان کا بیان ہے، ان کے نزدیک وہ بھی واجب الاتباع اور جزو دین ہیں اور کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ کی یہ حیثیت تسلیم کرنے کے ساتھ وہ جماعت صحابہ کی یہ حیثیت بھی تسلیم کرتے ہیں کہ کتاب وسنت کا جو منشا انہوں نے سمجھا اور جن امور پر ان کا اجماع ہو گیا وہ بھی واجب الاتباع ہیں اور کسی مسلمان کو حق نہیں ہے کہ ان کے اجتماعی مسلک اور اجماعی فیصلوں کے خلاف اپنی کوئی رائے رکھے۔ دین کی کسی حقیقت اور کسی مسئلہ پر صحابہ کرام کے اجماع و اتفاق کے معنی اہل سنت کے نزدیک یہ ہیں کہ وہ مسئلہ بالکل قطعی ہے اور اس سے اختلاف کرنا ضلالت ہے کیونکہ دین جس ماحول اور جس فضا اور جن حالات میں آیا اور جس زبان میں آیا صحابہ کرام یقیناً اس کے سب سے زیادہ جاننے والے تھے، پھر انہوں نے دین براہ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل کیا اور آپ کی صحبت اور تربیت سے مستفیض ہوئے، اس لئے کوئی بھی ان سے زیادہ دین کا عارف اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کی روح اور منشا کو سمجھنے والا نہیں ہو سکتا، پس دین وہی ہے جو انہوں نے سمجھا۔

الغرض "اہل السنۃ والجماعۃ" دین کی کسی حقیقت اور کسی مسئلہ پر صحابہ کرامؓ کے

اجماع اور اتفاق کو فیصلہ کن چیز سمجھتے ہیں جس سے اختلاف کرنے کی ان کے نزدیک کسی کو گنجائش نہیں۔

بس یہ ہے اصولی مسلک "اہل السنۃ والجماعۃ" کا، بلکہ ان کو "اہل السنۃ والجماعۃ" اسی لئے کہا جاتا ہے کہ انہوں نے کتاب اللہ کے بعد سنّت اور جماعتِ صحابہ کو دین میں اتنی اہمیت تسلیم کی ہے اور اپنے کو ان کا اتنا پابند بنا دیا ہے۔

دوسرے فرقے باقی دوسرے فرقوں کا حال یہ ہے کہ وہ سنّت کو اور جماعتِ صحابہؓ کو اتنی اہمیت نہیں دیتے۔ ان فرقوں میں سب سے پہلے پیدا ہونے والے دو فرقے خوارج اور شیعہ ہیں۔ شیعوں کی اگرچہ بہت سی شاخیں ہیں، لیکن اتنی بات قریباً سب میں مشترک ہے کہ دین کے معاملہ میں صحابۂ کرام ان کے نزدیک قطعاً قابلِ اعتماد نہیں، بلکہ ان کے اکثر فرقے تو جمہور صحابہ کو معاذ اللہ منافق اور مخربِ دین سمجھتے ہیں اور جو مقام سنّت کا ہونا چاہیئے وہ اُن کے نزدیک ان کے آئمہ کے اقوال و افعال کا ہے، بلکہ واقعہ اُن کے سارے مذہب کی بنیاد ان کے آئمہ کی روایات ہی پر ہے، ان کے بعض فرقوں کے نزدیک تو قرآن مجید بھی مشکوک اور ناقابلِ اعتماد ہے، اس لئے ان کے نزدیک دین کا ماخذ ان کے آئمہ کی روایات ہی ہیں۔

اور خوارج کا حال یہ ہے کہ وہ قرآن مجید کو تو دین کا بالکل محفوظ اور قطعی ماخذ مانتے ہیں اور سنّت کی اہمیت بھی ان کے نزدیک قریب قریب ویسی ہی ہے جیسی کہ اہل السنۃ کے نزدیک ہے، لیکن صحابۂ کرام کے اجتماعی مسلک اور اجماعی فیصلوں کا اتباع جس طرح اہل السنۃ ضروری سمجھتے ہیں وہ نہیں سمجھتے گویا ان کے نزدیک یہ ہو سکتا ہے کہ دین کی کسی حقیقت کو اور قرآن و سنّت کی کسی بات کو سمجھنے میں صحابۂ کرام کی پوری جماعت یا ان کی

بڑی تعداد غلطی کر جائے اور بعد والے اس کو صحیح سمجھیں ۔ لیکن اہل سنت اس خیال کو گمراہی بلکہ سیکڑوں گمراہیوں کا سرچشمہ سمجھتے ہیں ۔

شیعہ اور خوارج کے بعد اسلام کے اُسی ابتدائی دور میں اور بھی بہت سے فرقے پیدا ہوئے ، مثلاً معتزلہ ، جہمیہ ، مرجیہ ، قدریہ ، جبریہ وغیرہ ۔ میں نے جہاں تک سمجھا ہے ، اہل السنۃ والجماعت کے اور ان کے تمام اختلافات کی اصل بنیاد یہی ہے کہ اہل السنۃ ظاہر کتاب وسنت کو مضبوطی سے پکڑتے ہیں اور نصوص کو اپنی ناقص عقل اور رائے کے مطابق کرنے کے لئے ان میں تاویلیں نہیں کرتے اور صحابۂ کرام کے اجتماع اور اتفاق کو دین کے بارے میں قطعی سند اور واجب الاتباع مانتے ہیں اور یہ دوسرے فرقے اپنی عقل ورائے کو اور اپنی صوابدید کو اتنی اہمیت دیتے ہیں کہ اس کی وجہ سے کتاب وسنت کے نصوص میں بھی تاویلیں کرتے ہیں اور صحابۂ کرام کے اجتماعی مسلک سے اختلاف کرنے میں بھی انہیں کوئی دریغ نہیں ہوتا ۔ گویا ان دوسرے فرقوں کے مقابلہ میں اہل السنۃ کا امتیاز اور ان کی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے "ما انا علیہ و اصحابی" یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور صحابۂ کرام کے طریقے کو مضبوطی سے پکڑا ہے وہ اس کے مقابلہ میں اپنی عقل اور رائے کی اور دنیا کے قیل وقال کی پروا نہیں کرتے ۔ بہر حال اہل السنۃ والجماعت اور ان دوسرے فرقوں کے درمیان عقائد اور خیالات میں جتنے بھی اختلافات ہیں وہ سب طرز فکر کے اسی بنیادی فرق کا نتیجہ ہیں ۔

میں مثال کے طور پر اہل السنۃ کے اور ان فرقوں کے بعض اختلافی مسائل کا بھی ذکر کرتا ہوں اس سے طرز فکر کا یہ بنیادی فرق انشاء اللہ اور زیادہ کھل کر آپ

کے سامنے آجائے گا۔

مرتکب کبیرہ کے بارے میں اختلاف اور اُس کی بنیاد خوارج کا مشہور مسئلہ ہے کہ گناہِ کبیرہ کے ارتکاب سے آدمی کافر قطعی کافر ہو جاتا ہے اور آخرت میں اس کا انجام بالکل وہی ہوگا جو کافروں کا ہونے والا ہے، ان کے اس مسئلہ کی بنیاد کتاب وسنّت کے بعض ان نصوص پر ہے جن میں بعض کبیرہ گناہوں پر کفر کا اطلاق کیا گیا ہے یا "لَا اِیْمَانَ"[1] یا "لَیْسَ مِنَّا"[2] یا "لَا سَہْمَ فِی الْاِسْلَامِ"[3] جیسے الفاظ فرمائے گئے، یا لعنت یا عذاب نار کی وعید وارد ہوئی ہے۔

ان کے مقابلہ میں دوسرا فرقہ مُرجیہ ہے جو کہتا ہے کہ آخرت کے عذاب سے بچنے کے لیے صرف ایمان کافی ہے، ایمان لانے کے بعد اگر کوئی شخص عمر بھر کبیرہ گناہ کرتا ہے تو دوزخ میں نہیں جائے گا، بس اتنا ہی ہوگا کہ گناہ نہ کرنے والے اہل ایمان کے مقابلہ میں اس کا مقام اور درجہ کچھ کم ہوگا۔ یہ لوگ اُن نصوص سے استدلال کرتے ہیں جن میں صرف ایمان پر جنت کی بشارت دی گئی ہے اور ان کے خلاف جو نصوص ہیں اُن سب کی تاویل کرتے ہیں، اسی طرح خوارج اُن نصوص کی تاویل کرتے ہیں جو اُن کے مسلک کے خلاف ہیں اور جن سے معلوم ہوتا ہے کہ گناہِ کبیرہ کرنے سے آدمی کافر نہیں ہو جاتا۔

لیکن اصل بات یہ ہے کہ ان دونوں فرقوں کے جو پیشرو تھے جن سے انکا سلسلہ شروع ہوا ہے اس مسئلہ میں ان کا اپنا اپنا ایک خیال اور رجحان تھا، مسلکِ خروج کے بانیوں اور ابتدائی داعیوں کا رجحان بعض خاص تاریخی اسباب کی بنا پر اس طرف تھا

---

[1] اُس میں ایمان نہیں۔ [2] وہ ہم میں سے اور ہماری جماعت میں سے نہیں۔

[3] اس کا اسلام میں کوئی حصہ نہیں۔ ۱۲

کہ گناہِ کبیرہ کے ارتکاب کو کفر قرار دیا جائے اور مرتکبین کبائر کو کافروں میں شمار کیا جائے) اور مُرجیہ کے پیشرووں کا رجحان یہ تھا کہ ایمان کے بعد گناہ کو (اگرچہ وہ کبیرہ ہی کیوں نہ ہو) بہت ہلکی اور معمولی بات سمجھا جائے۔ پس جو نصوص جس فرقہ کو اپنے رجحان اور اپنے خیال کے مطابق نظر آئے اُن کو تو انہوں نے اپنی سند بنا لیا اور جو خلاف نظر پڑے اُن کا یا تو کسی بنیاد پر انکار کیا یا اُن میں تاویل کر ڈالی۔

اور اہلسنت نے بجائے یہ طرز اختیار کرنے کے اپنے اصول کے مطابق یہ دیکھا کہ صحابۂ کرام نے اس مسئلہ کو کس طرح سمجھا اور اُن کا مسلک اس بارے میں کیا تھا؟ بس اُسی کو انہوں نے اختیار کر لیا اور وہ یہ تھا کہ کبائر کا ارتکاب نہ تو بالکل کفر ہے جس کی وجہ سے آدمی اسلام سے بالکل نکل جاتا ہو، جیسا کہ خوارج کہتے ہیں اور نہ ایسی ہلکی اور معمولی بات ہے جیسا کہ مُرجیہ کا خیال ہے، بلکہ وہ موجب عذاب اور موجب لعنت ہے، لیکن اگر اللہ چاہے تو معاف ہو سکتا ہے، بس اسی کو اہل السنۃ والجماعت نے اختیار کر لیا اور اس باب کے تمام نصوص کا مطلب وہی قرار دیا جو صحابۂ کرام نے سمجھا تھا۔

مسئلہ رویت باری تعالیٰ دوسرا مسئلہ جس کا میں بطور مثال ذکر کرنا چاہتا ہوں وہ آخرت میں اللہ تعالیٰ کی رویت کا مسئلہ ہے، صحیح احادیث میں اس کا صاف صاف ذکر آیا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایمان والوں کو بشارت سنائی ہے کہ جنت میں ان کو دوسری نعمتوں کے علاوہ حق تعالیٰ کا دیدار بھی نصیب ہوگا اور اہل ایمان کے لئے یہ نعمت جنت کی باقی سب نعمتوں سے زیادہ خوش کن اور لذت بخش ہوگی۔ قرآن مجید میں ایک جگہ فرمایا گیا ہے:۔

وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ۙ إِلَىٰ رَبِّهَا نَاظِرَةٌ (سورۂ قیٰمہ ع ۱) — یعنی اُس دن کچھ چہرے تر و تازہ اور بارونق اور اپنے رب کی طرف دیکھنے والے ہوں گے۔

جس کا خلاصہ مطلب یہی ہے کہ آخرت میں اللہ کے اطاعت شعار بندوں کے چہرے روشن اور چمکتے ہوئے ہوں گے اور ان کو جمالِ حق کے نظارہ کی دولت نصیب ہوگی۔

معتزلہ کے انکار کی بنیاد معتزلہ جن کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ دین کے بارے میں عقل پر اس سے زیادہ بوجھ ڈالتے ہیں جتنا کہ وہ بیچاری اٹھا سکتی ہے اور جو ہر دینی حقیقت کو اپنی عقل سے سمجھ لینے کے بعد ماننا چاہتے ہیں، چونکہ رویت باری کا مسئلہ ان کی سمجھ میں نہیں آسکا اور ان کی عقلوں نے اس سے انکار کیا، اس لئے وہ اس کے منکر ہوگئے، اُن کے انکار کی اصل بنیاد دراصل ان کا یہ عقلی شبہ ہے کہ آنکھوں سے تو جسم اور رنگ اور سطح رکھنے والی کسی مادّی چیز ہی کو دیکھا جاسکتا ہے اور اس کو بھی جب دیکھا جاسکتا ہے جب کہ وہ آنکھ کے سامنے کی جانب ہو اور لتنے فاصلے پر ہو کہ وہاں تک ہماری نگاہ کام کرسکے، حق تعالیٰ جو مادّہ سے اور مادہ کے تمام خواص سے منزہ ہے اور کسی مکان اور کسی سمت میں نہیں ہے، بلکہ لامکان اور وراء الوراء ہے اُس کو آنکھ سے کیونکر دیکھا جا سکتا ہے۔ بہرحال معتزلہ نے رویت باری کے مسئلہ کو عقل سے نہ سمجھ سکنے کی وجہ سے انکار کر دیا اور نصوص کی تاویلیں کیں اور ان کے مختلف جوابات دیئے اور یہی راہ حضرات شیعہ نے اختیار کی، وہ بھی اس مسئلہ میں معتزلہ ہی کے ہم خیال ہیں۔

اہلسنت کے اثبات کی بنیاد لیکن اہل سنت نے جب دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے احادیث صحیحہ میں اس کی صاف صاف بشارت دی ہے اور صحابہ کرام ؓ نے اُن نصوص سے یہی سمجھا ہے کہ اہل ایمان کو جنت میں حق تعالیٰ کا دیدار نصیب ہوگا اور یہی ان حضرات کا عام عقیدہ ہے تو اہل سنت نے اسی کو اختیار کر لیا اور معتزلہ جیسے عقل پرستوں کے عقلی شبہات کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ بس یہی ہے اہل السنۃ والجماعت

اور دوسرے فرقوں کے طرزِ فکر کا بنیادی فرق۔

اس سے آپ کو یہ شبہ نہ ہو کہ اہل السنّۃ کا مذہب خلافِ عقل ہے، واقعہ یہ ہے کہ اہل السنّۃ والجماعت کا ایک عقیدہ اور ایک مسئلہ بھی عقل کے خلاف نہیں ہے، الحمد للہ متکلمین اہل سنّت نے اسی شبہ کے دور کرنے کے لئے ایک ایک مسئلہ کی معقولیت بھی نہایت روشن دلائل سے ثابت کر کے دکھادی ہے۔

اسی رویت باری کے مسئلہ کو دیکھئے، اہل سنّت نے اُس کے منکرین اہل اعتزال اور اہل تشیع کے عقلی شبہات کے ایسے نفیس جوابات دیئے ہیں کہ عقل سلیم بالکل مطمئن ہوجاتی ہے، اگر کسی کو اس مسئلہ کی تفصیلی بحث دیکھنی ہو تو ردِ شیعہ میں حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کی مشہور کتاب "تحفۂ اثنا عشریہ" میں دیکھ لی جائے، یا مولانا عبدالحق صاحب حقانی دہلویؒ کی کتاب "عقائد الاسلام" کا مطالعہ کر لیا جائے۔

اس سلسلہ میں ایک مختصر سی بات میں یہاں بھی ذکر کئے دیتا ہوں تاکہ آپ میں سے کسی کے دل میں اگر کوئی خلجان ہو تو اس کا ازالہ ہو جائے۔

معتزلہ کے عقلی شبہ کا جواب معتزلہ کے عقلی شبہ کی بنیاد اس چیز پر ہے کہ اس دنیا میں کسی چیز کو دیکھنے کا جو طریقہ اور جو قانون ہے اور اس کے جو شرائط ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ کسی چیز کو دیکھنا ان کے بغیر ممکن ہی نہیں، حالانکہ یہ بنیاد ہی سرے سے غلط ہے، خود معتزلہ بھی اس سے انکار نہیں کر سکتے کہ اللہ تعالیٰ اپنی تمام مخلوقات کو دیکھتے ہیں، مادی کو بھی اور غیر مادی کو بھی اور چونکہ اللہ تعالیٰ خود ورار الوراء ہیں، اسلئے کسی مخلوق کے متعلق بھی نہیں کہا جاسکتا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی محاذاۃ میں یعنی اس کے سامنے اور اس کی سیدھ میں ہے، لیکن اس کے باوجود اللہ تعالیٰ سب کو دیکھتے ہیں، پس معلوم ہوا کہ معتزلہ

رویت کے جس قانون کو قانون کُلّی سمجھتے ہیں وہ دراصل کُلّی نہیں ہے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ جو محدود قوتِ بینائی اس دنیا میں ہماری آنکھوں کو دی گئی ہے، اُس کا یہ حال ہے کہ وہ عام طور سے صرف مادی چیزوں کو دیکھتی ہے اور وہ بھی جب کہ وہ ہمارے سامنے ہوں اور ایک محدود فاصلہ پر ہوں ۔ پس اس بنیاد پر آخرت میں اللہ تعالیٰ کی رویت کا انکار کرنا ہرگز صحیح نہیں ہے کیونکہ وہاں اہل جنت کی تمام قوتوں میں ہزاروں لاکھوں گنا اضافہ ہوگا پس وہاں قوتِ بینائی بھی وہ بخشی جائے گی جو حق تعالیٰ کے دیدار کی بھی لذت لے سکے۔

اسی دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ بعض تدبیروں سے اور خورد بین اور دوربین جیسے آلات کی مدد سے اب وہ چیزیں دیکھی جاتی ہیں جن کو دیکھنے کا لوگ پہلے تصور بھی نہیں کر سکتے تھے پس اس میں کچھ بھی استبعاد نہیں کہ اللہ تعالیٰ اہل جنت کو وہ قوتِ بینائی نصیب فرمادیں جس سے حق تعالیٰ کی بھی رویت ہوسکے۔

بہرحال معتزلہ وغیرہ نے جس عقلی شبہ کی بنا پر رویت باری کے مسئلہ سے انکار کیا تھا اس میں پہلے بھی کوئی جان نہیں تھی اور اب اس زمانہ کی نئی ایجادوں اور نئے انکشافات نے تو اس قسم کے تمام احمقانہ شبہات کا خاتمہ کر دیا ہے، آج ایسی ہزاروں چیزیں بازاروں میں دکان دکان بک رہی ہیں جن کا اگر کوئی شخص اب سے پانچ سو برس پہلے ذکر کرتا تو لوگ بالکل ناممکن سمجھتے ۔ میں کہا کرتا ہوں کہ اب اس زمانہ میں کسی دینی حقیقت کے متعلق کسی کا یہ کہنا کہ یہ ہماری عقل میں نہیں آتی اس لئے ہم اس کو نہیں مانتے، اپنی انتہائی بے عقلی کا اعلان کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا تھا:۔

"سَنُرِيهِمْ اٰيٰتِنَا فِى الْاٰفَاقِ وَفِىْٓ ہم ان کو آفاق میں اور خود ان کے اندر اپنی

أَنْفُسِهِمْ ۔ (حم سجدہ ع ۶)   نشانیاں دکھائیں گے۔

ہمارے اس زمانہ کی ایجادات نے سیکڑوں اُن مسئلوں کا سمجھنا لوگوں کے لئے آسان کردیا ہے جن کو لوگ اپنی حماقت سے خلافِ عقل سمجھا کرتے تھے۔

بات اپنی جگہ سے بہت دور چلی گئی، میں آپ حضرات کو صرف یہ بتانا چاہتا تھا کہ معتزلہ وغیرھم نے رویت باری کا انکار صرف اس لئے کیا کہ ان کی عقل اس کے سمجھنے سے قاصر رہی اور اہل سنت نے صرف یہ دیکھ کر اس کو مان لیا اور بطور عقیدہ کے قبول کرلیا کہ ظاہر نصوص سے انہوں نے یہی سمجھا اور صحابۂ کرام کو انہوں نے اسی عقیدہ پر پایا۔

مسئلہ جبر و قدر | اسی طرح قدریہ اور جبریہ نے جبر و قدر کے مسئلہ میں اپنے رجحانات اور اپنے عقلی قیاسات کی بنا پر قدر یا جبر کا مسلک اختیار کیا اور جن نصوص کو انہوں نے اپنے خیال اور اپنے رجحان کے کچھ موافق سمجھا، ان کو اپنے اس عقیدہ کی سند بنایا اور جو نصوص صراحۃً ان کے خلاف تھے، اُن کا یا کسی حیلہ سے انہوں نے انکار کیا، یا اُن میں تاویلیں کیں، لیکن اہل سنت نے ظواہر نصوص اور صحابۂ کرام کے مسلک کی تقلید کی، انہوں نے دیکھا کہ صحابۂ کرامؓ دنیا کی ہر چیز کو اور بندوں کے بھی تمام احوال اور اعمال کو اللہ کی قضا و قدر سے مانتے ہیں، اور بندہ کو اپنے اعمال میں صاحبِ ارادہ ماننے کے باوجود مختار مطلق نہیں مانتے جیسا کہ قدریہ کہتے ہیں اور نہ اس کو جمادات اور نباتات کی طرح مجبورِ محض مانتے ہیں جیسا کہ جبریہ کا خیال ہے پس اسی کو انہوں نے اپنا مسلک اور عقیدہ بنایا اور اس سلسلہ کے تمام نصوص کا مطلب وہی قرار دیا جو صحابۂ کرامؓ نے سمجھا تھا اور وہی ظاہر مطلب بھی تھا۔

الغرض دوسرے تمام فرقوں کے مقابلہ میں اہل السنۃ والجماعت کا امتیاز اور

ان کا شعار یہی ہے کہ وہ صحابۂ کرامؓ کے اجتماعی مسلک کو واجب الاتباع سمجھتے ہیں اور اُن کا بنیادی اُصول یہی ہے کہ دین کی جس حقیقت کو اور کتاب و سنّت کی جس بات کو صحابۂ کرامؓ کی جماعت نے جس طرح سمجھا اور مانا اور ان کے درمیان اس میں اختلافِ رائے نہیں ہوا، اس کو اسی طرح سمجھنا اور ماننا ضروری ہے اور کسی کے لئے اس میں اختلافِ رائے کی اور نئے سرے سے اُس پر غور کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے ایک مکتوب میں طریقۂ اہلِ سنّت کی وضاحت

حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ نے اپنے ایک مکتوب میں جس کو محدثین نے سند کے ساتھ روایت کیا ہے، اہل السنۃ کے اس مسلک کی بڑی واضح ترجمانی کی ہے۔ کسی شخص نے اسی قضا و قدر کے مسئلے کے متعلق ان سے سوال کیا تھا۔ آپ نے جواب میں پہلے تو تقویٰ اور اللہ و رسول کی اطاعت اور سنّت کے اتباع و التزام کی تاکید فرمائی اور اس کے بعد تحریر فرمایا:۔

• فَارْضَ لِنَفْسِكَ مَا رَضِيَ بِهِ الْقَوْمُ لِاَنْفُسِهِمْ فَاِنَّهُمْ عَلٰى عِلْمٍ وَقَفُوْا وببصر نافذ كَفُّوْا وَلَهُمْ على كشف الامور كانوا اقوىٰ وَبِفَضْلِ ما كَانُوْا فيه اولىٰ فَاِنَ الْهُدٰى مَا اَنْتُمْ عَلَيْهِ لَقَدْ سَبَقْتُمُوْهُمْ اِلَيْهِ ؎

"مطلب یہ ہے کہ صحابۂ کرامؓ کی جماعت نے اپنے لئے جو خیال اور عقیدہ پسند کیا اور جس کو انہوں نے اپنایا تم بھی اسی کو اپنے لئے پسند کرو اور اس کو اپنا مسلک بناؤ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو علم لائے تھے، صحابۂ کرامؓ اُس سے پوری طرح واقف تھے اور دین

کے بارے میں انہیں وہ گہری بصیرت حاصل تھی جس سے ہر مسئلہ کی تہہ تک پہنچتے تھے اور دینی حقیقتوں کے سمجھنے پر وہ ہم سے زیادہ قادر تھے، اور دین کے علم و فہم میں وہ دوسروں سے بہت زیادہ فضیلت رکھتے تھے۔ پھر بھی اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ (اپنے اس خیال میں جو تم نے صحابۂ کرامؓ کے خلاف قائم کیا ہے) تم راہِ راست پر ہو تو گویا اس کے مدعی ہو کہ تم دین میں صحابۂ کرامؓ کی پوری جماعت سے آگے بڑھ گئے ہو، ظاہر ہے کہ یہ کس قدر احمقانہ اور گمراہانہ بات ہے۔"

اس کے بعد چند سطروں میں نفس مسئلہ کو بیان فرمایا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سی حدیثوں میں مسئلہ تقدیر کو بیان فرمایا ہے اور صحابۂ کرامؓ نے آپ ہی سے اس عقیدے کو لیا اور آپ کی حیات میں آپ کے سامنے اور آپ کی وفات کے بعد یہی ان کا عقیدہ اور ان کا یقین رہا اور وہ اسی کو دوسروں کے سامنے بیان کرتے رہے اور کتاب اللہ سے بھی انہوں نے یہی سمجھا ہے کہ دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے اور ہم جو کچھ کرتے ہیں وہ سب پہلے سے اللہ کے علم میں ہے اور لوحِ محفوظ میں مکتوب ہے اور تقدیرِ الٰہی اس کا فیصلہ کر چکی ہے۔ یہ سب لکھنے کے بعد آخر میں تحریر فرماتے ہیں:-

" ولئن قلتم لم انزل اللہ اٰیۃ کذا ولم قال کذا ؟
لقد قرأوا منہ ما قرأتم وَعَلِمُوْا مِنْ تَاْوِیْلِہٖ مَاجَھِلْتُمْ
وَقَالُوْا بعد ذالک کلہ بکتاب وقدر[1]

---

[1] ابوداؤد کتاب السنۃ، باب فی لزوم السنۃ - ۱۲

> مطلب یہ ہے کہ اگر تم قرآن مجید کی بعض آیات کو اس کے خلاف پاتے ہو اور اپنی دانست میں تم ان آیتوں کو مسئلہ تقدیر کے خلاف سمجھتے ہو تو یہ تو سوچو کہ یہ سب آیتیں قرآن مجید میں صحابہ کرامؓ نے بھی پڑھی تھیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و تربیت اور آپ کے فیضِ صحبت سے وہ قرآن کو تم سے بہتر سمجھنے والے تھے، اس کے باوجود وہ اس مسئلہ تقدیر کے قائل ہوئے پس اس سے تمہیں خود سمجھ لینا چاہیئے کہ تم ان آیتوں کا مطلب سمجھنے میں غلطی کھا رہے ہو۔"

پس اہل السنۃ والجماعت کا مسلک اور ان کا بنیادی اصول بالکل یہی ہے جو حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ نے اپنے اس مکتوب میں بیان فرمایا ہے یعنی دین کے بارے میں جماعتِ صحابہ پر پورا اعتماد کرنا اور ان کے مقابلہ میں اپنے علم و فہم کو ناقص اور نارسا سمجھتے ہوئے ان کے اجتماعی مسلک اور اجماعی فیصلوں کی پوری پوری تقلید کرنا۔ اس طریقہ میں بڑی سلامتی اور بڑی حفاظت ہے اور جمہور اُمّت کا مسلک یہی رہا ہے اور یہی وہ صحیح مسلک ہے جس کو حدیث شریف میں "ما انا علیہ واصحابی" فرمایا گیا ہے۔

سلف صالحین کے اتباع ہی میں فتنوں سے حفاظت ہے، دراصل بعد والوں کے لئے خیریت اسی میں ہے کہ وہ اپنے سلف صالحین کا اتباع کریں جب آدمی اس سے آزاد ہو جاتا ہے تو شیطان اُس کو آسانی سے کسی گمراہی اور فتنہ میں مبتلا کر سکتا ہے، جن لوگوں نے سلف صالحین کا دامن مضبوطی سے تھام لیا، وہ ہر قسم کے فتنوں سے محفوظ رہے اور جنہوں نے اپنی عقل اور اپنے فہم و علم پر زیادہ بھروسہ کیا اور سلف کے اجماعی فیصلوں کی بھی پابندی ضروری نہ سمجھی، وہ شیطان کا شکار

ہو گئے۔ جتنے گمراہانہ خیالات اور گمراہ فرقے پہلے پیدا ہوئے، یا اب ہمارے زمانے میں پیدا ہو رہے ہیں، وہ سب سلف صالحین کے مقابلہ میں اپنے علم و فہم پر زیادہ اعتماد کرنے اور ان کے اتباع سے اپنے کو آزاد سمجھنے ہی کا نتیجہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمارے بزرگانِ اہلِ سنّت کو جزائے خیر دے، انہوں نے اس راز کو خوب سمجھا اور صحابۂ کرام اور ان کے طریقہ پر چلنے والے سلفِ صالحین کے اتباع کو اتنی اہمیت دے کر جمہورِ امت کو شیطان کے جال میں پھنسنے سے بچا لیا۔

اس زمانہ میں سلفِ صالحین کا اتباع ہمیشہ سے زیادہ ضروری ہے،

خاص کر ہمارے اس زمانہ میں جب کہ آزاد خیالی کی وبا عام ہے اور بہت سے لوگ صرف اُردو کے رسالے پڑھ پڑھ کر دین کے بارے میں بالکل مجتہدانہ بلکہ آزادانہ طور پر غور کرنے کا اپنے کو حقدار سمجھنے لگتے ہیں تو اس وقت تو ہمیشہ سے زیادہ اتباعِ سلف کے اس اصول پر مضبوطی سے جمنے کی اور دوسروں کو جمانے کی ضرورت ہے، ہر فتنہ اور ہر گمراہی سے اس میں حفاظت ہے اور اسی میں سلامتی ہے۔

ایک گمراہ کن مغالطہ اس جگہ ایک مغالطہ کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے:۔

بعض لوگ جن کی نظر میں سلف کے اتباع کی اتنی اہمیت نہیں ہے، وہ کہا کرتے ہیں کہ اصل چیز بس قرآن و حدیث ہے اور دین میں ہم قرآن و حدیث کے سوا کسی چیز کو سند نہیں مانتے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ فقرہ بہت چست اور بہت چلتا ہوا ہے اور فی نفسہٖ صحیح بھی ہے، لیکن یہ لوگ اس کو بہت غلط معنیٰ میں استعمال کرتے ہیں، گویا اب یہ "كَلِمَةُ حَقٍّ أُرِيْدَ بِهِ الْبَاطِلُ" کے قبیل سے ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ سب ایمان والوں کے نزدیک دین کا اصل ماخذ کتاب و سنّت

ہی ہیں، لیکن کتاب وسنت کوئی بولتے ہوئے انسان تو ہیں نہیں کہ ہم جا کر اُن سے کوئی سوال کریں اور وہ ہم کو ہماری زبان میں فوراً جواب دیدیں، بلکہ کتاب وسنت سے کسی چیز کو معلوم کرنے کی صورت یہی ہو سکتی ہے کہ کوئی شخص جو کتاب وسنت کی زبان اور اُن کے اسلوب بیان سے پوری واقفیت رکھتا ہو، دین کے مقصد و مزاج اور تشریع کے اصول کا بھی پورا واقف اور ماہر ہو، وہ غور کرے اور کتاب وسنت کے مقصد و منشا کو سمجھے اب ہم لوگ جو دین کے فہم میں بھی سلف صالحین کی برتری کے قائل ہیں اور اس لئے ان کے اتباع میں سلامتی سمجھتے ہیں ہمارا اصول اور طریقہ کار تو یہ ہے کہ جب ہمیں یہ معلوم ہو جائے کہ سلف صالحین نے اس بارہ میں کتاب و سنت کا مقصد و منشا یہ سمجھا ہے اور ان سب کا یا جمہور سلف کا یہ متفقہ مسلک ہے تو ہم صرف اسی کو صحیح سمجھتے ہیں اور اسی کا اتباع ضروری جانتے ہیں اور اُس کے خلاف ہر نئی رائے کو تسویل شیطانی سمجھتے ہیں۔ اور جو لوگ سلف صالحین کا اتباع نہیں چاہتے اور جن کو ان کے علم وفہم سے زیادہ اپنے علم وفہم پر اعتماد ہے وہ اپنی رائے اور اپنی سمجھ کا اتباع کرتے ہیں اور کتاب وسنت کا نام لے کر دوسروں کو بھی اسی کے اتباع کی دعوت دیتے ہیں۔ پس ہمارے اور ان کے طرز فکر اور طرز عمل میں فرق یہ نہیں ہے کہ وہ دین میں اصل سند کتاب وسنت کو قرار دیتے ہیں اور ہم سلف صالحین کو ـــــ بلکہ یہ ہے کہ ہم کتاب وسنت کا منشا متعین کرنے کے بارے میں سلف صالحین کے فہم وفکر کو زیادہ قابل اعتماد سمجھتے ہیں اور وہ اپنے خیالات اور اپنے فہم پر زیادہ بھروسہ کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ دوسرے لوگ بھی بجائے سلف کے انکی تقلید کریں۔

خوارج کا قرآنی نعرہ اور حضرت علیؓ کا جواب گویا بالکل وہی معاملہ ہے جو خوارج اور سیدنا حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے درمیان پیش آیا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت کا مشہور واقعہ ہے کہ ایک جگہ خوارج کا مجمع تھا، امیر المؤمنین حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ ان کو سمجھانے کے لئے تشریف لے گئے، خوارج نے شور مچایا کہ ہم بس کتاب اللہ کی مانیں گے، ہم سے جو کچھ منوانا ہو قرآن سے منواؤ، ہم قرآن کے سوا کچھ نہیں سننا چاہتے (جیسا کہ آج کل کے بھی بہت سے گمراہ فرقے ایسے ہی نعرے لگایا کرتے ہیں)۔ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے قرآن مجید کا طویل و عریض ضخیم نسخہ لیا اور اُن لوگوں کے سامنے اس پر ہاتھ مار کے فرمایا۔

"اَیُّھا المصحف حدِّث النَّاس! یعنی اے قرآن بول! یہ لوگ جس معاملہ

اَیُّھا المصحف حدِّث النَّاس! میں جھگڑ رہے ہیں ان کو اس کی حقیقت بتلا!

حضرت علی مرتضیٰ نے اس مصحف پر ہاتھ مار کے بار بار یہی فرمایا۔

اس پر خوارج ہی میں سے بعض لوگوں نے کہا کہ اے امیر المؤمنین! یہ مصحف تو کاغذ ہے اور روشنائی سے لکھے ہوئے حروف ہیں، یہ تو کوئی بولنے والی چیز نہیں ہے جو بولے اور جواب دے۔ اس کے بعد حضرت علی مرتضیٰؓ نے ان لوگوں کو قرآن مجید ہی کی آیات ہی سے مسئلہ کی حقیقت سمجھائی، اُن کے اشکالات کا جواب دیا اور ان کے باطل خیالات کا تفصیلی رد کیا[1] گویا اسطرح انہیں بتلایا کہ قرآن کی پیروی کی صورت یہی ہے کہ جو قرآن کے جاننے والے اور سمجھنے والے ہیں وہ جو کچھ قرآن سے سمجھ کر بتلائیں اسکی

---

[1] اس واقعہ کا تفصیلی بیان البدایہ والنہایہ صفحہ ۲۷۵ میں دیکھا جائے۔

پیروی کی جائے۔

اس واقعہ سے مجھے صرف یہ بتلانا تھا کہ ہمارے اس زمانہ کے جو لوگ اور جو نئے فرقے اتباعِ سلف کے اصول کے قائل نہیں اور کہتے ہیں کہ ہم صرف کتاب و سنت کو مانتے ہیں، دراصل ان کی ذہنیت بالکل وہی ہے جو اُن خوارج کی تھی اور وہ لوگوں کو سلف کے اتباع سے توڑ کر اپنے متبعین میں داخل کرنا چاہتے ہیں اور جو سادہ لوح ان کی بات مانتے ہیں وہ درحقیقت سلفِ صالحین کے اتباع سے آزاد ہو کر خود ان کے متبع اور مقتدی بن جاتے ہیں اور اسی سے امت میں نئے نئے فرقے اور نئے نئے گروہ پیدا ہوتے ہیں۔

بہرحال دین کے بارے میں سلفِ صالحین پر اعتماد اور ان کا اتباع ہمارے نزدیک نہایت ضروری ہے اور اسی میں عام مسلمانوں کے دین و ایمان کی حفاظت ہے۔

فقہی مسائل میں تقلید یہ ساری گفتگو تو ایمانیات اور عقائد میں تھی، فروع اور فقہی مسائل میں بھی ہمارے نزدیک آئمہ حق کی تقلید اور سلف کے اتباع ہی میں سلامتی ہے خصوصاً ہمارے اس زمانے میں جب کہ اجتہاد اتنا آسان اور اتنا ارزاں ہو گیا ہے کہ جو لوگ قرآن و حدیث کے اُردو ترجمے بھی اچھی طرح نہیں سمجھ سکتے وہ بھی اپنے کو اجتہاد کا حقدار سمجھتے ہیں[1]۔

---

[1] حضرت شاہ ولی اللہؒ اگرچہ مجتہدانہ طرزِ فکر رکھتے ہیں، لیکن "حجۃ اللہ البالغہ" میں اس مسئلہ پر کلام کرتے ہوئے صاف فرماتے ہیں:۔ ان ھذہ المذاھب الاربعۃ المدونۃ المحررۃ قد اجتمعت الامۃ او من یعتد بہ منھا علی جواز تقلیدھا الی یومنا ھذا وفی ذالک من المصالح مالا یخفی سیما فی ھذہ الایام التی قصرت فیھا الھمم (بقیہ اگلے صفحہ پر)

جو حضرات اہل علم کسی خاص فقہی مسلک کی تقلید پر مطمئن نہیں ہیں ان کے لئے بھی اتنا تو نہایت ہی ضروری ہے کہ جن مسائل پر آئمہ مجتہدین خصوصاً آئمہ اربعہ غور کر کے متفق ہو چکے ہیں، ان میں کوئی نئی راہ اختیار نہ کریں اور جن مسائل میں ان حضرات کے درمیان اختلاف ہے ان میں بھی ان سب سے الگ کوئی نئی رائے قائم نہ کی جائے۔ اس اصول کی پابندی نہ کرنے میں سخت بے احتیاطی اور خود رائی بھی ہے اور امت میں اس سے انتشار بھی پیدا ہوتا ہے خصوصاً اللہ کے وہ بندے جو اس اُمّت کی کچھ دینی خدمت بھی کرنا چاہتے ہیں اُن کے لئے تو بالخصوص ضروری ہے کہ وہ اپنے خیالات اور اپنے طرزِ عمل سے اُمت میں انتشار نہ پیدا کریں اور لوگوں کو اپنے سے بدگمان اور دور کرنے والی باتوں سے بچیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے "فیوض الحرمین" میں ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (مدینہ طیبہ کے زمانۂ قیام میں) مجھے تین ایسی باتوں کی تاکید اور وصیت فرمائی جو میرے ذاتی رجحان اور طبعی میلان کے خلاف تھیں۔ اُن میں سے ایک فقہی مسائل میں ان مذاہب اربعہ کی تقلید کا مسئلہ بھی تھا۔

اس کی خاص حکمت یہی تھی کہ ہندوستان میں حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے سلسلہ کو دینی اصلاح کا جو کام کرنا تھا اس کے لئے یہ ضروری تھا کہ عوام

(ص ۱۳۱ کا بقیہ حاشیہ) جدا اذا شربت النفوس الھوی واعجب کل ذی رای برایہ۔ (ص ۱۵۳ ج ۲) مطلب یہ ہے کہ مذاہب اربعہ کی تقلید جائز اور صحیح ہونے پر پوری امت کا یا کم از کم قابل اعتبار علماء کا اجماع ہے خصوصاً ہمارے اس زمانہ میں جب کہ علم کم ہے اور ہوا پرستی اور خود رائی زیادہ تو ان مذاہب کی تقلید میں دین کی بڑی حفاظت اور مصلحت ہے۔ ۱۲

دین ومذہب کے بارے میں ان سے برگشتہ اور بدگمان نہ ہوں اور آن پر اعتماد کریں۔ بہرحال ہم جیسوں کے لئے تو یہ نہایت ہی ضروری ہے۔ اس وقت اُمت جس حال میں ہے اُس کو ہمارے نئے نئے اجتہادات کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اُس میں ایمان اور ایمان والی زندگی پیدا کرنے کے لئے عملی جدوجہد کی اور اس راستے میں اپنی جانوں کے بے قیمت کرنے کی ضرورت ہے۔

ایمانیات وعقائد اور دینی طرزِ فکر کے متعلق جو کچھ اب تک عرض کیا گیا ہے، امید ہے کہ انشاء اللہ وہ اس باب میں کافی وشافی ہوگا۔ اب آگے شریعت کے دوسرے عملی شعبوں کے متعلق بھی اسی انداز میں اصولی طور پر کچھ عرض کرنا ہے۔ واللہ الموفق۔

عملی شریعت

اس سلسلہ کے شروع ہی میں عرض کیا گیا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو دینی تعلیم اللہ تعالیٰ کی طرف سے لائے، اس کا ایک حصّہ تو وہ ہے جس کا تعلق عقائد و افکار سے ہے جس کا بقدرِ ضرورت بیان کیا جا چکا۔ اور دوسرا حصّہ وہ ہے جس کا تعلق اعمال و اخلاق سے ہے۔ کبھی کبھی صرف اسی حصّے کیلئے شریعت کا لفظ بولا جاتا ہے۔

شریعت کے شعبے اور اس کے چند شعبے ہیں ـــــ عبادات ـــــ اخلاق ـــــ معاملات و معاشرت ـــــ دینی جدوجہد ـــــ اور سیاست و حکومت۔

عبادات کی خصوصی اہمیت جس طرح امہات العقائد کو دوسرے عقائد کے لحاظ سے خاص اہمیت حاصل ہے اسی طرح شریعت کے دوسرے شعبوں کے مقابلے میں عبادات کو خصوصی اہمیت حاصل ہے کیونکہ عبد اور معبود کا تعلق، دوسری سب چیزوں کی بہ نسبت عبادات سے زیادہ ظاہر ہوتا ہے اور زندگی کے دوسرے شعبوں کی اصلاح اور درستی میں بھی عبادات کو خاص دخل ہے۔

عبادات کے متعلق جو کچھ یہاں عرض کیا جاتا ہے، اُس سے پہلے آپ عبادت

کا مطلب سمجھ لیجئے :۔

عبادت سے کیا مراد ہے؟ عبادت سے مراد خاص وہ اعمال ہیں جو بندہ اللہ تعالیٰ کی عظمت و کبریائی اور اس کے سامنے اپنی عاجزی اور بیچارگی اور بندگی اور سرافگندگی ظاہر کرنے کے لئے کرتا ہے اور اس سے اُس کا مقصد صرف اللہ کی رضا اور اس کا تقرب حاصل کرنا ہوتا ہے۔ عربی میں ان عبادات کو قُربات بھی کہتے ہیں۔ جیسے :۔ نماز، روزہ حج، زکوٰۃ و صدقات، ذکر و تلاوت، قربانی جیسے تعبدی اعمال جو صرف اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لئے اور اپنے روحانی پہلو کی درستی اور ترقی کے لئے کئے جاتے ہیں اور وہ صرف عبد و معبود کے تعلق کو ظاہر کرتے ہیں۔

عبادت کا مقصد عبادت کا ایک تعلق معبود سے ہے اور ایک عبد سے ہے۔ یہ بات تو صاف ظاہر ہے کہ ہماری عبادات سے معبود کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا اور اس کی شان میں ذرہ برابر اضافہ نہیں ہوتا۔ ایک حدیث میں آتا ہے کہ :۔

"اگر سارے انسان اور سب اولین و آخرین اعلیٰ درجہ کے متقی اور عبادت گذار ہو جائیں تو اللہ کی شان اور اس کی عظمت و کبریائی میں ذرہ برابر زیادتی نہیں ہوگی اور اگر سب کے سب بدترین قسم کے نافرمان اور پورے شیطان بن جائیں تو اللہ تعالیٰ کی شان میں اور اس کی عظمت و جلال میں ذرہ برابر کمی نہیں آئے گی۔"

بہرحال ہماری عبادات سے اللہ تعالیٰ کو ذرہ برابر کوئی فائدہ نہیں پہنچتا اور نہ اُس کی شان کبریائی میں کوئی اضافہ ہوتا ہے بلکہ ہماری عبادتیں دراصل صرف ہمارے ہی فائدے اور ہماری ہی تکمیل کے لئے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے ہمیں عبادت کا حکم صرف اسلئے

دیا ہے کہ اُس کے ذریعہ ہم ترقی کریں اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنے تعلق کو بڑھائیں اور اس کی خاص رضا اور رحمت کے مستحق بنیں۔

اصل بات یہ ہے کہ بندے میں اور مولا میں کوئی مناسبت ہی نہیں، کہاں زمین و آسمان کا خالق و مالک حق تعالیٰ شانہٗ اور کہاں ایک ناپاک بدبودار قطرے سے پیدا ہونے والا اور گندے خون سے بننے والا انسان، حقیقت یہ ہے کہ زمین پر رینگنے والے ایک گھنونے حقیر کیڑے اور دنیا کے بڑے سے بڑے بادشاہ میں جو نسبت ہے، بندہ میں اور مولا میں وہ بھی تو نہیں ہے۔ بس اس کی صورت یہی ہے کہ اس کی انتہائی برتری اور کبریائی اور اُس کے سامنے اپنی انتہائی ذلت و پستی اور عاجزی و بیچارگی اور عبدیت و فنائیت کا اعتراف اور اپنے عمل سے اس کا اظہار کرے، بس یہی چیز بندے کو پاک اور بلند کر کے اللہ کا مقرب اور محبوب بنا دیتی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ سے قریب ہو جاتا ہے۔

انسان کے روحانی اور ملکوتی پہلو کا نشوونما عبادت سے ہوتا ہے

اس کی تفصیل یہ ہے کہ انسان میں دو پہلو ہیں، ایک مادیت اور بہیمیت کا اور ایک روحانیت اور ملکوتیت کا اور پیدا کرنے والے کے ساتھ اُس کا خاص تعلق ملکوتی اور رُوحانی پہلو سے ہے اور انسان کا یہی پہلو اصل قیمتی پہلو ہے، جس کی وجہ سے انسان اشرف المخلوقات ہے، دنیا میں انسان جو کھاتا پیتا ہے اور اس قسم کی اپنی جو دوسری خواہشیں پوری کرتا ہے، اُس سب کا تعلق اُس کے بہیمی اور مادی پہلو سے ہے، جو انسان میں اس سفلی عالم کا حصہ ہے اور جس میں دوسرے حیوانات بھی انسان کے شریک ہیں اور اس لئے اس کھانے پینے سے اور اس طرح کے دوسرے کاموں سے براہِ راست اس

مادی اور بہیمی پہلو کا نشوونما ہوتا ہے۔ روحانی پہلو جو انسان میں عالم ملکوت کا حصہ ہے اور جس کی وجہ سے وہ دوسرے حیوانات سے ممتاز ہوتا ہے، اس کی ترقی اور اس کے نشوونما کا ذریعہ عبادات ہیں۔ عبادات ہی کے ذریعہ انسان ملاء اعلیٰ سے ایک خاص مناسبت اور ربط پیدا کرتا ہے، گویا عبادت نہ کرنے والے انسان کی حیثیت صرف ایک ترقی یافتہ اور بولتے چلتے جانور کی ہے، بلکہ وہ دوسرے جانوروں سے بدتر ہے (اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ) اور اللہ کی عبادت کرنے والے انسان کی حیثیت ایک ایسی مخلوق کی ہے جس کا قالب اگرچہ مادی ہے اور اس عالم کا ہے لیکن اس کی روح فرشتوں کی ہے اور وہ اگرچہ اس زمین پر چلتا ہے اور اس کا مادہ اگرچہ اسی عالم سفلی کا ہے لیکن اُس کی رُوح ملاء اعلیٰ کی ہے اور اس کو اپنے پیدا کرنے والے سے خاص ربط ہے۔

بہر حال انسان کے رُوحانی اور ملکوتی پہلو کی نشوونما عبادات ہی سے ہوتی ہے اور عبادات ہی عالم ملکوت اور ملاء اعلیٰ سے ربط اور مناسبت پیدا کرنے کا خاص ذریعہ ہے۔ عبادات کے علاوہ دین کے جو دوسرے احکام ہیں، اگرچہ اُن سب کی تعمیل میں بھی اجر و ثواب ہے، یعنی اخلاق میں بھی اجر و ثواب ہے اور جو معاملات اور جو برتاؤ کسی کے ساتھ اللہ کے حکم کے مطابق کیا جائے، اُس میں بھی اجر و ثواب ہے، اسی طرح دین کی جدوجہد بھی بڑے اجر و ثواب کی چیز ہے، بلکہ انشاء اللہ آگے اپنے موقع پر آپ کو معلوم ہوگا کہ بعض پہلوؤں سے دین کے ان دوسرے شعبوں کی عبادات سے بھی زیادہ اہمیت ہے لیکن ملاء اعلیٰ سے ربط اور مناسبت پیدا کرنے کی جو تاثیر اور انسان کے روحانی اور ملکوتی پہلو کی ترقی اور تکمیل کی جو خاصیت عبادات میں ہے وہ کسی دوسرے عمل میں نہیں ہے۔

اور اس کی وجہ یہ ہے کہ دوسرے تمام اعمال اگرچہ وہ اللہ کے حکم کے مطابق کئے جائیں اور ہماری نیت بھی حکم الٰہی کی تعمیل کی اور رضاء الٰہی حاصل کرنے کی ہو لیکن ان کا تعلق مخلوق سے بھی ہوتا ہے "مثلاً:- اخلاق، معاملات، معاشرت، سیاست و حکومت، تعلیم وتعلم، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر، ان سب اعمال کا رُخ مخلوق کیطرف ہے، خالق کے ساتھ ان کا تعلق اتنا ہی ہے کہ یہ بھی اُس کے احکام ہیں۔ لیکن عبادات کا تعلق براہ راست صرف معبود سے ہے اور اس میں بندے کا رُخ صرف اللہ کیطرف ہوتا ہے غیر کی اس میں کہیں لگاوٹ ہی نہیں ہے، یہی عبادات کا امتیاز ہے اور دین میں عبادات پر زیادہ زور دینے کا یہی راز ہے۔

عبادات کے بارے میں مادّیت زدہ لوگوں کی غلط فہمی جن لوگوں کی فکر و نظر پر مادیت زیادہ غالب آچکی ہے وہ عبادات کے اس امتیاز کو نہیں سمجھ سکے، اس لئے انہوں نے عبادات میں بھی وہ فائدے ڈھونڈے جن کا تعلق اس عالم محسوسات سے ہے، یہاں تک کہ "عنایت اللہ مشرقی" جیسے بعض لوگ تو اس قدر نیچے گرے کہ نماز جیسی عبادت کو بھی جو در اصل انسانی روح کے لئے اللہ تعالیٰ کے حضور میں حاضر ہونے اور اس مادی عالم سے کٹ کر کچھ وقت کے لئے عالم تجرد اور ملاء اعلیٰ سے وابستہ ہو جانے کا خاص الخاص ذریعہ ہے، انہوں نے اس کو قواعد پریڈ قسم کی ایک ورزش قرار دیدیا اور کہا کہ اس سے ڈسپلن پیدا ہوتا ہے، پابندیٔ وقت کی عادت پڑتی ہے اور اسی قسم کی خرافات اور بعض لوگ جو اتنے نیچے نہیں گرے انہوں نے کچھ اور فائدے بیان کئے جو اتنے پست اور گھٹیا تو نہیں ہیں لیکن بہرحال اُن کا تعلق بھی اسی، لم محسوسات سے ہے۔ یہ ساری غلطیاں عبادت کی حقیقت اور اُس کے موضوع اور غایت کو نہ سمجھنے

کی وجہ سے اور ذہنوں پر مادیت اور عالمِ محسوسات کی اہمیت کے غالب آجانے کی وجہ سے ہوتی ہیں۔ بقول کسی کے :۔

"فکر ہر کس بقدرِ ہمتِ اوست

اس غلط فہمی کی ایک مثال راقم سطور ناچیز محمد منظور نعمانی اور رفیق محترم مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندوی ایک جگہ گئے ہوئے تھے، کچھ ہی دنوں پہلے الفرقان کے حج نمبر میں مولانا موصوف کا مضمون "اپنے گھر سے بیت اللہ تک" نکلا تھا، واقعہ یہ ہے کہ حج کے موضوع پر اللہ تعالیٰ نے مولانا سے یہ عجیب و غریب مضمون لکھوایا تھا، عجیب تاثیر اور عجیب سوز سے بھرا ہوا ہے، خود میرا حال یہ ہے کہ میں نے بارہا اس کو پڑھا ہے، لیکن ہر دفعہ اُس نے رلایا ہے اور بہت بہت رُلایا ہے[1]۔ ایک بڑے اچھے تعلیم یافتہ دوست جن کا دینی مطالعہ بھی اچھا خاصا ہے وہ ملنے آگئے، مولانا کے مضمون کی تعریف کی اور آخر میں کہا:—— لیکن اس میں ایک بڑی کمی یہ رہ گئی ہے کہ حج کے اجتماع کا جو خاص مقصد اور فائدہ ہے اُس کا آپ نے بالکل ذکر نہیں کیا۔ میں نے عرض کیا وہ کیا ہے؟ فرمایا:۔ یہی کہ تمام دنیا کے مسلمان اور ان کے نمائندے جمع ہو کر وقت کے اہم مسائل پر غور کریں۔ میں نے عرض کیا:۔ یہ آپ نے کہاں سے سمجھا ہے؟—— فرمایا کہ۔ دسویں تاریخ سے لے کر بارھویں تیرھویں تک منیٰ کے میدان میں سارے حجاج کو ٹھہرنے کا حکم ہے، اس کا مقصد اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ شہر کے شور و شغب اور ہنگاموں سے بالکل الگ رہ کر اطمینان سے وہاں کی پرسکون میدانی فضا میں دنیا کے اہم مسائل پر غور کریں۔ میں نے دریافت کیا کہ:۔ جناب حج کر چکے ہیں، اور آپ نے منیٰ میں حجاج

---

[1] یہ پورا مضمون "حج کیسے کریں" نامی کتاب میں بھی چھپ چکا ہے۔ ۱۲

کے ٹھہرنے کا منظر دیکھا ہے؟ ۔ فرمایا: ۔ ابھی تو نہیں، اللہ تعالیٰ نصیب فرمائے۔ میں نے عرض کیا کہ ۱۔ جب اللہ تعالیٰ نصیب فرمائیں گے تو آپ کو خود معلوم ہو جائے گا کہ آپ کتنی بڑی غلطی میں تھے۔

حیرت ہے کہ حج کا یہ مقصد سمجھنے والے یا اس قسم کی چیزوں کو حج کا "خاص فائدہ" بتلانے والے اور ان باتوں کو زیادہ اہمیت دینے والے، یہ بھی نہیں سوچتے کہ اس مقصد کا تقاضہ تو یہ تھا کہ ہر ملک کے خواص اور نمائندے اور اہل الرائے حضرات کو بلایا جاتا، کم از کم ان کے جمع ہونے پر خاص زور دیا جاتا، حالانکہ ایسا نہیں ہے، بلکہ ہر اُس مسلمان پر حج فرض کیا گیا ہے جو وہاں پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہو اور عمر میں صرف ایک دفعہ فرض کیا گیا ہے، پھر غور کرنے کی بات ہے کہ احرام، طواف، سعی (یعنی صفا مروہ کے پھیرے) قربانی، مکہ سے منیٰ جانا، منیٰ سے عرفات دوڑنا عرفات سے رات کو مزدلفہ آنا، وہاں سے پھر منیٰ اور منیٰ سے پھر مکہ بھاگنا اور پھر مکہ سے منیٰ واپس جانا اور پھر وہاں ٹھہر کر روزانہ رمی جمار کرنا، آخر دیوانوں کے سے ان اعمال اور اس مجنونانہ دوڑ بھاگ سے اور "عالم اسلامی کی کانفرنس" والے مقصد سے کیا ربط اور جوڑ ہے[1]۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ حج کے اجتماع سے یہ فائدہ اٹھایا نہیں جاسکتا، یا ایسا کوئی

---

[1] حج کا اصل مقصد یہ ہے کہ اللہ کے حکم کے مطابق حضرت ابراہیمؑ کے حقیقی حج کیساتھ تشبہ اختیار کر کے ان کے جذبۂ عبدیت اور کمالِ فدویت و فدائیت کو یاد کیا جائے اور ان کی اس مبارک عشقی نسبت سے اور اسکی برکات سے حصہ لینے کی کوشش کی جائے، حج کے تمام اعمال سے یہی ظاہر ہوتا ہے۔ ہاں ضمنی طور پر دوسرے منافع اور فوائد بھی حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ ۱۲

فائدہ اٹھانا نہیں چاہئے، بلکہ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ برکات وغیرہ عبادات کا موضوع ہی نہیں ہے اور جو لوگ اس قسم کی باتیں کرتے ہیں اور اسطرح سوچتے ہیں انکی بنیادی غلطی یہ ہے کہ انہوں نے عبادات کی حقیقت اور اس کے اصل مقصد اور موضوع کو نہیں سمجھا ہے، عبادات کا اصل مقصد اور اس کی اصل غایت وہ ہے جس کا تعلق اس عالمِ محسوسات سے نہیں ہے، لیکن ان لوگوں کی نظروں میں چونکہ عالمِ محسوسات ہی کی وقعت اور اہمیت زیادہ ہے اور ان کے ذہنوں کا رُخ چونکہ اس مادی عالم ہی کی طرف ہے اس لئے یہ بیچارے عبادات کا مقصد اور اس کے خاص فائدے بھی اسی میں ڈھونڈتے ہیں اور جو کچھ سمجھ میں آتا ہے' وہ کہتے ہیں۔ ان باتوں سے "عبادات" کی امتیازی اہمیت بالکل ختم ہو جاتی ہے اور پھر وہ معمولی مقاصد کی معمولی تدبیریں رہ جاتی ہیں۔

ہاں! ہمیں اس سے انکار نہیں کہ عبادات سے بہت سے ایسے فائدے بھی حاصل ہوتے ہیں جن کا تعلق اسی عالمِ محسوسات سے ہے، لیکن وہ عبادات کا مقصد اور غایت نہیں ہیں، بلکہ ان کو منافع اور زیادہ سے زیادہ برکات کہا جا سکتا ہے۔

بہرحال عبادات کا اصل مقصد و موضوع صرف معبودِ برحق کی رضا اور اس کا قرب حاصل کرنا اور اپنے کو پاک کرنا اور اپنے روحانی اور ملکوتی پہلو کو نشو و نما دینا ہے اور انسانوں کے تمام اعمال میں محض عبادات ہی کی یہ خصوصیت ہے کہ اس کا تعلق صرف معبود سے ہے اور کسی اور کا اس میں کوئی حصّہ نہیں، یہی وجہ ہے کہ کوئی عبادت کسی نیت سے اور کسی پہلو سے بھی غیر اللہ کے لئے نہیں کی جا سکتی اور اگر کوئی کرے گا تو وہ مشرک ہو جائے گا، دوسرے کسی عمل کی یہ شان نہیں ہے۔

اور عبادت کے شعبے کی اسی اہمیت اور نزاکت کی وجہ سے دوسرے تمام شعبوں سے زیادہ اس میں پابندیاں لگائی گئی ہیں اور اس کے احکام زیادہ تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں جو چیز جتنی اعلیٰ اور جتنی قیمتی اور جتنی نازک ہوتی ہے اُس کا قانون بھی اتنا ہی سخت ہوتا ہے۔

ارکانِ اربعہ یہاں تک تو عبادات کے متعلق عمومی اور اصولی باتیں کی ہیں، اب خاص طور سے عباداتِ اربعہ نمازؔ، روزہؔ، زکوٰۃؔ اور حجؔ کے متعلق الگ الگ کچھ کہنا ہے آپ جانتے ہیں کہ ان کو اسلام کا رکن قرار دیا گیا ہے اور دین میں ان کی غیر معمولی اہمیت ہے گویا یہی وہ بنیادی ستون ہیں جن پر دین کی پوری عمارت قائم ہوتی ہے۔

نماز اور اس کی خاص اہمیت پھر ان میں نماز سب سے اہم اور افضل ہے اور اس کی وجہ ظاہر ہے آپ جانتے ہیں کہ ہر چیز کی قدر و قیمت اُس کے مقصد کے لحاظ سے ہوتی ہے، مثلاً موٹر کی قیمت اس کی خوبصورتی اور اس کے رنگ کے اعتبار سے نہیں لگتی، بلکہ موٹر جس مقصد کیلئے لیا جاتا ہے اُس مقصد کے لحاظ سے جتنا بڑھیا ہوگا اتنی ہی اس کی قیمت زیادہ ہوگی، اسی طرح مثلاً بھینس کی قیمت اس کی خوبصورتی یا اس کی چال کے حساب سے لگائی نہیں جائے گی، بلکہ دودھ کے حساب سے لگائی جائے گی یعنی بھینس جس قدر زیادہ دودھ دے گی وہ اتنی ہی بڑھیا اور قیمتی بھی جائے گی۔ بس اسی طرح سمجھئے کہ عبادت کا جو مقصد اور فائدہ ہے (یعنی اللہ کا قرب حاصل کرنا اور روحانی اور ملکوتی پہلو کو نشو و نما دینا اور ملاء اعلیٰ سے ربط اور مناسبت پیدا کرنا) چونکہ نماز اس صفت میں دوسری تمام عبادات سے بڑھی ہوئی ہے، اس لئے وہی سب سے اہم اور افضل ہے اور اسی لئے اس کی شرطیں سخت ہیں، مثلاً جسم کا پاک ہونا، کپڑوں کا پاک ہونا، زمین کا پاک ہونا

وضو سے ہونا وغیرہ وغیرہ۔ آپ حضرات جانتے ہیں کہ جتنا اہتمام نماز کے لئے کرنا پڑتا ہے، اتنا کسی عبادت کے لئے کرنا نہیں پڑتا۔

نماز کا تعلق اللہ کی صفتِ حاکیت سے بھی ہے اور محبوبیت سے بھی نماز کی اہمیت کو ایک اور طریقہ سے بھی سمجھا جاسکتا ہے۔ بعض عبادات وہ ہیں جن کا خاص تعلق اللہ کی صفتِ حاکیت اور ملکیت سے ہے، یعنی بندہ اپنے اس عمل سے اس حقیقت کا اظہار کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ میرے مالک اور حاکم ہیں اور میں ان کا عبد اور مملوک ہوں۔ مثلاً زکوٰۃ خاص طور سے اسی پہلو کو ظاہر کرتی ہے اور بعض عبادات وہ ہیں جن کا خصوصی تعلق اللہ تعالیٰ کی صفتِ محبوبیت سے ہے، یعنی اُن کے ذریعہ اس کا اظہار ہوتا ہے کہ بندہ اللہ تعالیٰ کا طالب ہے اور وہ اس سے محبت اور فدائیت کا تعلق رکھتا ہے اور اس کی روح اور اس کا دل اس سے وابستہ ہے، مثلاً روزہ سے اسی پہلو کا اظہار ہوتا ہے، اس میں عاشقوں کی طرح کھانا پینا چھوڑ دیا جاتا ہے اور حج تو سراسر عشق و محبت کی شوریدگی اور دیوانگی کی تصویر ہے، عاشقوں کا سا لباس، محبت کے دیوانوں کی سی حرکتیں، دل میں کسی کا خیال لے کر کعبہ کے گرد گھومنا، اُس کے ایک گوشے میں لگے ہوئے ایک پتھر کو بار بار چومنا، جنگلوں میں نکل جانا، راتوں کو اور دنوں کو وہاں پڑا رہنا، یہ سب چیزیں عشق و محبت کی سرمستی کو ظاہر کرتی ہیں اور گویا یہی حج کی رُوح ہے۔

لیکن نماز ان دونوں پہلوؤں کو جامع ہے ادب اور سکون و وقار کے ساتھ دربار میں حاضر ہونا، غلاموں اور چاکروں کی طرح صف باندھ کے نگاہ نیچی کرکے دست بستہ کھڑا ہوجانا، ایک نظام کے ساتھ اس کے سارے ارکان ادا کرنا۔ ان چیزوں سے اللہ تعالیٰ کی ملکیت اور حاکیت اور بندہ کی عبدیت و مملوکیت کا پورا پورا اظہار ہوتا ہے، لیکن

نماز میں بندہ کے باطن کی اور دل کی جو حالت ہونی چاہیئے، اس کا تعلق اللہ تعالیٰ کی خاص صفت محبوبیت سے ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد:-

قُرَّۃُ عَیْنِیْ فِی الصَّلٰوۃِ

نماز میں میری آنکھ کی ٹھنڈک کا سامان ہے۔

اور نماز کا وقت آجانے پر حضرت بلالؓ سے آپ کا فرمانا:-

اَرِحْنِیْ یَا بِلَالُ

بلال! نماز کا بندوبست کر کے ہمارے بے چین دل کی راحت اور ہمارے درد دل کی دوا کا انتظام کرو۔

یہ اسی حقیقت کا اظہار ہے۔

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں۔

"نماز است کہ راحت دہ بیماران است "ارحنی یا بلال" رمزیست ازیں باجراء "قرۃ عینی فی الصلوٰۃ" اشارۃ الست بایں متمنا"

حضرت مجددؒ کے ایک خلیفہ خواجہ عبدالواحد لاہوری کے متعلق نقل کیا جاتا ہے، کہ ایک دن فرمایا:-

"کیا جنت میں نماز ہوگی؟"

کسی نے عرض کیا کہ:- حضرت! جنت دار العمل تو ہے نہیں، وہ تو دار الجزاء ہے، پھر وہاں نماز کیوں ہونے لگی۔ یہ سن کر بڑے درد کے ساتھ روتے ہوئے فرمایا:-

"پھر بغیر نماز کے وہاں کیسے گزرے گی"

اللہ کے جن بندوں کی نمازیں حقیقی نمازیں ہیں، اُن کو نماز میں جو لذت اور

کیفیت ملتی ہے، حضرت مجدد الف ثانیؒ نے ایک جگہ اس کی طرف اشارہ کرتے لکھا ہے :-

"رتبۂ نماز در رنگ رتبۂ رویت است در آخرت، نہایت قرب
در دنیا، در نماز ست، ونہایت قرب در آخرت درحین رویت ۔"

بہرحال عبادات میں نماز ہی کی یہ خصوصیت ہے کہ اس کا تعلق اللہ تعالیٰ کی صفتِ حاکمیت و مالکیت سے بھی پورا پورا ہے اور اس کی صفتِ محبوبیت سے بھی؛ اس کا قالب بندہ کی عبدیت اور مملوکیت کی نہایت مکمل اور نہایت حسین تصویر ہے، اور اس کی رگ رگ میں عشق کی لذت اور محبت کا سوز و گداز بھرا ہوا ہے، ان دونوں پہلوؤں کی یہ کامل جامعیت صرف نماز ہی میں پائی جاتی ہے اور یہ بھی تمام عبادات سے اس کے افضل اور اہم ہونے کی ایک وجہ ہے۔'

نماز ایمان کا خارجی وجود ہے نماز کی اہمیت اور امتیاز کے سلسلہ میں ایک بات اس ناچیز کے ذہن میں یہ بھی آتی ہے کہ نماز ظاہری اور تفصیلی ایمان ہے اس سے میرا مطلب یہ ہے کہ ایمان تو دراصل ایک باطنی حقیقت ہے اور دل کا ایک معاملہ ہے، لیکن اس کا وجود نماز سے ظاہر ہوتا ہے اور نماز گویا ایمان کا محسوس پیکر ہے، یا یوں کہہ لیجئے کہ نماز ایمان ہی کی اندرونی کیفیت کا خارج میں ایک محسوس اور متشکل وجود ہے بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں کہ ان کا ایک باطنی وجود ہوتا ہے اور ایک ظاہری، پس ایمان کا ایک وجود تو باطنی ہے اور وہ انسان کے دل کی ایک خاص کیفیت ہے اور اسی کا ایک وجود ظاہری ہے اور وہ نماز ہے۔ میرا خیال ہے کہ قرآن مجید میں بعض مقامات پر نماز کو اسی واسطے ایمان کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ مَاكَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ۔

کے متعلق مفسرین عموماً یہی فرماتے ہیں کہ یہاں نماز ہی کو ایمان کہا گیا ہے۔ اس آیت کا شان نزول یہ بیان کیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک عرصہ تک بیت المقدس کی طرف رُخ کر کے نمازیں پڑھتے رہے، اس کے بعد آپ کو حکم ہوا کہ کعبۃ اللہ کو قبلہ بنائیں اور اسی کی جانب رُخ کر کے نماز پڑھا کریں۔ چنانچہ پھر اسی پر عمل ہونے لگا۔ بعض لوگوں کے دل میں یہ خلش تھی کہ اب تک بیت المقدس کی طرف جو نمازیں پڑھی گئیں اُن کا کیا ہوگا، کیا وہ سب ضائع جائیں گی؟ ۔۔۔۔ یہ آیت "مَاكَانَ اللهُ لِيُضِيعَ إِيمَانَكُمْ" (یہ نہیں ہو سکتا کہ اللہ تمہارے ایمان کو ضائع کرے) کہا جاتا ہے کہ اسی موقع پر نازل ہوئی اور اس کے ذریعہ تسلی دی گئی کہ تمہاری پہلی نمازیں بھی ہرگز ضائع نہیں جائیں گی، بلکہ وہ اللہ کے یہاں قبول ہو چکی ہیں۔ الغرض اس آیت میں نماز کو ایمان کہا گیا ہے۔ میرے نزدیک اس کی وجہ یہی ہے کہ نماز اندرونی ایمانی حقیقت کا ظاہری اور خارجی وجود ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ ایمان اور نماز کے اسی خاص تعلق کی وجہ سے ترک نماز کو بعض حدیثوں میں کفر کہا گیا ہے اور ان ہی احادیث کی بنا پر بعض ائمہ کا یہ فتویٰ ہے کہ عمداً نماز ترک کرنے سے آدمی اسلام سے بالکل نکل جاتا ہے۔ یہ حضرات ترک نماز کو دوسرے فرائض کے ترک اور دوسرے کبیرہ گناہوں جیسا گناہ قرار نہیں دیتے، بلکہ ان کے نزدیک ترک نماز سجدۂ صنم اور سجدۂ صلیب کی قسم کا ایسا عمل ہے جو اپنی ذات کے لحاظ سے منافی ایمان ہے، یعنی جس طرح بُت کے سامنے یا صلیب کے سامنے سجدہ کرنا ایک ایسا کافرانہ عمل ہے کہ اگر بالفرض کفر کے عقیدے کے ساتھ نہ بھی ہو تب بھی کفر ہے، اسی طرح ان ائمہ کے نزدیک نماز نہ پڑھنا بھی اسی قسم کا کافرانہ عمل ہے۔

الغرض نماز کا ایمان سے ایک ایسا خاص تعلق ہے جو دوسری عبادات اور دوسرے

فرائض اور ارکان کانہیں ہے اور اس بنا پر بھی دوسری تمام عبادات کے مقابلہ میں نماز کو خاص اہمیت اور امتیاز حاصل ہے۔

نماز زندگی کے تمام شعبوں پر اثر ڈالتی ہے! ایک خصوصیت نماز کی یہ بھی ہے کہ وہ زندگی کے سب شعبوں پر اپنا اثر ڈالتی ہے اور پوری زندگی کو اللہ کی یاد والی اور اس کی اطاعت والی زندگی بناتی ہے، بشرطیکہ حقیقی نماز ہو، نماز میں یہ تاثیر بدرجۂ اتم موجود ہے۔

بعض حدیثوں میں آتا ہے کہ کچھ لوگوں کے اعمال کی جانچ آخرت میں اس طرح ہوگی کہ اُن کی صرف نمازوں کو دیکھ لیا جائے گا، اگر وہ درست اور ٹھیک ہوں گی، تو پوری زندگی کو درست قرار دے دیا جائے گا اور اگر اُن میں نقص اور خرابی ہوگی تو ساری زندگی ناقص اور خراب قرار دے دی جائے گی، اس کا راز یہی ہے کہ نماز اگر واقعی نماز ہو تو وہ پوری زندگی کو پاک صاف بنا دیتی ہے۔ دوسری عبادات سے نماز کے افضل اور اہم ہونے کی یہ بھی ایک وجہ ہے۔

اپنی نمازوں کی تکمیل اور ترقی کی ضرورت نماز کے متعلق راقم سطور کو آخری اور عملی بات آپ حضرات سے اپنی نمازوں کی اصلاح اور ترقی سے متعلق کہنی ہے، اللہ کا شکر ہے کہ ہم سب نماز کی اہمیت کو کچھ سمجھتے ہیں اور نمازیں پڑھتے ہیں، لیکن ہم میں سے اکثر اپنی نمازوں کی موجودہ سطح پر بالکل قانع ہیں اور انہیں اپنی نمازوں کے بہتر بنانے کی کوئی فکر نہیں ہے یہ بڑے خسارے کی بات ہے۔ ابھی ابھی حضرت مجددؒ کا قول گزر چکا ہے کہ

"نماز کا دنیا میں وہ مقام ہے جو آخرت میں دیدار الٰہی کا ہے"

اب آپ خود ہی سمجھ لیجئے کہ اپنی نمازوں کو بہتر بنانے اور ترقی دینے کی ہمیں کتنی فکر اور کوشش کرنی چاہیے۔

نماز میں ترقی اور تکمیل کی بے انتہا گنجائش ہے۔ جو بہتر سے بہتر اور اچھی سے اچھی نماز دنیا میں پڑھی جاتی ہے، اگر کوشش جاری رکھی جائے تو اس میں بھی ہزاروں درجہ اور ترقی ہو سکتی ہے۔

اس کی چند اصولی تدبیریں ناچیز اس سلسلہ میں چند اصولی تدبیریں عرض کرتا ہے انشاء اللہ اُن سے آپ کو فائدہ پہنچ جائے۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ نماز کے ضروری مسائل اگر نہیں سیکھے ہیں تو سیکھے جائیں اور مقررہ شرائط کے مطابق خشوع خضوع کے ساتھ صحیح نماز ادا کرنے کا ہمیشہ اہتمام رکھا جائے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو حاضر ناظر سمجھ کر اور اس کا پورا دھیان رکھ کر نماز پڑھنے کی عادت ڈالی جائے اور اس بارے میں اپنی پوری ہمت اور فکر سے کام لیا جائے۔ یعنی اپنے امکان کی حد تک اس کی پوری کوشش کی جائے کہ نماز ایسی ہو جیسی کہ اُس وقت ہوتی، جب اللہ تعالیٰ اپنے پورے جلال و جمال کے ساتھ ہماری آنکھوں کے سامنے ہوتے اور ہمیں نماز ادا کرنے کا حکم دیتے اور اُس وقت ہم اُن کے سامنے کھڑے ہو کر ادا کرتے۔ اگرچہ یہ بات ہمارے آپ کے لئے آسان نہیں ہے، بہت مشکل ہے لیکن اپنی حد تک اس کی کوشش پوری کرنی چاہئے، انشاء اللہ کوشش کرنے سے بہت کچھ فرق ہو جائے گا۔ اور اس کی صورت یہ ہے کہ جب نماز کے لئے کھڑے ہوں تو یہ مراقبہ کر لیا کریں یعنی یہ سوچ لیا کریں کہ اللہ تعالیٰ حاضر ناظر ہیں، میں اگرچہ نہیں دیکھ سکتا، لیکن وہ مجھے دیکھ رہے ہیں اور میں ان کے حضور میں نماز ادا کر رہا ہوں۔ پھر پوری نماز میں، قیام میں، قعود میں، رکوع میں، سجود میں یہی دھیان اور خیال رہے۔ اگر اس

کیفیت کا ذرہ بھی نصیب ہوجائے تو بہت ہے۔

نماز سمجھ کر پڑھی جائے تیسری بات یہ ہے کہ نماز میں جن چیزوں کا پڑھنا بالکل مقرر ہے مثلاً ثنا، سورۂ فاتحہ، رکوع سجدہ کی تسبیحات، تشہد یعنی التحیات، درود شریف وغیرہ کم از کم ان کا مطلب تو ضرور ہی سیکھ لیا یا یاد کر لیا جائے کہ ان چیزوں کے پڑھتے وقت آپ کو دھیان رہے کہ ان لفظوں میں آپ اپنے مالک و معبود سے کیا عرض کر رہے ہیں تاکہ آپ کے دل کی کیفیت بھی اس کے مطابق رہے، اس سے حضورِ قلب میں بھی بڑی مدد ملتی ہے۔

جو لوگ بے سمجھے بوجھے نمازیں پڑھتے ہیں اُن سے فرض تو ضرور ادا ہو جاتا ہے لیکن اُن کی وہ نمازیں بڑی گھٹیا درجہ کی نمازیں ہیں اور اُن سے اُن کی نمازوں کو شکایت ہوگی کہ انہوں نے ان کی طرف سے ایسی بے توجہی برتی۔

بعض لوگوں کا غلو آج کل کے پڑھے لکھے بعض مسلمان اس بارے میں بڑا غلو اور بڑی زیادتی کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ جو لوگ عربی نہیں جانتے اور معنی مطلب سمجھے بغیر نمازیں پڑھتے ہیں (جیسا کہ عام مسلمانوں کا حال ہے) اُن کی نمازیں بالکل فضول ہیں، اور وہ سرے سے ادا ہی نہیں ہوتیں۔ یہ خیال قطعاً غلط ہے اور اس میں سخت غلو ہے۔ اگر نماز کا مقصد صرف اتنا ہی ہوتا کہ جو کچھ اس میں پڑھا جاتا ہے اس کو سمجھا جائے تو بیشک ایسے لوگوں کی نمازیں بالکل فضول ہوتیں مگر واقعہ یہ ہے کہ نماز سے بہت سی چیزیں مطلوب ہیں۔ مثلاً: وقت آجانے پر اور نماز کی پکار بلند ہونے پر سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے اللہ کے حضور میں حاضر ہو جانا، اللہ کے حکم کے مطابق اپنے کو پاک کر کے سب طرف سے رُخ پھیر کے اللہ کی طرف اپنا رُخ کر لینا، اپنے آپ کو

ایک عاجز بندے کی حیثیت سے اُس کے سامنے پیش کر دینا، اس کی بارگاہ میں ادب اور تعظیم کے ساتھ دست بستہ کھڑا ہوجانا، جھک کر اور خاک پر پیشانی رکھ کر اپنی بندگی اور نیازمندی کا اظہار کرنا جس حال میں جو کچھ پڑھنے کا حکم ہے اسکو پڑھنا۔

پس چونکہ عام نمازی مسلمان جو بیچارے معنی مطلب سمجھے بغیر نمازیں پڑھتے ہیں ان کی نمازوں سے یہ مقاصد پورے ہو جاتے ہیں، اس لئے ان کی نمازیں ادا تو یقیناً ہو جاتی ہیں، لیکن اس میں شبہ نہیں، کہ معنی مطلب سمجھنے کا جو خاص نور ہے، ان کی نمازیں اس سے خالی رہتی ہیں اور یہ بہت بڑا گھاٹا اور بہت بڑی محرومی ہے اس لئے اس میں بے پروائی ہرگز نہیں کرنی چاہئے، جس طرح اس دنیا کی اپنی چیزوں کے متعلق ہمارا جی چاہتا ہے کہ وہ بہتر سے بہتر اور حسین و جمیل ہوں اسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ اپنی نمازوں کے متعلق ہمیں کوشش کرنا چاہئے کہ وہ حسین و جمیل اور نورانی ہوں۔

بہرحال اس طرف ہمیں توجہ کرنی چاہئے اور دوسرے اپنے بھائیوں کو بھی اسکی ترغیب دینی چاہئے اور انہیں بتلانا چاہئے کہ بہت تھوڑی سی محنت اور معمولی توجہ سے نماز کے مقررہ اذکار کا مطلب یاد کیا جاسکتا ہے اور اس سے انکی نمازوں میں بہت ترقی ہوسکتی ہے، انشاء اللہ ایسا کرنے سے خارجی خیالات بھی کم آئیں گے۔

نماز میں خیالات آنے کی شکایت جب ذکر آگیا ہے تو نماز میں خطرات وخیالات آنے کے متعلق بھی کچھ عرض کیا جاتا ہے:۔

اکثر حضرات اس کی شکایت کرتے ہیں اور اس کی وجہ سے بہت شکستہ دل ہوتے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ ان سے نماز خراب ہو جاتی ہے، خواہ مخواہ ایسے وہموں میں نہیں پڑنا چاہئے۔ اپنی طرف سے اس کی فکر اور کوشش تو ضرور کرنی چاہئے کہ نماز میں بیرونی خیالات نہ آئیں، لیکن اس کے باوجود جو خیالات آپ سے آپ دل میں آجاتے ہیں، جن کو ہم

لپنے ارادہ اور اختیار سے نہیں لاتے ، اُن سے ہرگز نماز خراب نہیں ہوتی اور یہ کوئی پریشان ہونے کی بات نہیں ہے تاہم اس کی فکر اور کوشش جاری رکھنی چاہیئے کہ نماز میں ایسے خیالات نہ آئیں اور سمجھ کے نماز پڑھنے سے اور اللہ تعالیٰ کے حضور میں حاضری کا دھیان رکھنے سے ان خیالات میں بہت کمی ہو جاتی ہے۔

نماز کی تکمیل اور ترقی کے سلسلہ کی آخری بات یہ ہے کہ اللہ کے ایسے بندوں کے پاس رہا جائے اور ان کی نمازوں کو دیکھا جائے ، جن کی نمازیں اللہ کے فضل سے کامل ہیں ، کم از کم ہماری نمازوں کے اعتبار سے کامل ہیں اور جب یہ میسر نہ ہو تو ایسی کتابیں ہی دیکھی جائیں جن کے دیکھنے سے ہمیں اپنی نمازوں کو بہتر بنانے کا شوق پیدا ہو اور اس معاملہ میں رہنمائی حاصل ہو سکے ۔ جیسے کہ امام غزالیؒ کی کیمیائے سعادت" وغیرہ "نماز کی حقیقت" کے نام سے اس عاجز کا بھی ایک رسالہ ہے ، اس میں بھی حضراتِ بزرگانِ دین کی ایسی چیزیں اس عاجز نے خاص اہتمام سے نقل کی ہیں جن سے نماز کی ترقی اور تکمیل کا شوق اور اہتمام پیدا ہو اور اس سلسلہ میں رہنمائی بھی حاصل ہو ، اور چونکہ اُس کے وہ خاص مضامین میرے اپنے نہیں ہیں ، بلکہ میں نے ان کو عربی یا فارسی کتابوں سے صرف اُردو میں منتقل کر دینے کا کام کیا ہے اور صاف لفظوں میں اس حقیقت کا میں اظہار بھی کر دیا ہے اس لئے اس کے اظہار میں میں کوئی حجاب اور شرم محسوس نہیں کرتا ، کہ جب کبھی میں خود بھی اپنی ہی لکھی ہوئی اس کتاب کو دیکھتا ہوں تو الحمدللہ ہر دفعہ اپنی نماز کو بہتر بنانے کا شوق اُس کے مطالعہ سے پیدا ہوتا ہے اور مجھے نفع ہوتا ہے ۔ میں نے یہاں یہ بات اس لالچ میں لکھ دی ہے کہ شاید اس سے آپ کو بھی اُس کے مطالعہ کا شوق ہو اور آپ کی نمازوں میں اس سے کوئی ترقی ہو ،

اور پھر "الدال علی الخیر کفاعلہ" کے اصول پر مجھے بھی اُس کے اجر میں کوئی حصہ مل سکے۔

نماز کو بہتر بنانے کی ایک نبوی تدبیر نماز کو بہتر بنانے اور ترقی دینے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس سلسلہ کی ایک نصیحت انشاء اللہ بہت نفع مند ثابت ہوگی، اس پر عمل کرنا بھی زیادہ مشکل نہیں ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی کو نصیحت فرمائی تھی:۔

" إِذَا قُمْتَ فِي صَلٰوتِكَ فَصَلِّ صَلٰوةَ مُوَدِّعٍ " (مشکوٰۃ، کتاب الرقاق)

مطلب یہ ہے کہ جب تم نماز کے لئے کھڑے ہو تو الوداع کہنے والے کی سی نماز پڑھو یعنی جو شخص اس دنیا کو اور دنیوی زندگی کو الوداع کہنے والا ہو اور ہمیشہ کے لئے سب سے رخصت ہونے والا ہو، اس کی نماز جیسی ہونی چاہیئے، تم ویسی نماز پڑھا کرو۔ جس کی عملی صورت یہ ہے کہ جب ہم نماز کے لئے کھڑے ہونے لگیں تو یہ خیال کریں کہ کیا خبر ہے شاید یہی ہماری آخری نماز ہو اور اس کے بعد کوئی اور نماز ادا کرنے کا مجھے موقع نہ ملے، بس یہ خیال کر کے اور اچھی طرح اس کا مراقبہ اور دھیان کر کے اپنی نماز کو ظاہر اور باطن کے لحاظ سے بہتر سے بہتر ادا کرنے کی کوشش کریں، انشاء اللہ اس تدبیر سے بعد نفع ہوگا اور نماز میں جان آجائے گی۔

نماز کی تکمیل و ترقی اور اس کی تدابیر کے بارے میں جو کچھ عرض کرنا تھا، وہ عرض کیا جا چکا، اب نماز ہی کے سلسلہ میں ایک اور بات عرض کرنی ہے:۔

نوافل فرض تو روزانہ صرف پانچ نمازیں ہیں، ان کے علاوہ کچھ سنتیں ہیں اور کچھ

نوافل ہیں اور توفیق کے مطابق فرضوں سے آگے پیچھے والی سنتیں اور ان کے ساتھ کے نوافل بھی الحمدللہ ہم آپ اکثر پڑھ لیتے ہیں۔ لیکن ان کے علاوہ جو نوافل ہیں جیسے تہجد، اشراق، اوابین جن کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابۂ کرام کو ترغیب دیتے تھے اور خود بھی پڑھا کرتے تھے اور آپ نے ان کے بڑے بڑے فضائل بیان فرمائے ہیں ان کی توفیق ہم کو بہت کم ہوتی ہے۔ مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے جن بندوں پر یہ فضل فرمایا ہے کہ اس زمانہ میں اُن کو دین سے ایک درجہ کا تعلق بخشا ہے، انہیں چاہئے کہ وہ اس نعمتِ عظمیٰ کی قدر پہچانیں اور اس کا شکر ادا کریں اور اس کا خاص شکر یہی ہے کہ اُس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھانے کی کوشش کریں اور کم از کم خاص خاص اوقات کے یہ نوافل پڑھ لیا کریں، اس میں وقت بہت کم صرف ہوتا ہے اور ثواب بہت زیادہ بتلایا گیا ہے۔ بالخصوص تہجد کی عادت ضرور ڈالنی چاہئے۔

تہجد کی غیر معمولی اہمیت اور اس کی خاص برکات قرآن مجید سے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طرزِ عمل سے بھی تمام غیر فرض نمازوں میں تہجد کی خاص فضیلت اور اہمیت معلوم ہوتی ہے۔ سورۂ مزمّل میں جس طرح تہجد کا ذکر کیا گیا ہے اس سے اس ناچیز کی سمجھ میں یہ آتا ہے کہ تہجد اپنی عظمت اور برکات کے لحاظ سے فرض ہونا چاہئے تھا لیکن اُمت کی آسانی کیلئے اس میں رخصت دے دی گئی ہے بلکہ اکثر علماء کی تحقیق یہ ہے کہ تہجد شروع میں فرض ہی تھا، سورۂ مزمّل کے دوسرے رکوع کی آیتیں جب نازل ہوئیں ہیں اُس وقت اُمت کو سہولت کیلئے رخصت دی گئی، اور اس کی فرضیت اٹھالی گئی اور اُس کو سنّت قرار دیدیا گیا۔ لیکن اپنی بعض خصوصیات اور انوار کے لحاظ سے وہ دوسری سب نمازوں میں ممتاز ہے۔ تہجد ہی وہ نماز ہے جس

میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاؤں پر ورم آجاتا تھا اور اس کے باوجود آپ پڑھتے تھے اور تہجد کا وقت وہ وقت ہے جس کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اطلاع دی ہے کہ اس وقت اللہ تعالیٰ کی وہ خاص عنایتیں متوجہ ہوتی ہیں جو دوسرے اوقات میں نہیں ہوتیں۔ آپ اسی وجہ سے تہجد کے لئے ازواج مطہرات کو بھی اٹھا دیتے تھے۔ اسی طرح صحابہ کرام کو تہجد کی خاص تاکید فرماتے تھے۔ چنانچہ ایک حدیث میں ہے، آپ نے ارشاد فرمایا:۔

"عَلَيْكُمْ بِقِيَامِ اللَّيْلِ فَإِنَّهُ دَأْبُ الصَّالِحِينَ قَبْلَكُمْ وَهُوَ قُرْبَةٌ لَكُمْ إِلَى رَبِّكُمْ وَمَكْفَرَةٌ لِلسَّيِّئَاتِ وَمَنْهَاةٌ عَنِ الْإِثْمِ۔ (رواہ الترمذی عن ابی امامۃ۔ مشکوٰۃ باب التحریض علی صلوٰۃ اللیل)

مطلب یہ ہے کہ تم تہجد کو لازم پکڑ لو کیونکہ وہ تم سے پہلے اللہ کے صالح بندوں کا دستور العمل رہا ہے اور تم کو تمہارے رب کے قریب کرنے والا ہے اور تمہارے گناہوں کیلئے کفارہ بننے والا ہے اور تم کو گناہوں سے روکنے والا ہے۔

اور ظاہر بات ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قسم کے دینی احکام صرف صحابہ کرامؓ کے لئے نہیں تھے بلکہ ان ارشادات کے مخاطب قیامت تک کے سب مسلمان ہیں، ہمیں محسوس کرنا چاہئے کہ گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم براہ راست ہم کو ارشاد فرماتے ہیں اور آپ نے اس حدیث میں تہجد کی جو برکات اور اس کے جو خواص بیان فرمائے ہیں اُن پر پورا یقین کر کے ہمیں اُس پر عمل کرنا چاہئے۔

تہجد کی اہمیت کا اندازہ اس حدیث سے بھی ہوتا ہے جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی ترغیب دی ہے کہ:۔ گھر میں اگر مرد تہجد کے لئے پہلے اُٹھے تو بیوی کو

بھی اٹھانے کی کوشش کرے، یہاں تک کہ اگر وہ نہ اُٹھے تو اس کے مُنہ پہ پانی کا ہلکا سا چھینٹا دے کے اُس کو بیدار کرنے کی کوشش کرے اور اسی طرح اگر گھر کی بیوی پہلے اُٹھ جائے تو اپنے شوہر کو اُٹھانے کی کوشش کرے اور اگر ضرورت پڑے تو اسی طرح وہ بھی جگانے کیلئے پانی کا ہلکا سا چھینٹا اس کے مُنہ پہ مارے[1]۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کرنے والے شوہروں اور بیویوں کو بڑی پیاری دُعا دی ہے۔ اسی حدیث میں ارشاد ہے:۔ "رَحِمَ اللّٰهُ رَجُلاً قَامَ مِنَ اللَّيْلِ" اور "رَحِمَ اللّٰهُ امْرَأَةً قَامَتْ مِنَ اللَّيْلِ"

یعنی ایسا کرنے والے مَردوں پر اور ایسا کرنے والی بیویوں پر خدا کی خاص رحمت ہو۔ اور ایک دوسری روایت میں رَحِمَ اللّٰهُ کی جگہ نَضَّرَ اللّٰهُ کا لفظ آیا ہے جس کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ ایسے شوہروں اور ایسی بیویوں کو تازہ اور شادا ب رکھے۔

فرض نمازوں کے علاوہ کسی سنّت یا نفل کے لئے حضورؐ نے ایسی ترغیب نہیں دی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تہجد غیر فرض نمازوں میں سب سے زیادہ اہم اور افضل بلکہ ایک حدیث کے تو صاف الفاظ یہ ہیں:۔

"افضل الصّلٰوۃ بعد الفريضة صَلٰوۃ اللیل[2]" — یعنی فرض کے بعد سب نمازوں میں افضل تہجد ہے۔

---

[1] یہاں بیبیات ملحوظ رکھنی چاہیے کہ یہ حکم اُن میاں بیویوں کو ہے جن میں دینی ذوق ہو اور ایسا کرنے سے آپس میں ناراضی اور اختلاف پڑنے کا اندیشہ نہ ہو، جن گھروں میں دینی ذوق ہوگا، وہاں ایسا کرنے سے محبت بڑھے گی۔ یہ حدیث مشکوٰۃ میں ابوداؤد اور نسائی کے حوالے سے نقل کی گئی ہے۔ ۱۲

[2] رواہ مسلم عن ابی ہریرہ مشکوٰۃ باب فی صیام التطوع ۔ ۱۲

لیکن چونکہ اُس وقت کا اُٹھنا نفس کے لئے تکلیف دہ ہوتا ہے، اس لئے بہت سے وہ حضرات بھی جن کو الحمدللہ دین سے اچھا خاصا تعلق ہے وہ بھی تہجد کے لئے نہیں اٹھتے حالانکہ تہجد کی فضیلت اور اہمیت میں اس کو بھی دخل ہے کہ اُس وقت کے اُٹھنے میں نفس کو مشقت پڑتی ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں صاف فرمایا گیا ہے:۔

"اِنَّ نَاشِئَةَ اللَّيْلِ هِيَ اَشَدُّ وَطْأً وَّ اَقْوَمُ قِيلًا"

اَشَدُّ وَطْأً کا مطلب یہی ہے کہ تہجد نفس کو خوب کچلنے والا اور روندنے والا عمل ہے بہرحال یہی تو اس کی فضیلت ہے اور اسی سے تو اس کی خاص قیمت ہے۔

تہجد کی ایک خاص تاثیر قرآن شریف کے ایک اشارہ سے معلوم ہوتا ہے کہ تہجد میں دین کے راستے کی طاقت پیدا کرنے کی بھی خاص تاثیر ہے۔ سورۂ مزمل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم دینے کے بعد کہ تم رات کے آدھے حصے میں یا اس سے کم یا اس سے کچھ زیادہ تہجد پڑھا کرو۔ متصلاً فرمایا ہے:۔

"اِنَّا سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيلًا" یعنی ہم تم پر ایک بہت بھاری بات کا بوجھ ڈالیں گے۔

گویا اشارہ فرمایا گیا ہے کہ تہجد اُس بوجھ کو اٹھانے کے لئے تیار کرنے والی چیز بھی ہے اور اس سے ایک خاص طاقت پیدا ہوتی ہے۔

تہجد کے سلسلہ میں ایک بات یہ بھی قابل ذکر ہے کہ صحابۂ کرام میں تہجد عام طور سے طویل پڑھنے کا رواج تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ ہم لوگ جس طرح قرآن شریف مُصْحَف میں دیکھ کے تلاوت کرتے ہیں، یہ تلاوت تو اُن کے یہاں مروج تھی نہیں، عام طور سے پورا قرآن مجید یا اس کا کافی حصہ لوگوں کو حفظ ہوتا تھا اور اس کو تہجد ہی

میں عموماً پڑھا جاتا تھا، راقم سطور نے ایک روایت میں کہیں دیکھا تھا کہ ایک صحابی نے غالباً اپنے لڑکے کی شکایت کی تھی کہ وہ رات کو تہجد میں قرآن پڑھنے کے بجائے دن کو پڑھتا ہے۔

بہرحال حضرات صحابۂ کرامؓ کے حالات سے جو لوگ کچھ بھی واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ وہ حضرات تہجد میں بہت طویل قرأت فرماتے تھے، گویا تہجد ہی ان کی تلاوت کا وقت تھا۔

اللہ تعالیٰ توفیق دے تو ہمیں اس کی بھی تقلید کرنی چاہیئے، ہم میں سے جن کو قرآن مجید کا کچھ زیادہ حصہ یاد ہے وہ تہجد میں چھوٹی چھوٹی سورتیں پڑھ کر جلدی فارغ ہونے کی کوشش نہ کیا کریں۔ ابھی عرض کیا جا چکا ہے کہ یہی وہ نماز ہے جس میں حضور کے پائے مبارک پر ورم آجاتا تھا۔

آخرِ شب میں اللہ کا ذکر نماز کے علاوہ ذکر و تلاوت کے لئے بھی وہ وقت سب سے بہتر ہے۔ ایک حدیث میں ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔

۱۰ اَقْرَبُ مَا یَکُوْنُ الرَّبُّ مِنَ الْعَبْدِ فِیْ جَوْفِ اللَّیْلِ الْاٰخِرِ فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَکُوْنَ مِمَّنْ یَذْکُرُ اللّٰہَ فِیْ تِلْکَ السَّاعَۃِ فَکُنْ[1]	مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بندہ سے سب سے زیادہ قریب رات کے آخری حصے میں ہوتے ہیں، اسلئے اگر تم سے ہو سکے کہ اس وقت تم اللہ کا ذکر کرنے والے بندوں میں ہو، تو ضرور ایسا کرو اور وہ قیمتی وقت غفلت میں نہ گزارو۔

آخرِ شب کے ذکر کے متعلق یہ بات تو یہاں صرف ضمناً تہجد کی مناسبت سے ذکر

---

[1] رواہ الترمذی عن عمرو بن عبسۃ۔ مشکوٰۃ باب التحریض علی صلوٰۃ اللیل ۱۲۔

کردی گئی ہے ورنہ دراصل نمازوں کی ترقی اور تکمیل کے سلسلہ میں کچھ عرض کیا جارہا تھا اور اسی سلسلے میں نوافل کا ذکر آگیا تھا۔ پھر نوافل میں خاص کر تہجد کی ترغیب و تشویق کے لئے کچھ تفصیل سے عرض کرنا سب معلوم ہوا، اللہ تعالیٰ اس سے فائدہ اٹھانے کی ہم سب کو توفیق دے۔

چاشت کے نفل مقررہ نوافل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تہجد کے علاوہ چاشت کی بھی بڑی فضیلتیں اور برکتیں بیان فرمائی ہیں اور اُمت کو اس کی بھی بہت ترغیب دی ہے، کم از کم دو دو حدیثیں اس سلسلہ کی بھی پڑھ لیجئے :۔

ایک حدیث قدسی ہے (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے بیان فرمایا ہے) کہ ہر بندہ کو اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ :۔

"يَا ابْنَ اٰدَمَ اِكْفِنِيْ اَوَّلَ النَّهَارِ بِاَرْبَعِ رَكْعَاتٍ اَكْفِكَ بِهِنَّ اٰخِرَ يَوْمِكَ" [1]

اے فرزند آدم! تو بس اتنی ذمہ داری لے لے کہ دن کے شروع حصے میں (یعنی صبح چاشت کے وقت) چار رکعت نماز میرے حضور میں ادا کیا کرے میں اُسی وجہ سے دن کے ختم ہونے تک تیرے لئے کفایت کروں گا، یعنی تیری ضروریات کی کفالت کروں گا۔

ایک دوسری حدیث میں ہے، آپ نے ارشاد فرمایا :۔

"من حافظ على شفعة الضحٰى غفرت له ذنوبه وان كانت مثل زبد

جو بندہ چاشت کے وقت کی دو رکعتیں برابر ادا کرے اُس کے گناہ بخشدیئے جائیں گے،

---

[1] رواہ احمد والموصلی عن عقبہ بن عامر والترمذی عن ابی ذر وابی الدرداء۔ کذا فی جمع الفوائد۔ ۱۲

البحر[1] اگرچہ سمندر کے جھاگ کے برابر کیوں نہ ہوں۔

پہلی حدیث میں چاشت کی چار رکعتوں کا ذکر تھا اور اس دوسری حدیث میں صرف دوؔ کا ذکر کیا گیا ہے، چاشت ہی کے سلسلہ میں بعض دوسری حدیثوں میں چھؔ، آٹھؔ اور بارہؔ رکعتوں کا ذکر بھی آیا ہے۔ بات یہ ہے کہ نوافل میں رکعات کے عدد کی فرضوں کی سی پابندی نہیں ہے، اگر کم سے کم صرف دوؔ رکعتیں بھی کسی نے پڑھ لیں تو وقت کا نفل ادا ہو گیا اور اگر زیادہ پڑھیں تو بندہ زیادہ اجر و ثواب کا مستحق ہو گا۔

دین کے اوّلین رکن نماز کے بارے میں جو کچھ عرض کرنے کا ارادہ کیا گیا تھا وہ عرض کیا جا چکا اور ضمناً نوافل کا بھی کچھ ذکر آ گیا، اب باقی ارکان زکوٰۃ، صوم، حج کے متعلق عرض کرنا ہے۔

زکوٰۃ ارکان میں نماز کے بعد زکوٰۃ کا درجہ ہے، زکوٰۃ کا مقصد بھی دوسری عبادات کی طرح اللہ تعالیٰ کی رضا اور اپنے نفس کی تطہیر اور اُس کا تزکیہ ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اکثر رذائل کی جڑ بنیاد حبِ مال اور حُبِ جاہ ہے اور حبِ مال حبِ جاہ سے زیادہ عام ہے، زکوٰۃ حبِ مال کو توڑنے کا خاص ذریعہ ہے۔ قرآن مجید میں اکثر مقامات پر زکوٰۃ کو نماز کے ساتھ ساتھ ذکر کیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دین میں زکوٰۃ کی اہمیت نماز ہی کے قریب قریب ہے۔ اسلام میں زکوٰۃ کا جو مقام ہے اس کا اندازہ اس سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد عرب کے جن قبائل نے زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کیا تھا، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اُن کے خلاف جہاد کرنے کا فیصلہ فرمایا اور پھر تمام صحابہ کرامؓ نے اُن کے اس فیصلہ سے اتفاق کیا۔

---

[1] رواہ الترمذی عن ابی ہریرہ۔ کذا فی جمع الفوائد۔ ۱۲

یہ بھی ملحوظ رکھنے کی بات ہے کہ مسلمانوں سے دین کا مالی مطالبہ صرف زکوٰۃ ہی پر ختم نہیں ہوتا ہے، بلکہ اس کے علاوہ اور بھی حقوق ہیں۔ چنانچہ ایک حدیث میں صراحتاً ارشاد ہے ان فی المال حقا سوی الزکوٰۃ[1] مال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی بعض اور حقوق ہیں فقہا نے اپنے اپنے موقع پر اُن حقوق کو بیان بھی کیا ہے۔

قرآن مجید میں انفاق فی سبیل اللہ کا یعنی اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے کا مطالبہ اتنی کثرت سے اور اتنی تاکید سے کیا گیا ہے اور اس کے لئے جا بجا ایسا انداز اختیار کیا گیا ہے کہ گویا وہ ایمان کا لازمی جز ہے ——— یوں تو ہم مسلمانوں میں اللہ کے تمام ہی احکام سے بے فکری اور بے اعتنائی عام ہو گئی ہے اور بہت کم لوگوں کو اس کی فکر رہ گئی ہے، لیکن سب سے زیادہ بے اعتنائی اس انفاق کے مسئلہ میں ہو رہی ہے۔ خصوصاً ہمارے اس زمانہ میں دولت کی محبت اور خود غرضی اتنی بڑھ گئی ہے کہ اپنی دولت دوسرے ضرورت مندوں پر صرف کرنے کا رواج بہت ہی کم ہوتا جا رہا ہے۔ اور اللہ کے جو بندے اس فریضہ کو اب تک ادا کرتے بھی ہیں، اُن میں سے اکثر اس کے مصرف کے بارے میں اور ادائیگی کے طریقے میں بڑی بے فکری اور بے اعتنائی برتتے ہیں اور اسی لئے وہ برکات ان کو حاصل نہیں ہوتیں جن کا قرآن پاک میں اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے والوں کے لئے پختہ وعدہ کیا گیا ہے۔

نماز کی طرح زکوٰۃ کو بھی بہتر طریقہ پر ادا کرنے کی فکر ضروری ہے

زکوٰۃ بھی جب نماز کی طرح ایک رکن ہے تو اس کو بھی بہتر سے بہتر طریقے سے ادا کرنے کی ہمیں نماز ہی کی طرح فکر کرنی چاہئے، جس طرح وہ نماز بے رُوح اور بے نور ہے جو بے فکری سے ادا کی گئی ہو،

---

[1] رواہ الترمذی۔ مشکوٰۃ و جمع الفوائد۔ ۱۲

اُسی طرح وہ زکوٰۃ بھی بے رُوح اور بے نور ہے جس کو بہتر سے بہتر طریقے سے ادا کرنے کی فکر نہ کی گئی ہو اور ادائیگی میں اُس کے آداب کا لحاظ نہ کیا گیا ہو۔

زکوٰتوں کو نورانی بنانے کی تدابیر زکوٰۃ کو نورانی بنانے کے لئے جن چند باتوں کا خاص طور سے لحاظ کرنا چاہیئے، وہ یہ ہیں:۔

اوّل یہ کہ نماز کی طرح اُس کے مسائل سیکھے اور نیت میں اخلاص پیدا کرے۔

دوسرے یہ کہ تلاش کر کے اور سوچ سمجھ کے ایسے مصرف میں صرف کرے جس کو صحیح تر اور بہتر سمجھے اور جس پر صرف کرنے سے اللہ کی رضا کی اور اجر کی زیادہ اُمید ہو۔

تیسرے یہ کہ جس کو دے اُس پر اپنا کوئی احسان نہ سمجھے اور نہ اُس کو حقیر جانے، بلکہ اُس کا احسان مانے کہ اُس کی وجہ سے ہمارا یہ فرض اچھی طرح ادا ہو گیا اور اپنی اس ممنونیت کو اپنے عمل سے اور اپنی زبان سے ظاہر کرے۔

چوتھے یہ کہ دیتے وقت نماز کی طرح یہ دھیان کرے کہ اللہ تعالیٰ حاضر و ناظر ہیں، اور میرے اس عمل کو اور میری نیت کو دیکھ رہے ہیں اور میں اُن ہی کے حکم سے اور اُن کے سامنے اُن کے اس بندہ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔

پھر دے کے اللہ تعالیٰ سے قبول فرمانے کی اور برکت کی دعا کرے، اس کے علاوہ بھی اپنے جن مقاصد کے لئے چاہے دعا کرے، جس طرح نمازوں کے بعد دعا کی جاتی ہے۔

اگر زکوٰتیں اس طرح ادا کی جائیں تو انشاء اللہ دنیا میں بھی ان کی برکتیں دیکھ لی جائیں تجارتوں میں اور زمین کی پیداواروں میں وہ برکت ہو کہ اہل دنیا کی سمجھ میں نہ آئے۔

روزہ نماز اور زکوٰۃ کے بعد تیسرا اعلیٰ رکن "روزہ" ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت میں رُوحانیت اور ملکوتیت کا جو حصہ رکھا ہے، روزہ اس کو ترقی دینے کا اور نفس کی تطہیر اور تزکیہ کا خاص ذریعہ ہے اور قناعت اور صبر و تقویٰ جیسی ملکوتی صفات کے نشو و نما میں زکوٰۃ کو خاص دخل ہے علاوہ اس کے روزہ میں انسان پیٹ کے اور شہوتِ نفس کے خالص مادی اور بہیمی تقاضوں سے بے تعلق ہو کر ملاءِ اعلیٰ سے اور عالمِ ملکوت سے خاص ربط اور مناسبت پیدا کر لیتا ہے۔ لیکن نماز اور زکوٰۃ کی طرح روزے سے بھی یہ مقاصد جب ہی حاصل ہو سکتے ہیں جب کہ وہ عبادت والی فکر کے ساتھ رکھا جائے اور اس کے آداب کا پورا لحاظ رکھا جائے اور اُن تمام باتوں سے پرہیز کیا جائے جو ان مقاصد کے منافی ہیں، جن میں سب سے اہم چیز یہ ہے کہ ہر قسم کے معاصی سے بچا جائے، خاص کر تمام بُری باتوں سے منھ کی اور زبان کی حفاظت کی جائے۔ مگر ایسا نہیں کیا گیا، تو روزے سے یہ رُوحانی نتائج ہرگز حاصل نہیں ہوں گے حدیث شریف میں ہے :-

"مَن لَّمْ یَدَعْ قَوْلَ الزُّوْرِ وَالْعَمَلَ بِهٖ فَلَيْسَ لِلّٰهِ حَاجَةٌ اَنْ يَّدَعَ طَعَامَهٗ وَشَرَابَهٗ"[1]	یعنی جو شخص روزہ میں جھوٹ بولنا اور غلط اور دھوکہ فریب کے کام کرنا نہ چھوڑے تو اللہ کو اس کی کوئی حاجت نہیں ہے کہ وہ کھانا پینا چھوڑ کر صرف بھوکا پیاسا رہے۔

ایک دوسری حدیث میں ارشاد ہے :-

رُبَّ صَائِمٍ حَظُّهٗ مِنْ صِيَامِهٖ الْجُوْعُ وَالْعَطَشُ[2]	یعنی بہت سے روزہ رکھنے والے ایسے بھی ہوتے ہیں کہ اُن کو اُن کے روزہ سے سوائے بھوکا

[1] رواہ البخاری وابوداؤد والترمذی عن ابی ہریرہ۔ کذا فی جمع الفوائد۔ ۱۲ [2] رواہ الطبرانی فی الکبیر عن ابن عمرؓ۔ (جمع الفوائد) ۱۲

اور پیاسا رہنے کے اور کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

بہر حال نماز اور زکوٰۃ کی طرح روزہ میں بھی اس کی ضرورت ہے کہ انکو اہتمام سے ایسے روزے رکھے جائیں جن سے ہماری روحوں کو پاکیزگی حاصل ہو اور ہم میں تقویٰ کی صفت پیدا ہو۔

روزہ کی برکات حاصل کرنے کی شرطیں اور تدبیریں اس کے لئے ایک شرط تو یہی ہے کہ ہر قسم کے معاصی سے اور خاص طور سے منھ اور زبان سے تعلق رکھنے والے گناہوں سے بلکہ مکروہات سے بھی پورا پرہیز کیا جائے جیسا کہ حدیث شریف میں ہے کہ: جھوٹ نہ بولا جائے بخاص کر منھ اور زبان سے تعلق رکھنے والی نیکیوں کی، مثلاً تلاوت اور ذکر کی کثرت کی جائے۔

اور دوسری بات یہ ہے کہ روزہ کی حالت میں اللہ تعالیٰ کی عظمت کا اور اس کے حکم اور امر کا زیادہ سے زیادہ استحضار رکھا جائے یعنی بار بار اس کا مراقبہ اور دھیان کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ حاضر و ناظر ہیں اور میں نے اُن کے حکم سے اور اُن کے لئے کھانا پینا چھوڑ رکھا ہے، اور وہ میرے اس حال کو دیکھ رہے ہیں بخاص کر جب بھوک یا پیاس کا احساس ہو تو دل سے کہا جائے کہ اگرچہ کھانا اور پانی حاضر اور موجود ہے، لیکن اللہ کے حکم کی وجہ سے اور اللہ کو راضی کرنے کے لئے تجھے بھوکا اور پیاسا ہی رہنا ہے، تیرا مالک دمعبود آج تیری اسی بھوک اور پیاس سے خوش ہے اور آج کی یہ بھوک پیاس انشاء اللہ تجھے آخرت کی سخت ترین بھوک پیاس سے بچانے والی ہے۔

افطار اور سحر میں کم کھانا بھی روزہ کو نورانی بنانے والی چیز ہے اور بسیار خوری سے روزہ میں ظلمت اور کدورت پیدا ہوتی ہے اور اس کی تاثیر جاتی رہتی ہے۔

نفلی روزوں کے بارے میں اُسوۂ نبوی اور ہمارا طرزِ عمل روزہ کا بیان ختم کرنے سے پہلے نفلی روزوں کے متعلق بھی کچھ عرض کرنا ہے۔

نماز کے باب میں تو ہمارا یہ حال ہے کہ ہم میں سے کوئی ایسا نہیں ہے جو صرف فرض رکعتوں پر قناعت کرتا ہو اور سنن و نوافل نہ پڑھتا ہو، بلکہ اگر کوئی ایسا طرزِ عمل اختیار کرے تو اُسے بُری نگاہوں سے دیکھا جائے گا اور اُس کے متعلق اچھا خیال قائم نہیں کیا جائے گا لیکن روزہ کے باب میں قریب قریب ہم سب کا طرزِ عمل یہی ہے کہ بس رمضان کے روزے سال میں ایک دفعہ رکھ لیتے ہیں۔ بہت کسی نے ہمت کی تو عرفہ کا یوم عاشورا کا اور شب برات کا ایک ایک روزہ رکھ لیا، حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس طرح فرض نمازوں کے علاوہ نفل نمازیں پڑھتے تھے اور دوسروں کو اس کی ترغیب دیتے تھے، اسی طرح آپ رمضان کے فرض روزوں کے علاوہ نفلی روزے بھی کثرت سے رکھتے تھے اور ان کی بھی اُمت کو ترغیب دیتے تھے۔ ہر مہینے ایام بیض کے یعنی تیرھویں، چودھویں اور پندرھویں تاریخوں کے ۳ روزے تو آپ قریب قریب ہمیشہ ہی رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ دوشنبہ اور پنجشنبہ کو آپ کا اکثر روزہ ہوتا تھا۔ ہمیں اپنے عمل سے حضورؐ کی اِس سنّت کو بھی زندہ کرنا چاہیے۔ روزہ تو بڑی برکت والی اور رُوح کو بہت پاک اور نورانی بنانے والی چیز ہے۔ روزے کے انوار و برکات سے پورے گیارہ مہینے محروم رہنا بڑے خسارے کی بات ہے۔

نفلی روزے نہ رکھنے کا اثر ہمارے رمضان کے روزوں پر بلکہ میری سمجھ میں تو یہ آتا ہے کہ گیارہ مہینے مسلسل روزے نہ رکھنے کی وجہ سے ہمارے رمضان کے روزے بھی گھٹیا ہوتے ہیں، اگر ہر مہینے کچھ روزوں کا معمول ہے تو روزہ کی کیفیات اور اُس کے انوار سے

ایک خاص مناسبت قائم رہے اور پھر رمضان آنے پر ساری حالت بدل جائے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق روایات میں آتا ہے کہ یوں تو آپ ہر مہینے کچھ روزے رکھتے تھے، لیکن خصوصیت سے شعبان میں بہت روزے رکھتے تھے، بلکہ کبھی کبھی تقریباً پورے مہینہ کے روزے رکھتے تھے۔ میرے خیال میں اس کی حکمت یہ بھی تھی کہ روزہ کی حقیقت سے اور اس کے انوار سے طبیعت مبارک کی مناسبت اور زیادہ بڑھ جائے۔ واللہ اعلم۔

بہرحال نفل نمازوں کی طرح ہمیں نفلی روزوں سے بھی شوق پیدا کرنا چاہئے اور ان کی عادت ڈالنی چاہئے۔ اللہ تعالیٰ توفیق دے کم از کم ہر مہینے ۱۳، ۱۴، ۱۵ کا روزہ رکھ لیا کریں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول بھی یہی تھا اور ایک حدیث میں آتا ہے کہ۔

"ہر مہینے میں تین روزے اور ہر سال پورے رمضان کے روزے رکھنا اجر و ثواب کے لحاظ سے ایسے ہے جیسا کہ کوئی ہمیشہ بارہ مہینے روزے رکھے۔[1]"

حج حج اسلام کا آخری رکن ہے۔ اور دوسری عبادات کی طرح اس کی بھی اصل غایت تو اللہ کی رضا ہی ہے، لیکن اس کی ایک خاص اور انیلی نوعیت ہے۔

اللہ کے خلیل حضرت ابراہیم علیہ السلام جن کے ساتھ حضور سرورِ عالم صلی اللہ

---

[1] نفل روزوں کے بارے میں ایک طویل روایت حضرت ابو قتادہؓ سے صاحب جمع الفوائد نے مسلم ابوداؤد اور نسائی کے حوالے سے نقل کی ہے، یہ اسی کا ایک ٹکڑا ہے۔ ۱۲

علیہ وسلم کو اور آپ کی وساطت سے آپ کی امت کو بھی ایک خاص تعلق ہے، حج دراصل اللہ تعالیٰ کے ساتھ اُن ہی کی عبدیت اور فدائیت کی نسبت کا ایک ظاہری و باطنی خاکہ ہے اور حج کے حکم کا مقصد یہ ہے کہ اللہ کا جو بندہ وہاں پہنچ سکے وہ عمر میں ایک دفعہ ضرور اللہ کے لئے اپنا سب کچھ قربان کر دینے والے اس کے خلیل کی ہیئت بنا کر پہنچے اور ان کے کامل عبدیت اور کامل محبت والے مسلک سے اپنی وابستگی کا ثبوت دے اور اللہ کے جو شعائر اُس سرزمین میں ہیں اُن سے عظمت و محبت کے اپنے تعلق کا اظہار کرے اور اپنے ظاہر و باطن کو ابراہیمی رنگ میں رنگنے کا جذبہ اپنے اندر پیدا کرے اور اس طرح اُس کی روح وہاں کے خاص انوار و برکات سے اپنا حصہ لے۔

حج کے متعلق اس سے زیادہ عرض کرنا یہاں کچھ مفید نہ ہوگا، حج کی باتیں حج کرنے ہی سے سمجھ میں آتی ہیں۔

حج کیلئے روح اور باطن کو تیار کرنے کی ضرورت البتہ اتنا عرض کرنا انشاء اللہ مفید ہوگا کہ جب کبھی اللہ تعالیٰ توفیق دے اور آپ حج کا ارادہ فرمائیں، تو اس کے لئے کچھ پہلے سے اپنی روح اور اپنے باطن کو تیار کرنے کی فکر دوسری سب چیزوں سے زیادہ کیجئے۔

افسوس ہے کہ لوگ مادی ضروریات کی تو فکر کرتے ہیں، نمک مرچ، اچار چٹنی تک ساتھ لے جانا چاہتے ہیں، دس دس جوڑے کپڑے بنواتے ہیں اور مہینوں پہلے سے ان چیزوں کے انتظام کی فکر کرتے ہیں، لیکن حج کے لئے روحانی تیاری کی فکر کرنے کا بالکل رواج نہیں، اسی لئے اکثر جانے والے جیسے جاتے ہیں ویسے ہی

آجاتے ہیں۔ ان مادی ضروریات کا انتظام اگرچہ بالکل جائز ہے، بلکہ بقدرِ ضرورت ضروری ہے، لیکن یہ حج کی تیاری نہیں ہے، حج کی اصل تیاری، حج کرنا سیکھنا اور اپنی روح اور اپنے باطن کو حج کے انوار اور برکات لینے کے قابل بنانا ہے۔

اقامت حج کے سلسلہ کا یہ بڑا ضروری کام ہے کہ حج کا ارادہ کرنے والوں کو اس طرف توجہ دلائی جائے اور اس کی اہمیت اور ضرورت بتلائی جائے، حج میں رُوح پیدا کرنے کی اور رسمی حج کو حقیقی بنانے کی یہی صورت ہے۔

اب تک ہم نے اعمال اور عبادات کے سلسلہ میں نماز، روزہ اور حج کا ذکر کیا ہے۔ ایمان کے بعد اسلام کے یہی چار رکن ہیں۔

ارکانِ اسلام کے رکن ہونے کا مطلب اور ان کا امتیاز ان کے رکن ہونے کا مطلب یہی سمجھ میں آتا ہے کہ یہ چاروں چیزیں ایمان کی طرح مقصود بالذات ہیں اور اپنی معین شکل و صورت کے ساتھ مطلوب ہیں اور ایک مسلمان کے مسلمان ہونے کا ان سے عملی ثبوت ملتا ہے۔ ان کے علاوہ بہت سی چیزیں ہیں کہ اگرچہ وہ دین میں ضروری ہیں لیکن ان کی شکل و صورت شریعت نے اس طرح مقرر نہیں کی ہے بلکہ صرف اصول بتلائے ہیں، یا وہ مقصود بالذات نہیں ہیں، بلکہ کسی مقصد کا ذریعہ ہیں، مثلاً دین سیکھنا سکھانا ضروری ہے، فرائض میں سے ہے اسی طرح مثلاً دین کی نصرت اور حمایت بھی فرائض میں سے ہے، لیکن آپ جانتے ہیں کہ نماز روزہ وغیرہ ارکان کی طرح ان کی شکل مقرر نہیں کی گئی ہے اور یہ مقصود بالذات بھی نہیں ہیں، بلکہ تعلیم و تعلم اس لئے ضروری ہے کہ دین پر چلنا اُس پر موقوف ہے اسی طرح دین کی نصرت اور حمایت دین کی

حفاظت اور اس کی ترقی اور ترویج کے لئے مطلوب ہے۔

ایک دوسری بات اس سلسلہ میں یہ بھی کہی جا سکتی ہے کہ اسلام نام ہے اللہ کی بندگی اور فرمانبرداری کا، گویا عبدیت ہی کا دوسرا نام اسلام ہے اور عبدیت کی صفت کا جیسا اظہار ان چار چیزوں سے ہوتا ہے ایسا کسی دوسرے دینی عمل سے نہیں ہوتا، گویا اسی امتیاز کی وجہ سے ان کو رکن قرار دیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں ان کے رکن قرار دیئے جانے کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اگر یہ چاروں عبادتیں صحیح طور پر ادا کی جائیں، جیسا کہ ان کا حق ہے، تو ان کا اثر پوری زندگی پر پڑتا ہے اور پھر پوری زندگی اسلام والی اور عبدیت والی زندگی بن سکتی ہے لیکن شرط یہی ہے کہ یہ صرف ظاہری اور رسمی نہ ہوں، بلکہ اپنے ظاہر و باطن اور اپنے قالب و رُوح میں یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نماز، روزہ اور زکوٰۃ و حج سے کچھ نسبت رکھتی ہوں۔ واقعہ یہ ہے کہ ان چاروں چیزوں میں بڑی تاثیر اور بڑی جان ہے۔ ہماری نمازیں اور ہمارے روزے، ہماری زکوٰتیں اور ہمارے حج اگر آج ہماری زندگیوں پر کوئی بڑا اثر نہیں ڈال رہے ہیں تو اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ بے رُوح اور بے جان ہیں۔ ؎

خُرما نتواں یافت ازاں خار کہ کشتیم
دیبا نتواں بافت ازاں پشم کہ رشتیم

انبیاء علیہم السلام کی اُمتوں میں طولِ امد کی وجہ سے جو تغیرات ہوا کرتے ہیں اُن میں سے ایک بڑا تغیر یہ ہوتا ہے کہ ان کی عبادات میں رسمیت آجاتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت میں بھی یہ تغیر آیا۔ اُن مسلمان کہلانے والوں کا اس وقت ذکر نہیں جنہوں نے سرے سے ان ارکان ہی کو چھوڑ رکھا ہے اور کافروں کی طرح عملاً

ان ارکان سے بالکل بے تعلق اور بے پروا ہو کر زندگی گزار رہے ہیں، اُن کا جو حشر ہونے والا ہے وہ مرنے کے بعد آنکھوں کے سامنے آجائے گا۔ بلکہ ہم اور آپ جیسے مسلمان جن کا تعلق الحمد للہ ان ارکان سے باقی ہے، ان کا بھی عام حال یہ ہے کہ ان کے پاس ان اعمال کا صرف ظاہری خاکہ باقی ہے اور رُوح نکل چکی ہے۔ بہت کم اللہ کے بندے ہوں گے جن کا حال اس عموم سے مستثنیٰ ہے، اگر ہمارے ان ارکان میں سے روح نہ نکل چکی ہوتی تو کم از کم اُمت کے اُن طبقوں کا حال کچھ اور ہوتا جن کا تعلق ان ارکان سے اب بھی باقی ہے وہ اپنے اخلاق میں، معاملات میں، معاشرت میں اور اپنی پوری زندگی میں دنیا سے بالکل ممتاز ہوتے، جس سے ان کا واسطہ پڑتا اور جو اُن کو برتتا وہ اُن کے وجود کو رحمت سمجھتا اور ان میں ایک خاص محبوبیت اور خوشبو محسوس کرتا۔ یہ بالکل حقیقت ہے، اس میں ذرا بھی شاعری نہیں ہے اور اب بھی اللہ کے جن بندوں کا حال اس بگڑے ہوئے عموم سے مستثنیٰ ہے یعنی اُن کی عبادات میں رُوح ہے اور اُن کی نمازوں اُن کے روزوں اور اُن کی زکوٰۃ اور ان کے حجوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نماز روزہ اور آپ کی زکوٰۃ و حج سے کوئی نسبت ہے، ان کی زندگی اب بھی ممتاز ہے اور دیکھنے اور برتنے والوں کے لئے اُن میں محبوبیت اور خوشبو موجود ہے، لیکن حالات کچھ ایسے ہیں کہ ہمارے اس زمانہ میں ایسے بندے تو کبریتِ احمر کی طرح کم ہیں ہی لیکن اُن کے دیکھنے اور برتنے والے بھی کم ہیں۔

ارکان میں حقیقت پیدا کرنے کی کوشش	اللہ توفیق دے، تو اس وقت خدمتِ احیاءِ دین کے سلسلہ کا بنیادی کام ہے،	دین اور احیاءِ دین کے سلسلہ کا

بنیادی کام یہ ہے کہ ان ارکان میں رُوح اور حقیقت پیدا کرنے کی کوشش کی جائے اور اُمت کی نمازوں، روزوں، زکوٰتوں اور حجوں کو ظاہر اور باطن کے لحاظ سے حضورؐ کے نماز، روزے اور زکوٰۃ و حج کے منہاج پر لانے کے لئے جدوجہد کی جائے۔

عبادات کے سلسلہ میں یہاں بس اتنا ہی عرض کرنا تھا، اب اس کے بعد شریعت کے دوسرے شعبوں کے متعلق اسی طرح کی کچھ اصولی باتیں عرض کرنی ہیں۔

اخلاقِ حسنہ

دین میں اخلاق کی اہمیت جس طرح عبادت دین کا ایک شعبہ ہے اور اُس کا ہم بندوں سے مطالبہ کیا گیا ہے، اسی طرح اخلاق کا بھی ایک شعبہ ہے اور دین میں اس کی بھی بڑی اہمیت ہے بلکہ ایک پہلو سے دین کے دوسرے تمام شعبوں کے مقابلے میں اس کو فوقیت اور بالاتری حاصل ہے اور وہ پہلو یہ ہے کہ اخلاق میں بندہ اللہ تعالیٰ کی نیابت کرتا ہے، یعنی اخلاق دراصل خدائی صفات ہیں اور ہمیں یہ حکم ہے کہ ہم بھی اپنی بندگی کی حیثیت کے مطابق وہی صفات اختیار کریں چنانچہ ایک روایت میں ہے:-

"تخلّقوا باخلاق الله" اللہ تعالیٰ کے "اخلاق کو اپنے اخلاق بناؤ۔"

اخلاق کی اس امتیازی حیثیت کو سمجھنے کے لئے پہلے ایک اصولی بات سمجھ لینی چاہئے کہ بندے کے جن اعمال سے اللہ تعالیٰ راضی ہوتا ہے اور جن پر بندہ کو اجر و ثواب ملنے والا ہے، وہ چار قسم کے ہیں۔

اعمالِ صالحہ کی چار قسمیں ایک[1] وہ اعمال جن کے ذریعہ بندہ اللہ تعالیٰ کی عظمت اور اُس کی معبودیت کا اعتراف کرتے ہوئے اس کے سامنے اپنی بندگی اور اپنے عجز و نیاز کا اظہار کرتا ہے۔ یہ شان عبادات کی ہے گویا بندہ اپنی عبدیت کا اظہار عبادات ہی کے ذریعہ

کرتاہے۔

دوسری قسم وہ اعمال ہیں کہ در اصل بندہ اُن کو اپنی دنیوی ضرورت اور نفس کی خواہش سے کرنے پر مجبور ہے، لیکن جب بندہ اُن کو اللہ کی ہدایت اور اللہ کے احکام کی پابندی کے ساتھ کرتاہے، تو اُن پر بھی وہ اللہ کی رضا کا اور اجر وثواب کا مستحق ہوتاہے۔ مثلاً روزی کمانے کے لئے کھیتی باڑی یا تجارت یا مزدوری کرنا بندے کی اپنی ضرورت ہے۔ اسی طرح نکاح کرنا اور بچوں کا پالنا اپنی ضرورت اور اپنے نفس کی خواہش ہے لیکن، اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں کے بارے میں کچھ احکام دیدیئے ہیں کہ اگر اُن کی پابندی کے ساتھ یہ کام کئے جائیں تو بندہ ان کاموں پر بھی اسی طرح اللہ کی رضا کا اور آخرت کے اجر وثواب کا مستحق ہوتاہے جس طرح کہ عبادات پر مستحق ہوتا ہے۔ یہ شان معاملات اور معاشرت کی ہے۔

تیسری قسم وہ اعمال ہیں جو در اصل انبیاء علیہم السلام کے ہیں اور دوسرے لوگ اُن کو ان کی نیابت میں اور اُن ہی کے مشن کی خدمت کے طور پر کرتے ہیں۔ جیسے کہ دینی دعوت، دین کی نصرت دین کے راستے میں جد وجہد اور قربانی، دین کی تعلیم اور تبلیغ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر۔ یہ سب اعمال بھی اللہ تعالیٰ کو بہت راضی کرنے والے ہیں اور بلاشبہ ان میں بہت بڑا اجر وثواب ہے اور ان کا خاص امتیاز یہ ہے کہ یہ انبیاء علیہم السلام کی نیابت والے اعمال ہیں اور ان اعمال کے کرنے والوں کو انبیاء علیہم السلام سے ایک خاص نسبت ہوتی ہے، جو دوسرے اعمال سے حاصل نہیں کی جاسکتی۔

اور چوتھی قسم وہ اعمال ہیں جن میں اللہ تعالیٰ کی نیابت کا رنگ ہے۔ یہ شان

اخلاق کی ہے۔ مثلاً رحم ایک خُلق ہے جو اللہ تعالیٰ میں ہے اور وہ اس کی وجہ سے رحمٰن اور رحیم ہے، پھر بندوں کو بھی اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ وہ اپنے اندر بھی رحم کی صفت پیدا کریں اور ہر قابلِ رحم مخلوق کے ساتھ رحم کا معاملہ کریں۔

اِسی طرح خطا قصور معاف کرنا اور دوسروں کے عیب چھپانا اللہ تعالیٰ کی صفت ہے اور بندوں کو بھی حکم ہے کہ وہ بھی اپنے اندر یہ صفت پیدا کریں۔

علیٰ ہٰذا حیا اور حلم اللہ تعالیٰ کی صفتیں ہیں اور بندوں کو بھی حکم ہے کہ وہ بھی ان کو اختیار کریں۔

ایسے ہی جود و کرم، سخاوت، حاجت مندوں کی مدد کرنا، عدل و انصاف کرنا یہ سب اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں اور بندوں کو بھی حکم ہے کہ وہ یہ صفات اپنے اندر پیدا کریں۔

اسی طرح نیکوں سے نیکیوں سے محبت اور ان کو پسند کرنا اور بُروں سے اور برائیوں سے بغض و نفرت رکھنا اور ان سے ناراض ہونا اللہ تعالیٰ کی صفت ہے اور بندوں کو بھی حکم ہے کہ ان کا حال بھی یہی ہو۔

اخلاق میں ایک گونہ اللہ تعالیٰ کی نیابت ہے الغرض بندے کے تمام اعمال و احوال میں صرف اخلاق کی یہ شان ہے کہ بندہ اس میں اللہ تعالیٰ کی نیابت کرتا ہے یعنی وہ کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ خود کرتے ہیں، یہ شان کسی دوسرے عمل میں نہیں ہے۔ اس لئے اس پہلو سے اخلاق کو بندے کے دوسرے تمام اعمال کے مقابلہ میں امتیاز اور برتری حاصل ہے۔

اخلاق کے متعلق چند احادیث نبوی جب آپ نے شعبۂ اخلاق کی اس امتیازی اہمیت کو سمجھ

لیا تو اب اخلاق کی اہمیت سے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی چند حدیثیں سنئے ۔ارشاد فرمایا:۔

" بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ حُسْنَ الْاَخْلَاقِ " (رواہ مالک و احمد ۔مشکوٰۃ باب حسن الخلق)

اللہ تعالیٰ نے مجھے اسلئے نبی بنا کر بھیجا ہے کہ میں اخلاقی خوبیوں کو درجۂ کمال تک پہنچاؤں ۔

ایک دوسری حدیث میں ہے :۔

۔اَکْمَلُ الْمُؤْمِنِیْنَ اِیْمَانًا اَحْسَنُهُمْ خُلُقًا " (رواہ ابوداؤد والدارمی ۔مشکوٰۃ باب حسن الخلق)

ایمان میں سب سے زیادہ کامل وہ مومنین ہیں جن کے اخلاق زیادہ اچھے ہیں ۔

ایک حدیث کے الفاظ ہیں :۔

۔اِنَّ اَثْقَلَ شَیْئٍ یُوْضَعُ فِیْ مِیْزَانِ الْمُؤْمِنِ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ خُلُقٌ حَسَنٌ " (رواہ الترمذی وابوداؤد ۔مشکوٰۃ)

قیامت کے دن مومن کی میزانِ اعمال میں سب سے زیادہ وزن دار چیز جو رکھی جائے گی ، وہ اس کا اچھا اخلاق ہوگا ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان ارشادات سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ دین میں اخلاق کے شعبہ کی کتنی اہمیت ہے اور اس کا کیا درجہ اور مقام ہے ، لیکن ہم مسلمانوں میں کچھ دیندار بھی ہیں اُن میں سے بھی اکثر کا اب حال یہ ہے کہ وہ شعبۂ عبادات کی اہمیت تو کسی درجہ میں محسوس کرتے ہیں مگر اخلاق اور اسی طرح معاملات اور معاشرت کے متعلق جو احکام ہیں اُن کی اہمیت کو وہ محسوس نہیں کرتے ، بہت سے لوگ تو کچھ ایسا سمجھتے ہیں کہ گویا ان احکام کی پابندی بزرگ اور کامل بننے کے لئے ضروری ہے

اور نجات کے لئے بس نماز روزہ کافی ہے۔ حالانکہ دوزخ سے اور اللہ کے عذاب سے بچنے کے لئے جس طرح نماز روزہ ضروری ہے اسی طرح بُرے اخلاق کا چھوڑنا اچھے اخلاق کا اختیار کرنا بھی ضروری ہے۔

قرآن وحدیث میں اخلاق کی تاکید اور بُرے اخلاق پر سخت وعیدیں

قرآن وحدیث میں جس طرح نماز روزہ وغیرہ عبادات کی تاکید فرمائی گئی ہے اسی طرح اخلاقِ حسنہ کی بھی تاکید فرمائی گئی ہے اور جس طرح عبادت کے حکم کی خلاف ورزی کرنے والوں کو عذاب سے ڈرایا گیا ہے اسی طرح بہت سے بُرے اخلاق پر بھی جہنم کی اور عذاب کی وعید سنائی گئی ہے۔

مثلاً بُخل (یعنی مال کی ایسی محبت اور اُس سے ایسی دلبستگی جو خرچ کے موقعوں پر خرچ کرنے میں رکاوٹ بنے) ایک اخلاقی مرض ہے۔ اسکے متعلق ارشاد ہے۔

وَلَا یَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ یَبْخَلُوْنَ بِمَا اٰتٰھُمُ اللّٰہُ مِنْ فَضْلِہٖ ھُوَ خَیْرًا لَّھُمْ بَلْ ھُوَ شَرٌّ لَّھُمْ سَیُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِہٖ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ ط (آل عمران - ع ۱۸)

مطلب یہ ہے کہ اللہ نے جن کو دولت دی اور وہ اُس میں بخل کرتے ہیں (اور جہاں اسکو خرچ کرنا چاہیئے وہاں خرچ نہیں کرتے) وہ یہ نہ سمجھیں کہ وہ ان کے حق میں کوئی اچھی چیز ہے بلکہ وہ اُن کے حق میں شرِ محض ہے قیامت کے دن یہی دولت جسکے خرچ کرنے میں وہ بخل کرتے ہیں ان کے گلے کا طوق بنائی جائے گی۔

اس آیت میں بُخل پر (جو صرف ایک اخلاقی رذیلہ ہے) کتنی بڑی وعید سنائی گئی ہے۔

اسی طرح سُورۃ ہُمَزَہ میں ایسے لوگوں کو جن میں مال کی گہری محبت اور دوسروں پر طعنہ زنی اور عیب چینی کے بُرے اخلاق ہوں، دوزخ کے عذاب کی وعید سنائی گئی ہے۔ ارشاد ہے:۔

"وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ ۙ	یعنی ان لوگوں کیلئے انجام کی بڑی خرابی ہے
الَّذِي جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهُ ۙ	جن کا حال یہ ہے کہ وہ دوسروں کو روبرو
يَحْسَبُ أَنَّ مَالَهُ أَخْلَدَهُ ۚ	طعنے دیتے ہیں اور پیٹھ پیچھے لوگوں کے عیوب
كَلَّا لَيُنْبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ ۚ	اور ان کی برائیاں بیان کرتے ہیں اور انہیں
	مال و دولت سے ایسی گہری محبت ہے کہ وہ
	اسکو جوڑ جوڑ کے رکھتے ہیں اور گنا کرتے ہیں گویا
	کہ انکا یہ مال ہمیشہ باقی رہے گا یہ لوگ ضرور
	بالضرور دوزخ کا ایندھن بنیں گے۔

الغرض ان آیتوں میں جن برائیوں پر دوزخ کی اور عذاب کی وعید ہے وہ صرف اخلاقی برائیاں ہیں۔

اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض بُرے اخلاق کے متعلق بیان فرمایا ہے کہ یہ دوزخ میں لے جانے والے اور جنت سے محروم کرنے والے ہیں۔ مثلاً کبر کے متعلق ارشاد فرمایا:۔

لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ فِي قَلْبِهِ مِثْقَالُ	جس کے دل میں ذرہ برابر بھی تکبر ہوگا وہ
ذَرَّةٍ مِنْ كِبْرٍ۔ (رواہ مسلم۔ مشکوٰۃ)	جنت میں نہیں جا سکے گا۔

اسی طرح ایک حدیث میں ہے۔

لَا یَدْخُلُ الْجَنَّةَ قَتَّاتٌ۔
(رواہ البخاری بشکوٰۃ)

اس کا مطلب یہ ہے کہ دوسروں کی عیب جوئی کرنے والا اور اُن کے راز معلوم کر کے اُن کو پھیلانے والا جنت میں نہ جا سکے گا۔

اسی طرح ایک حدیث میں ہے:۔

تَجِدُوْنَ شَرَّ النَّاسِ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ذَاالْوَجْهَیْنِ یَاْتِیْ هٰؤُلَاءِ بِوَجْهٍ وَهٰؤُلَاءِ بِوَجْهٍ۔
(رواہ البخاری وسلم۔ مشکوٰۃ)

یعنی قیامت میں حب بُرے حال میں وہ دُو رخا آدمی ہوگا جو ایک گروہ سے ایک رُخ سے ملے اور دوسرے گروہ سے دوسرے رُخ سے مطلب یہ ہے کہ اِن سے ان کی سی بات کرے اور اُن سے اُن کی سی۔

اسی طرح ایک حدیث میں ہے:۔

لَا یَرْحَمُ اللّٰهُ مَنْ لَّا یَرْحَمُ النَّاسَ۔ (بخاری۔ مسلم بشکوٰۃ)

یعنی اللہ تعالیٰ اُس شخص پر رحم نہیں کریگا جو اُس کے بندوں کے ساتھ رحم کا معاملہ نہیں کرتا۔

بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں اطلاع دی ہے کہ:۔

" ایک عورت صرف اپنی اس بے رحمانہ حرکت کی وجہ سے دوزخ میں جائے گی کہ اس نے ایک بلی کو بند کر رکھا تھا اور اُسے کھانے کیلئے کچھ نہیں دیا یہاں تک کہ وہ بھوکی مر گئی "

(رواہ مسلم۔ بشکوٰۃ)

اور اس کے برعکس مخلوق پر رحم کرنے والوں کیلئے اللہ کی خاص رحمت کی خوشخبری

سنائی گئی ہے۔ ایک حدیث میں ہے:۔

اَلرَّاحِمُوْنَ یَرْحَمُهُمُ الرَّحْمٰنُ اِرْحَمُوْا مَنْ فِی الْاَرْضِ یَرْحَمْکُمْ مَنْ فِی السَّمَآءِ (ابوداؤد، مشکوٰۃ)

یعنی رحم کرنے والوں پر اللہ کی رحمت ہوگی، تم زمین پر بسنے والی مخلوق پر رحم کرو۔ آسمان والا خلاق تم پر رحمت کرے گا۔

ایک حدیث میں ہے، حضورؐ نے اس واقعہ کی اطلاع دی کہ:۔

"ایک عورت اس عمل پر بخشی گئی کہ پیاس سے تڑپنے والے ایک کتے کو دیکھ کر اُس کا دل دُکھا، اور اُس نے بڑی محنت سے کنوئیں سے پانی نکال کے اُس کو پلایا اور اُس کی جان بچائی" (مشکوٰۃ)

اور جس طرح مندرجہ بالا حدیثوں میں بعض بُرے اخلاق کے متعلق عذاب کی اور دوزخ کی وعیدیں ہیں، اسی طرح بعض بُرے اخلاق کے متعلق حدیثوں میں آتا ہے کہ جس میں یہ باتیں ہوں وہ مومن نہیں ہے۔ مثلاً ایک حدیث میں ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قسم کھا کر ارشاد فرمایا:۔

وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِهٖ لَا یُؤْمِنُ عَبْدٌ حَتّٰی یُحِبَّ لِاَخِیْهِ مَا یُحِبُّ لِنَفْسِهٖ۔ (رواہ البخاری ومسلم مشکوٰۃ)

قسم اُس اللہ کی جس کے قبضے میں میری جان ہے، کوئی بندہ اُس وقت تک صاحبِ ایمان نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کا یہ حال نہ ہو کہ وہ اپنے ہر بھائی کیلئے وہی چاہے جو اپنے لئے چاہتا ہے۔ یعنی اگر یہ بات نہیں ہے تو وہ پورا مومن اور سچا مسلمان نہیں ہے۔

اسی طرح ایک حدیث میں ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تین بار قسم کھا کر ارشاد فرمایا:۔

وَاللّٰهِ لَا يُؤْمِنُ، وَاللّٰهِ لَا يُؤْمِنُ،	اللہ کی قسم وہ مومن نہیں اللہ کی قسم وہ صاحب
وَاللّٰهِ لَا يُؤْمِنُ، قِيْلَ مَنْ يَا رَسُوْلَ	ایمان نہیں، اللہ کی قسم اُس کو ایمان نصیب
اللّٰهِ: قَالَ الَّذِيْ لَا يَأْمَنُ جَارُهٗ	نہیں۔ عرض کیا گیا: حضرت کون؟ ارشاد
بَوَائِقَهٗ۔ (رواہ مسلم بشکوٰۃ)	فرمایا: وہ بدبخت جس کی شرارتوں سے اس
	کے پڑوسی امن میں نہیں۔

اسی طرح ایک حدیث میں ہے، آپ نے ارشاد فرمایا:۔

لَيْسَ الْمُؤْمِنُ الَّذِيْ يَشْبَعُ وَجَارُهٗ	یعنی وہ بیدرد اور بے رحم مومن نہیں جس
جَائِعٌ إِلٰى جَنْبِهٖ (مشکوٰۃ)	کا حال یہ ہو کہ وہ اطمینان سے پیٹ بھر کے کھائے
	اور اُس کے پہلو میں اُس کا پڑوسی فاقہ سے ہو۔

غور کیجئے ان سب حدیثوں میں جن برائیوں پر دوزخ کی اور عذاب کی وعید سنائی گئی ہے اور جنت سے یا ایمان سے محرومی کا اعلان فرمایا گیا ہے وہ سب اخلاق کے سلسلہ کی چیزیں ہیں۔ ان حدیثوں سے سمجھا جاسکتا ہے کہ دین میں اخلاق کی کتنی اہمیت ہے۔ شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہؒ نے "کتاب الایمان" میں لکھا ہے کہ:۔

"حدیثوں میں جن جن باتوں کے بارے میں یہ فرمایا گیا ہے کہ جس میں یہ باتیں ہوں وہ مومن نہیں ہے اُن کا درجہ کم سے کم یہ ہے کہ وہ شریعت میں حرام ہیں اور اُن سے اپنے کو بچانا واجب ہے۔"

بہرحال اخلاق کی اصلاح کا معاملہ صرف تکمیلی چیز نہیں ہے کہ صرف بزرگ

اور کامل بننے کے لئے اس کی فرصت ہو، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ مسلمان ہونے کے لئے اور دوزخ سے بچنے کے لئے جس طرح نماز روزہ فرض ہے اسی طرح بُرے اخلاق سے بچنا اور اچھے اخلاق کا ہونا ضروری ہے، خاص کر وہ اخلاق جن کی حدیث و قرآن میں خصوصیت کے ساتھ تاکید فرمائی گئی ہے۔ مثلاً۔ صبر، توکل، سچائی، امانت داری، عہد کی پابندی، اخلاص، اللہ و رسول کی سچی اور کامل محبت، دوسروں کی خیر خواہی، دوسروں کے ساتھ نیک گمانی، دوسروں کی پردہ پوشی، رحم، عفو و درگزر، غصہ کا پی جانا، سخاوت، عدل و انصاف، تواضع اور خاکساری، حب فی اللہ اور بغض فی اللہ۔ ان اخلاق کو اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش نہایت ضروری ہے، اسی طرح جو ان کے اضداد بُرے اخلاق ہیں جن کو رذائل کہا جاتا ہے، ان کو اپنے اندر سے نکالنے کی کوشش بھی بے حد ضروری ہے۔

ان اخلاق کے بارے میں قرآن مجید کی آیات اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کچھ "اسلام کیا ہے؟" میں بھی ذکر کیے جا چکے ہیں اور اس سے زیادہ تفصیل "معارف الحدیث جلد دوم" کے مطالعہ سے معلوم کی جا سکتی ہے۔ اس لئے یہاں اس اجمالی بیان ہی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

اب میں معاملات اور معاشرت کے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں۔

معاملات اور معاشرت

معاملات اور معاشرت کا تعلق دراصل ہماری زندگی کی فرورتوں اور خواہشوں سے ہے اور اللہ تعالیٰ نے یہ بڑا فضل فرمایا ہے کہ ان چیزوں کے بارے میں بھی احکام دے کر ہمارے لئے ان کو بھی ثواب کا اور اپنی رضا اور اپنا قرب حاصل کرنے کا ذریعہ بنا دیا ہے، معاملات سے مراد مالی لین دین کے معاملات ہیں، جیسے قرض، امانت، خرید فروخت، نوکری، مزدوری وغیرہ اور معاشرت سے مراد رہن سہن کا وہ برتاؤ ہے، جو اُن لوگوں کے ساتھ کیا جاتا ہے جن سے کسی قسم کا تعلق اور واسطہ پڑتا ہے، خواہ مستقل اور دائمی واسطہ ہو، جیسے ماں باپ اولاد، بھائی بہن اور دوسرے اقارب اور میاں بیوی کا، یا گھر کے برابر رہنے والے پڑوسی کا اور خواہ عارضی اور وقتی ہو، جیسا کہ مثلاً سفر کے رفیقوں کا، یا مدرسہ یا کارخانہ کے ساتھیوں کا۔

دین میں معاملات اور معاشرت کی خصوصی اہمیت اخلاق کی طرح دین میں ان دونوں شعبوں کی بھی بہت بڑی اہمیت ہے، بلکہ ان کو دوسرے شعبوں کے مقابلہ میں اس حیثیت سے خاص امتیاز حاصل ہے کہ ان میں اپنی دنیوی منفعت اور مصلحت اور اپنی خواہش نفس کی اور اللہ کے احکام کی کشمکش دوسرے تمام شعبوں سے زیادہ رہتی ہے۔

مثلاً کاروبار میں منفعت اس میں نظر آتی ہے اور نفس کی خواہش بھی عموماً یہی ہوتی ہے کہ جھوٹ سچ اور جائز ناجائز کا لحاظ نہ کیا جائے بلکہ جیسا موقع ہو اور جس طرح بھی زیادہ نفع کی اُمید ہو وہ کر گزرا جائے، لیکن اللہ کا دین یہ کہتا ہے کہ خبردار چاہے سراسر نقصان ہو اور چاہے بالکل دوالہ نکل جائے، لیکن جھوٹ ہرگز نہ بولو اور صرف اس طریقے سے کاروبار کرو جس کو اللہ نے حلال کیا ہے، اسی طرح معاشرت یعنی آپس کے برتاؤ کا حال ہے اُس میں بھی خواہشِ نفس اور اللہ کے حکم کے درمیان اکثر مقابلہ اور تصادم رہتا ہے، اس لئے بندہ کی بندگی اور فرمانبرداری کا سب سے زیادہ سخت امتحان معاملات اور معاشرت کے احکام میں ہے۔

معاملات اور معاشرت کی اہمیت کا ایک دوسرا پہلو اور دوسرا پہلو ان شعبوں کی اہمیت کا یہ ہے کہ ان کا تعلق اللہ کے بندوں کے حقوق سے بھی ہے یعنی نماز روزہ اگرچہ ارکانِ دین ہیں اور اس حیثیت سے ایمان کے بعد انہی کا درجہ ہے لیکن وہ صرف حق اللہ ہیں اور جو شخص ان میں کوتاہی کرتا ہے وہ صرف اللہ کا مجرم ہوتا ہے، اور اگر توفیق مل جائے اور سچے دل سے استغفار اور توبہ کر کے اپنے گناہ معاف کرالے تو اللہ تعالیٰ کے کرم سے معافی ہی کی اُمید ہے، لیکن معاملات اور معاشرت میں اگر گڑبڑ ہوئی تو اللہ تعالیٰ کی بھی نافرمانی ہوئی اور کسی نہ کسی بندے کی اس میں حق تلفی بھی ضرور ہوئی اور بندے تو عموماً ہم ہی جیسے کم حوصلہ اور تنگ ظرف ہیں، وہ تو قیامت میں اپنی پھوٹی کوڑی بھی نہ چھوڑیں گے۔ ایک حدیث کا مضمون ہے کہ:۔

"بعض لوگ نماز روزہ اور صدقہ و خیرات کی قسم کی بہت سی نیکیاں کما کر بچائیں گے لیکن اگر اُن کے معاملات اور ان کی معاشرت خراب

ہوگی، کسی کا حق مارا ہوگا، کسی کا دل دکھایا ہوگا، کسی کی غیبت کی ہوگی وغیرہ وغیرہ" جب وہ محشر میں مقام حساب میں پہنچیں گے تو جن لوگوں کے معاملاتی اور معاشرتی حقوق اُن کے ذمہ ہوں گے وہ مدعی بن کے کھڑے ہو جائیں گے اور اللہ تعالیٰ سے انصاف کے طالب ہوں گے پھر اللہ تعالیٰ انصاف اور فیصلہ فرمائیں گے اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ نماز، روزہ، صدقہ وخیرات کی قسم کی ان لوگوں کی ساری نیکیاں ان مدعیوں کو دلوادی جائیں گی اور جب ان نیکیوں سے بھی ان لوگوں کے پورے حقوق ادا نہ ہوں گے تو اُن مدعیوں کے کچھ گناہ ان لوگوں پر لاد دیئے جائیں گے اور بالآخر یہ لوگ جہنم میں ڈلوا دیئے جائیں گے۔"

(رواہ مسلم مشکوٰۃ)

بہرحال اس پہلو سے معاملات اور معاشرت کی بڑی اہمیت ہے اور غالباً اسی حیثیت سے ایک حدیث میں معاملات کی اصلاح کو صراحۃً نماز، روزہ اور صدقہ و خیرات سے افضل بتایا گیا ہے، یہ حدیث ترمذی اور ابوداؤد کے حوالہ سے مشکوٰۃ شریف میں نقل کی گئی ہے، اس کے راوی حضرت ابوالدرداءؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن ہم سے فرمایا:-

اَلَا اُخْبِرُكُمْ بِاَفْضَلَ مِنْ دَرَجَةِ الصِّيَامِ وَالصَّدَقَةِ وَالصَّلٰوةِ؟ "کیا میں تمہیں وہ چیز بتاؤں جو روزہ صدقہ اور نماز سے بھی افضل ہے؟"

ابوالدرداء بیان کرتے ہیں کہ ہم نے عرض کیا:- حضرت وہ چیز ضرور بتلائیے ——— آپ نے ارشاد فرمایا:-

قَالَ اِصْلَاحُ ذَاتِ الْبَیْنِ وَفَسَادُ ذَاتِ الْبَیْنِ هِیَ الْحَالِقَۃُ ۔ (رواہ الترمذی وابوداؤد۔ مشکوٰۃ)۔

وہ چیز آپس کے معاملات اور معاشرتی تعلقات کی اصلاح ہے اور ان معاملات اور تعلقات کی خرابی، مونڈ دینے والا اُسترا ہے۔ (بال مونڈنے والا اُسترا نہیں، بلکہ دین کا صفایا کر دینے والا اُسترا)۔

ان دو حدیثوں سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اسلام میں معاملات اور معاشرت کی اصلاح و درستی کی کتنی اہمیت ہے۔ افسوس! آج کل کے بہت سے اچھے خاصے دیندار حلقوں میں بھی معاملات اور معاشرت کی اصلاح و درستی کا اتنا اہتمام نہیں، جتنا کرنا چاہئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ بہت سے لوگ جن کی حالت نماز، روزہ، وغیرہ عبادات کے لحاظ سے کچھ غنیمت بھی ہے، معاملات اور برتاؤ کے لحاظ سے اُن کے بھی اسلامی نہیں۔ ایسی حالت میں عبادتیں اور دعائیں کیا قبول ہوں۔

مشکوٰۃ شریف میں بحوالہ مسند احمد حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

مَنِ اشْتَرٰی ثَوْبًا بِعَشَرَۃِ دَرَاھِمَ وَفِیْہِ دِرْھَمٌ حَرَامٌ لَمْ یَقْبَلُ اللّٰہُ تَعَالٰی لَہٗ صَلٰوۃً مَا دَامَ عَلَیْہِ۔ ثُمَّ اَدْخَلَ اِصْبَعَیْہِ فِیْ اُذُنَیْہِ وَ قَالَ صُمَّتَا اِنْ لَمْ یَکُنِ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ سَمِعْتُہٗ یَقُوْلُہٗ۔

جس شخص نے دس درہم کا کوئی کپڑا خریدا اور ان دس درہم میں ایک درہم حرام ہے (جو کسی ناجائز ذریعہ سے حاصل ہوا تھا) تو جب تک وہ شخص اس کپڑے کو پہنے رہے گا اُس کی کوئی بھی نماز اللہ تعالیٰ قبول نہیں کرے گا۔ حضرت عبداللہ بن عمر نے یہ حدیث سنا کر اپنے کانوں میں انگلیاں

دے کر فرمایا کہ بہرے ہو جائیں میرے یہ کان
اگر میں نے حضور سے یہ بات نہ سنی ہو۔

ایک دوسری حدیث میں ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔
إِنَّ اللّٰهَ طَيِّبٌ لَا يَقْبَلُ إِلَّا طَيِّبًا۔[1]

پھر اس کے بعد آپ نے رزق طیّب حاصل کرنے کی تاکید فرمائی اور پھر آخر میں ایک شخص کا ذکر فرمایا:۔

ثم ذکر الرجل یطیل السفر اشعث اغبر یمد یدیہ الی السماء یا رب و مطعمہ حرام ومشربہ حرام و غذی بالحرام فانی یستجاب لذالک۔ (رواہ مسلم مشکوٰۃ)	جو دور دراز کا سفر کر کے (کسی خاص مقدس اور متبرک مقام پر دعا کرنے کیلئے) اس حال میں آئے کہ اس کے بال پراگندہ ہوں اور سر سے پاؤں تک وہ غبار میں اٹا ہوا ہو، اور آسمان کی طرف دونوں ہاتھ اٹھا اٹھا کے وہ خوب الحاح کے ساتھ دعا کرے اور کہے اے میرے رب اے میرے پروردگار! لیکن اسکا کھانا پینا حرام مال سے ہو اور حرام مال ہی سے اسکی پرورش ہوئی ہو، تو اس حالت میں اسکی یہ دعا کیونکر قبول ہوگی۔

مطلب یہ ہے کہ جب کسی شخص کے کاروباری معاملات درست اور شریعت کے مطابق نہ ہوں اور اُس کا کھانا پہننا حرام مال اور ناجائز آمدنی سے ہو، تو اس کی دعا قابلِ قبول نہیں

---

[1] اللہ تعالیٰ خود پاک ہے وہ صرف پاک مال ہی کو قبول کرتا ہے۔

چاہے وہ ہزاروں میل کا سفر کرکے کسی مقدس اور متبرک مقام پر جاکر ہی دعا کرے۔

ایک اور حدیث میں ہے:-

لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ جَسَدٌ غُذِيَ بِالْحَرَامِ۔ جو جسم حرام غذا اور ناجائز آمدنی سے پَلا
(رواہ البیہقی، مشکوٰۃ) ہو وہ جنّت میں نہ جاسکے گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان ارشادات سے صاف ظاہر ہے کہ اللہ کی رضا اور رحمت حاصل کرنے کے لئے اور سچا مسلمان بننے کے لئے جس طرح نماز، روزہ وغیرہ عبادات اور اخلاقِ حسنہ ضروری ہیں اسی طرح معاملات کی درستی اور ذرائع آمدنی کی صحت اور پاکی بھی ضروری ہے۔

ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے لوگوں سے اپنی بیزاری اور بالکل بے تعلقی کا اعلان فرمایا ہے جو کاروبار میں ایمانداری اور دیانتداری کے اصول کی پابندی نہ کریں۔ صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غلّہ کے ایک ڈھیر کے پاس سے گزرے (جو کسی دکاندار نے لگا رکھا تھا) آپ نے اپنا ہاتھ اُس ڈھیر کے اندر داخل کر دیا تو اندر کچھ نمی اور تری محسوس ہوئی (حالانکہ اوپر سے غلّہ بالکل سوکھا نظر آتا تھا) آپ نے دکاندار سے پوچھا کہ یہ کیا قصّہ ہے کہ اوپر سے تمہارا غلّہ خشک ہے اور اندر سے گیلا ہے، اُس نے کہا کچھ بوندیں پڑگئی تھیں جس سے غلّہ تر ہوگیا تھا، آپ نے فرمایا:- پھر تم نے اُس بھیگے ہوئے غلّہ کو ڈھیر کے اوپر کیوں نہیں ڈالا تاکہ خریدار تمہارے غلّہ کے گیلے پن کو دیکھ سکتا۔ اس کے بعد آپ نے ارشاد فرمایا:-

مَنْ غَشَّ فَلَيْسَ مِنِّيْ۔ (رواہ مسلم، مشکوٰۃ) جو کوئی (کاروبار میں ایسا) دھوکہ کرے، وہ میرا

نہیں (اور میرا اُس سے کوئی تعلق نہیں)۔

اسی طرح جو لوگ اسلام کے سکھائے ہوئے شریفانہ آداب معاشرت کی پابندی نہ کریں، اُن کے متعلق بھی فرمایا گیا ہے کہ وہ ہم میں سے نہیں ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مشہور حدیث ہے:۔

لَیْسَ مِنَّا مَنْ لَمْ یَرْحَمْ صَغِیْرَنَا	جو ہمارے چھوٹوں کے ساتھ ترحم و شفقت
وَلَمْ یَعْرِفْ شَرَفَ کَبِیْرِنَا۔	سے اور بڑوں کیساتھ ادب و احترام سے
(لابی داؤد والترمذی)	پیش نہ آئے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔

ابھی اوپر شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کے حوالہ سے نقل کیا جاچکا ہے کہ جن چیزوں کے متعلق حضورؐ نے یہ فرمایا ہے کہ:۔ جو یہ نہ کرے وہ ہم میں سے نہیں ہے، اس کا کم سے کم درجہ واجب کا فرض ہے۔ پس اس حدیث کی رو سے چھوٹوں کے ساتھ شفقت کا برتاؤ اور بڑوں کے ساتھ ادب اور عظمت کا برتاؤ گویا ہمارے دینی اور شرعی واجبات میں سے ہے حالانکہ یہ ایک خالص معاشرتی مسئلہ ہے۔

معاشرت کا اصل اصول یہ ہے کہ اللہ کے بندوں کی دل آزاری سے بچا جائے اور ان کا حق ادا کرنے کی اور (شریعت کے حدود میں رہتے ہوئے) ان کو خوش کرنے اور خوش رکھنے کی اور ان کے حق کے مطابق ان کو آرام پہنچانے کی پوری کوشش کی جائے اس معاملہ میں اسلام کا جو منشا اور جو نقطۂ نظر ہے اُس کا کچھ اندازہ اس حدیث سے کیا جا سکتا ہے جس میں حضورؐ نے فرمایا ہے کہ:۔

"جب تین آدمی ایک جگہ بیٹھے ہوں تو ایک کو تنہا چھوڑ کر اُن میں سے دو الگ باتیں نہ کریں (ممکن ہے اس سے اُس کا دل دُکھے اور وہ آزردہ

ہو، بلکہ جب کوئی چوتھا آجائے جو اُس کے پاس بیٹھا رہ سکے تو یہ دونوں الگ ہو کر اپنی باتیں کر لیں۔"

لیکن آج ہمارا حال یہ ہے کہ دوسروں کی دل آزاری میں ہمیں لذت آتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہماری اس بیماری کی اصلاح فرمائے، شاید ہم لوگ سب سے زیادہ اس کے مریض ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ایمان کامل نہیں ہو سکتا اور ہماری زندگی اسلامی زندگی نہیں بن سکتی، جب تک کہ اپنے معاملات اور اپنی معاشرت کو بھی درست نہ کریں۔

اخلاق کی طرح معاملات اور معاشرت کے متعلق بھی یہاں صرف اسی قدر پر اکتفا کیا جاتا ہے، ان دونوں شعبوں میں اسلام کی تفصیلی تعلیمات کافی حد تک "اسلام کیا ہے؟" میں بھی لکھی جا چکی ہیں، وہاں سے معلوم کی جا سکتی ہیں۔

اس سے زیادہ تفصیل کے لئے حدیث کے مجموعوں کی طرف رجوع کیا جائے۔

دین کی خدمت و نصرت

> نبوت ختم ہوگئی مگر کارِ نبوت باقی ہے اور اب قیامت تک کے لئے اس کی ذمہ داری امتِ محمدی پر ہے

جیسا کہ شروع ہی میں تفصیل سے بتایا جا چکا ہے "دین اسلام" اس صالح طریق زندگی اور اس خداوندی ہدایت کا نام ہے جس کا پیغام انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے بندوں کو پہنچتا رہا ہے۔ اس سلسلہ میں نبیوں کے دو کام تھے:۔

ایک وحی کے ذریعہ اللہ تعالیٰ سے اس طریق زندگی اور اس ہدایت کا علم حاصل کرنا۔

اور دوسرے اس علم وہدایت کو بندوں تک پہنچانا، بتانا سکھانا اور ان کو اس پر چلانے کی کوشش کرنا۔

ان میں سے پہلا کام تو سلسلۂ نبوت ختم ہونے کے ساتھ ختم ہوگیا ختم نبوت کا مطلب ہی یہ ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے اب کسی کو یہ مقام ومنصب عطا نہیں فرمایا جائے گا کہ وحی کے ذریعہ اُس پر دین و شریعت کے احکام نازل ہوں اور اس کو نبی مان کر اس کی اطاعت و پیروی کرنا لوگوں

کے لئے ضروری ہو۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی اُس ہدایت و شریعت نے جو قیامت تک پیدا ہونے والے سب انسانوں کی رہنمائی کے لئے کافی ہے اور جس کے آخری زمانہ تک محفوظ رہنے کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے انتظام بھی کر دیا گیا ہے، اس ضرورت کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا۔ لیکن سلسلۂ نبوت کا دوسرا کام (یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئی ہوئی اس ہدایت و شریعت کو بندوں تک پہنچانا اور ان کو اس پر چلانے کی کوشش کرنا) باقی اور جاری ہے اور اُمتِ محمدیؐ کا یہ خاص شرف ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نیابت میں وہ اس مقدس مشن کو قیامت تک جاری رکھنے اور اس کا زبرت کو انجام دینے کی ذمہ دار ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ معظمہ میں یہ کام دعوت و تبلیغ سے شروع کیا تھا، لوگوں کو آپ اللہ کی طرف اور اُس کے دین کی طرف بلاتے تھے، اس راستہ پر یہ آپ کا پہلا قدم تھا، پھر جب اللہ تعالیٰ کی توفیق سے اُس کے کچھ بندوں نے آپ کی ایمانی دعوت کو قبول کر لیا اور اپنے لئے اس دینِ حق اور اس صالح طریقِ زندگی کا فیصلہ کر لیا جس کی طرف آپ دعوت دیتے تھے تو ابتدائی دعوت و تبلیغ کے ساتھ ان اہلِ ایمان کی تعلیم و تربیت و تزکیہ و ارشاد اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے کام کا اور اضافہ ہو گیا۔ پھر ایک وقت آیا کہ ہدایت و ارشاد کے اس مقدس مشن کی حفاظت اور اس کو آگے بڑھانے کے لئے اور اللہ کے زیادہ سے زیادہ بندوں کو ایمان و عمل صالح کی دولت سے بہرہ مند کرنے کے لئے اُن باطل کوش مخالف طاقتوں سے نمٹنا ضروری ہو گیا جو اللہ کے نور کی اس شمع کو زبردستی بجھا دینا چاہتی تھیں، یا اس کے راستہ

میں مزاحم ہوتی تھیں، اُس وقت اس مقدس مہم کے پروگرام میں جہاد و قتال کا بھی اضافہ ہوگیا اور پھر زمانہ کی رفتار کے ساتھ یہ سارے کام بھی روز بروز بڑھتے ہی گئے۔ جو لوگ آپ کی دعوت قبول کرتے تھے، اُن کو آپ دین کے بنیادی اصول و احکام بتلانے کے ساتھ اس کی بھی تلقین فرماتے تھے کہ دین کی دعوت و خدمت اور اللہ کے بندوں کی اصلاح و ہدایت کا جو کام اور اس راستہ میں جو جد و جہد میں کر رہا ہوں تمہیں بھی اپنے حالات و امکانات کے مطابق اس میں میرا ساتھ دینا ہے اور اس کام کو اپنا کام بنانا ہے۔ جب تک آپ اس دنیا میں رونق افروز رہے، امت آپ کی زیر قیادت، ہدایت و ارشاد اور دین کی خدمت و نصرت کی اس پیغمبرانہ مہم میں اپنے جان و مال سے پوری طرح آپ کی شریک و رفیق رہی، دعوت و تبلیغ، تعلیم و تربیت، امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے میدانوں میں اور جہاد و قتال کے معرکوں میں آپ کے زیر ہدایت اپنا یہ فرض ادا کرتی رہی، پھر جب آپ اس عالم سے دوسرے عالم کی طرف تشریف لے گئے تو اس پوری مقدس مہم کو اسی طرح جاری رکھنا اور اُس کے تمام شعبوں کے تقاضوں کو انجام دیتے رہنا بطور نیابت اس امت ہی کا فریضہ ہوگیا اور اب قیامت تک کے لئے خدمتِ دین و نصرتِ دین کے ان سب شعبوں میں آپ کی امت ہی آپ کی قائم مقام اور مسئول و جوابدہ ہے۔

اس کام کی اہمیت و فضیلت کے لئے اگرچہ یہی کافی ہے کہ یہ دراصل پیغمبرانہ کام اور کارِ نبوت کی نیابت ہے لیکن پھر بھی اس بارے میں قرآن و حدیث کے بعض تاکیدی اور ترغیبی نصوص یہاں ذکر کر دینا ہی مناسب معلوم ہوتا ہے۔

دین کی خدمت و نصرت کے مختلف شعبے اور مختلف صورتیں جیسا کہ اوپر کی سطروں سے آپ نے سمجھ لیا ہوگا، اس کام کے مختلف شعبے ہیں، دعوت و تبلیغ، تعلیم و تزکیہ، امر بالمعروف

ونہی عن المنکر اور قتال فی سبیل اللہ۔ دین کی نصرت" کا لفظ (جس کے معنی ہیں دین کی مدد) اور اسی طرح "جہاد" اور "جہد" کا لفظ (جس کے معنی ہیں کسی مقصد کے لئے پوری محنت و کوشش) اپنے اصل معنی کے لحاظ سے خدمتِ دین کے ان سب شعبوں پر حاوی ہیں اور قرآن مجید میں یہ دونوں لفظ بکثرت اسی عام معنی میں استعمال ہوئے ہیں اور بعض مقامات پر نصرتِ دین کی آخری مخصوص شکل یعنی قتال فی سبیل اللہ کے لئے استعمال ہوئے ہیں۔

قرآن مجید میں نصرت دین اور جہاد فی سبیل اللہ کی عمومی تاکید و ترغیب پہلے ہم چند وہ آیتیں پیش کرتے ہیں جن میں دین کی مطلق خدمت و نصرت اور دین کے لئے جدوجہد کی بطور عموم تاکید کی گئی ہے یا ترغیب دی گئی ہے، خواہ وہ کسی طور پر اور کسی شکل میں ہو۔ اس کے بعد ہم وہ آیتیں پیش کریں گے جن میں خدمتِ دین کے خاص خاص شعبوں کے لئے تاکید فرمائی گئی یا ترغیب دی گئی ہے۔ پہلے قسم اول کی آیتیں سنئے!

سورۂ مائدہ میں ارشاد ہوا ہے:۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَابْتَغُوا إِلَيْهِ الْوَسِيلَةَ وَجَاهِدُوا فِي سَبِيلِهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ٥
(مائدہ - ع - ۶)

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور اس کے (قرب و رضا کا) ذریعہ تلاش کرو (یعنی ایسے عمل کرو جن سے اس کی رضا حاصل ہو اور اس سلسلہ کا خاص الخاص عمل یہ ہے کہ) اس کے دین کی راہ میں جدوجہد کرو تا کہ تم فلاح پاؤ۔

اور سورۂ حج کے آخر میں ارشاد ہے:۔

وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ
هُوَ اجْتَبٰكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ
فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ
اِبْرٰهِيْمَ هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ
قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ
شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَاءَ
عَلَى النَّاسِ (سورۃ۲۲ ـ ع ـ ۱۰)

اور جدوجہد کرو اللہ کی راہ میں اور اُس کے دین کے راستہ میں جیسی جدوجہد کا اُس کا حق ہے (اے اُمّتِ محمدؐ) اللہ نے تم کو اس خدمت کیلئے چنا ہے، طریقہ ہے تمہارے باپ ابراہیم کا، اس نے تمہارا نام مسلم رکھا ہے اس (کتاب قرآن مجید) میں اور اس سے پہلے (والی کتابوں میں) تو ایسا ہو کہ رسول تو تمہارا نگران و معلم ہو اور (رسول سے دین کی تعلیم و تربیت پا کے) تم باقی دنیا کے نگران و معلم بنو۔

اور سورۂ صف میں ارشاد ہوا ہے:-

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ
عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِنْ عَذَابٍ
اَلِيْمٍ ۝ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ
وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ
وَاَنْفُسِكُمْ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ
كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ
وَيُدْخِلْكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ
تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً

اے ایمان والو کیا میں تمہیں ایک ایسا کاروبار بتا دوں جو دردناک عذاب سے تمہیں نجات دلادے؟ (سنو وہ یہ ہے کہ) تم ایمان لاؤ، اللہ اور اسکے رسول پر اور اس ایمان کے مطابق کو ادا کر کے اپنے حقیقی مومن ہونے کا ثبوت دو) اور اپنے جان و مال سے اللہ کے راستہ میں اور اسکے دین کیلئے جدوجہد کرو، یہ تمہارے لئے سراسر خیر ہے اگر تم کو حقیقت کا علم ہو

فِیْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ۝ وَاُخْرٰی تُحِبُّوْنَهَا نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِیْبٌ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِیْنَ ۝ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْۤا اَنْصَارَ اللّٰهِ كَمَا قَالَ عِیْسَى ابْنُ مَرْیَمَ لِلْحَوَارِیّٖنَ مَنْ اَنْصَارِیْۤ اِلَى اللّٰهِ قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ ـ

(سورۂ صف ۔ ع ۔ ۲)

(تم نے اگر ایسا کیا) تو اللہ تمہارے گناہ بخشدے گا اور تم کو بہشت کے اُن باغات میں پہنچا دیگا جن کے نیچے نہریں جاری ہیں اور سدا بہار جنتوں کے نہایت نفیس مکانات میں تمہیں بسائے گا یہ عظیم الشان کامیابی ہے (اور آخرت کی اس جنت اور کامیابی کے علاوہ اور اُس سے پہلے) ایک دوسری نعمت بھی تم کو عطا کرے گا جسکی تمہیں چاہت ہے (اور وہ ہے) دشمنوں کے مقابلہ میں اللہ کی مدد اور قریبی فتح اور اے پیغمبر آپ ایمان والے بندوں کو اس کی خوشخبری سنا دیجئے ۔ اے ایمان والو! ہوجاؤ اللہ کے مددگار، جیسا کہ عیسیٰ بن مریم نے حواریوں سے کہا تھا کہ کون ہیں میری مدد کرنے والے اللہ کے راستہ میں؟ تو حواریوں نے کہا کہ ہم ہیں اللہ کے انصار اور اسکے راستہ میں آپ کے مددگار۔

سورۂ صف کی ان آیتوں کے آخر میں اس امت کے اہل ایمان کو "کُوْنُوْۤا اَنْصَارَ اللّٰهِ" کے دلنواز نعرے کے ذریعہ دین کی نصرت اور مدد کا حکم اور اس کی ترغیب دیتے ہوئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پکار "مَنْ اَنْصَارِیْۤ اِلَى اللّٰهِ" اور حواریوں کے جواب

«نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰہِ» کا ذکر جس طرح کیا گیا ہے اُس سے یہ بات پوری طرح واضح ہوجاتی ہے کہ ان آیتوں میں جس جہاد اور نصرت کی اہل ایمان کو دعوت و ترغیب دی گئی ہے اُس سے مُراد خاص جہاد بالسیف ہی نہیں ہے، بلکہ دین کی عام کوشش اور مدد مراد ہے، کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور اُن کے حواریوں کے متعلق یہ معلوم و مسلّم ہے کہ انہوں نے کبھی بھی جہاد بالسیف نہیں کیا، ان کا جہاد دعوت و تبلیغ، تعلیم و تزکیہ اور اصلاح و ارشاد کی راہ میں تکلیفیں اٹھانا اور مصیبتیں سہنا ہی تھا۔

بہرحال قرآن مجید کی ان سب آیتوں میں اہل ایمان کو جہاد یا نصرت کے لفظ سے دین کی جد وجہد اور خدمت و نصرت کی جو دعوت دی گئی ہے اس میں ہر وہ سعی و کوشش اور ہر وہ محنت و خدمت اور ہر وہ قربانی داخل ہے جو دین کے فروغ کے لئے اور اللہ کے بندوں کی اصلاح و ہدایت کیلئے کی جائے، خواہ وہ تبلیغ و دعوت کی شکل میں ہو یا تعلیم و تربیت کی شکل میں، یا جنگ و قتال کی صورت میں۔

دین کی جد وجہد اور خدمت و نصرت کے خاص خاص شعبوں کی تاکید و ترغیب اس کے بعد وہ چند آیتیں بھی سُن لیجئے جن میں دینی جد وجہد اور دین کی خدمت و نصرت کے مختلف شعبوں اور اسکی مختلف صورتوں میں سے کسی خاص شعبہ اور کسی خاص صورت کی اہل ایمان کو دعوت و ترغیب دی گئی ہے، یا ہدایت و تاکید فرمائی گئی ہے۔

دعوتِ حق، امر بالمعروف و نہی عن المنکر سورۂ آل عمران میں ارشاد ہے:۔

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاُولٰٓئِكَ	اور ضروری ہے کہ تم میں سے ایک امت ایسی ہو جو لوگوں کو بھلائی کی طرف دعوت دے، نیکی کیلئے لوگوں سے کہے اور بُرائی سے

هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ٥ رہیں گے اور یہ کام کرنے والے ہی فلاح یاب ہوں گے۔ (آل عمران - ع - ۱۱)

اس آیت کے لفظ مِنْكُمْ سے شبہ ہوسکتا ہے کہ دعوت الی الخیر، امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا کام پوری اُمت کے ذمہ نہیں ہے، بلکہ اس کے کسی خاص طبقہ اور خاص گروہ کو یہ کام انجام دینا ہے اور وہی اس کے لئے ذمہ دار ہے لیکن ایسا سمجھنا غلط فہمی ہوگا۔ اولاً تو اس لئے کہ اسی آیت میں آگے فرمایا گیا ہے کہ: "اس کام کو کرنے والے ہی فلاح پانے والے ہیں" اور ظاہر ہے کہ جس نیک کام پر نجات و فلاح کا انحصار ہو وہ امت کے کسی خاص طبقہ اور گروہ کا کام نہیں ہوسکتا۔ علاوہ ازیں اس آیت سے ۳ - ۵ ہی آیتوں کے بعد یہ دوسری آیت ہے:-

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ۔ (آل عمران - ع - ۱۲)

اے پیروانِ محمد تم تمام امتوں میں بہترین امت ہو، جو لوگوں (کی اصلاح و ہدایت) کے لئے ظہور میں لائی گئی ہے، تمہارا کام یہ ہے کہ نیکی کا حکم دیتے ہو، برائی سے روکتے ہو، اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

اس آیت میں اس اُمت کے ظہور کی غرض وغایت ہی یہ بتائی گئی ہے کہ اس کو ایمان باللہ کے ساتھ امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور لوگوں کی اصلاح و ہدایت کی خدمت انجام دینا ہے اس لئے ان آیتوں کی رو سے ان کاموں کی انجام دہی کی ذمہ داری تو پوری امت کی ہے، لیکن ان کاموں کی خاص نوعیت ایسی ہے کہ ان کی انجام دہی کیلئے اکثر حالات میں اُمت کے ہر ہر فرد کا ان میں لگنا ضروری نہیں ہوتا، بلکہ ان کاموں کی اہمیت

اور صلاحیت رکھنے والے لوگ بقدرِ کفایت اگر ان کاموں میں لگ جائیں اور باقی افراد اُمت کی تائید اور تعاون ان کو حاصل رہے تو بھی کام پورا ہو جاتا ہے۔ بہرحال اِس عاجز کا خیال ہے کہ غالباً اسی طرف اشارہ کرنے کے لیے پہلی آیت میں مِنکُم کا لفظ لایا گیا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

ایک آیت اسی سلسلہ میں اور سُن لیجئے۔ سورۂ مائدہ میں ارشاد ہے:۔

لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰى لِسَانِ دَاوٗدَ وَ عِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ۝ كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ۝ (مائدہ۔ ع۔ ۱۱)

بنی اسرائیل میں سے جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی اُن پر لعنت ہوئی اللہ کے نبی داؤد اور عیسیٰ بن مریم کی زبان پر۔ یہ اس لیے ہوا کہ انہوں نے نافرمانی کی اور وہ حدود سے تجاوز کرتے تھے (ان کا ایک خاص گناہ جو اس لعنت کا سبب بنا یہ تھا) کہ جو برائیاں وہ کرنے لگتے تھے آپس میں ایک دوسرے کو اُن سے روکتے نہیں تھے (نہی عن المنکر کا فریضہ انہوں نے معطل کر رکھا تھا) اُن کا یہ بہت بُرا فعل تھا۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر اس درجہ کا فریضہ ہے کہ اس سے غفلت برتنے اور اس کو ترک کرنے کی وجہ سے بنی اسرائیل قابلِ لعنت ہو گئے۔ ظاہر ہے کہ قرآن مجید میں اس کے ذکر کرنے کا خاص مقصد امتِ محمدی کو یہ آگاہی دینا ہے کہ اگر اس بارہ میں اس نے بھی وہی غفلت کی جو بنی اسرائیل نے کی تھی تو بنی اسرائیل ہی کی طرح

وہ بھی اللہ کی خاص رحمت ونصرت سے محروم اور لعنت کی مستحق ہو جائے گی۔

اس موقع پر امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی چند حدیثیں بھی سن لی جائیں:۔

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔

وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ لَتَأْمُرُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ وَلَتَنْهَوُنَّ عَنِ الْمُنْكَرِ اَوْ لَيُوْشِكَنَّ اللّٰهُ اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ عِنْدِهٖ، ثُمَّ لَتَدْعُنَّهٗ وَلَا يُسْتَجَابُ لَكُمْ۔

قسم اُس ذات پاک کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے تم امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرتے رہو، اور اگر ایسا نہیں کروگے تو ضرور ایسا ہوگا کہ اللہ تعالیٰ تم پر اپنی طرف سے کوئی عذاب بھیجے پھر تم (اس عذاب سے نجات کے لئے) اُس سے دعائیں کروگے اور تمہاری دعائیں قبول نہ ہوں گی۔

(رواہ الترمذی)

دراصل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث اسی اشارے کی تفصیل اور وضاحت ہے جو مائدہ کی مذکورہ بالا آیت سے مفہوم ہوتا ہے۔

اور حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

مَنْ رَاٰی مِنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهٖ فَاِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهٖ فَاِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهٖ وَذٰلِكَ

تم میں سے جو شخص کوئی بُرا عمل ہوتے دیکھے تو اگر اپنی طاقت وقوت سے اس برائی کو نیکی سے بدل سکتا ہو تو وہ اپنی طاقت

اَضْعَفُ الْاِیْمَانِ۔	استعمال کرکے اسکی تبدیلی کی کوشش کرے
(رواہ مسلم)	اور اگر اسکی طاقت نہ ہو تو اپنی زبان سے اس
	کی کوشش کرے اور اگر یہ بھی نہ کرسکتا ہو تو
	پھر دل ہی سے کرے (یعنی دل ہی سے اس کو
	بُرا سمجھے اور اسکی اصلاح کے بارے میں سوچتا
	رہے) اور یہ آخری صورت ایمان کے سخت
	ضعف کے وقت ہوگی۔

اور حضرت جریر ابن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

مَامِنْ رَجُلٍ يَكُوْنُ فِىْ قَوْمٍ	جو شخص کسی قوم میں رہتا ہو اور ان کے اندر
يَّعْمَلُ فِيْهِمْ بِالْمَعَاصِىْ	رہ کر اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتا ہو اور وہ لوگ
يَقْدِرُوْنَ عَلٰى اَنْ يُّغَيِّرُوْا	اس کے اس طرزِ عمل کے بدلنے کی قدرت رکھتے
عَلَيْهِ وَلَا يُغَيِّرُوْنَ اِلَّا اَصَابَهُمُ	ہوں لیکن اس کے باوجود نہ بدلیں تو اللہ تعا
اللّٰهُ بِعِقَابٍ قَبْلَ اَنْ يَّمُوْتُوْا۔	مرنے سے پہلے دنیا ہی میں ان کو اپنے عذاب
(رواہ ابوداؤد و ابن ماجہ)	میں مبتلا کرے گا۔

تبلیغ، تعلیم و تربیت، اصلاح و ارشاد اس کے بعد چند آیتیں اور حدیثیں، دعوت و تبلیغ تعلیم و تربیت اور اصلاح و ارشاد کے بارے میں بھی سُن لی جائیں:۔

سورۂ حٰمٓ سجدہ میں ارشاد فرمایا گیا:۔

وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ	اور کون زیادہ اچھا ہوسکتا ہے بات میں

إِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ	اُس شخص سے جس نے بُلایا اللہ کی طرف
إِنَّنِيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ۝	اور نیک عمل کیا اور کہا کہ میں اللہ کے فرمانبرداروں
(حٰم سجدہ - ع - ۵)	میں سے ہوں۔

یعنی اللہ کے نزدیک سب سے اچھی بات اُس بندے کی ہے جو ایمان و عمل صالح کا ذاتی سرمایہ رکھنے کے ساتھ اللہ کے دوسرے بندوں کو بھی اسکی طرف بُلاتا ہو اور ان کی اصلاح کی کوشش کرتا ہو۔

اور سُورۃ العصر میں فرمایا گیا:۔

وَالْعَصْرِ ۝ إِنَّ الْإِنسَانَ لَفِيْ	زمانہ کی گردش کی قسم سارے انسان خسارے میں
خُسْرٍ ۝ إِلَّا الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَ	ہیں خسارے سے بچے ہوئے اور فلاح پانے والے صرف وہ
عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا	بندگانِ خدا ہیں جو ایمان لائیں، نیک اعمال
بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝	کریں اور راہِ حق پر چلنے کی اور نفس کو بُری
	خواہشوں سے تھامے رکھنے کی ایک دوسرے
	کو وصیت اور نصیحت کریں۔

«تَوَاصَوْا بِالْحَقِّ» اور «تَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ» ہدایت وارشاد کا ایسا جامع عنوان ہے جس میں تبلیغ ودعوت، تعلیم وتربیت اور اصلاح وارشاد کی سب ہی صورتیں آ جاتی ہیں۔

ان قرآنی آیتوں کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دو چار حدیثیں بھی سُن لیجئے

حضرت سہل بن سعدؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

وَاللّٰهِ لَأَنْ يَّهْدِيَ اللّٰهُ بِكَ	قسم اللہ کی کسی ایک آدمی کا تمہارے ذریعہ

رَجُلاً خَيْرٌ لَكَ مِنْ حُمُرِ النَّعَمِ۔ (ابو داؤد)

ہدایت پاجانا تمہارے لئے (نہایت قیمتی قسم کے) سُرخ اُونٹوں سے بہتر ہے۔

اور حضرت ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ فرمایا۔

مَنْ دَلَّ عَلَى خَيْرٍ فَلَهُ مِثْلُ أَجْرِ فَاعِلِهِ۔ (رواه مسلم)

اللہ کا جو بندہ کسی دوسرے بندے کو کسی نیک عمل کی رہنمائی کرے تو اس بتانے والے کو بھی کرنے والے کے برابر ثواب ہے۔

اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

هَلْ تَدْرُوْنَ مَنْ أَجْوَدُ جُوْدًا
قَالُوا اللهُ وَرَسُوْلُهُ أَعْلَمُ
قَالَ اللهُ تَعَالَى أَجْوَدُ جُوْدًا
ثُمَّ أَنَا أَجْوَدُ بَنِيْ آدَمَ وَأَجْوَدُ
هُمْ مِنْ بَعْدِيْ رَجُلٌ عَلِمَ عِلْمًا
فَنَشَرَهُ يَأْتِيْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ
أَمِيْرًا وَحْدَهُ أَوْ أُمَّةً وَّاحِدَةً۔
(رواه البيهقي في شعب الايمان)

کیا تم جانتے ہو کہ جود و سخا میں کون سب سے بڑا ہوا ہے؟ صحابہؓ نے عرض کیا، کہ "اللہ اور اس کے رسول ہی کو خبر ہے۔" آپ نے فرمایا، کہ "جود و سخا میں سب سے اعلیٰ اور بالا تو اللہ تعالیٰ ہیں، پھر اس کے بعد جود و سخا میں میرا درجہ ہے اور میرے بعد اُس شخص کا درجہ ہے جس نے اللہ کی ہدایت کا علم حاصل کیا، پھر اس کو پھیلانے اور دوسروں تک پہنچانے میں جد و جہد کی، ایسا شخص قیامت کے دن امیر اور حاکم بن کر آئے گا (یا فرمایا کہ یہ اکیلا شخص

ایک اُمّت بن کر آئے گا)۔

ایک حدیث اسی سلسلہ میں اور بھی سُن لی جائے۔ عبدالرحمٰن بن ابزیٰ راوی ہیں۔

خَطَبَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ذَاتَ یَوْمٍ فَاَثْنٰی عَلٰی طَوَائِفَ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ خَیْرًا ثُمَّ قَالَ مَا بَالُ اَقْوَامٍ لَا یُفَقِّھُوْنَ جِیْرَانَھُمْ وَلَا یُعَلِّمُوْنَھُمْ وَلَا یَعِظُوْنَھُمْ وَلَا یَاْمُرُوْنَھُمْ وَلَا یَنْھَوْنَھُمْ۔ وَمَا بَالُ اَقْوَامٍ لَا یَتَعَلَّمُوْنَ مِنْ جِیْرَانِھِمْ وَلَا یَتَفَقَّھُوْنَ وَیَتَّعِظُوْنَ وَاللّٰہِ لَیُعَلِّمَنَّ قَوْمٌ جِیْرَانَھُمْ وَیُفَقِّھُوْنَھُمْ وَیَعِظُوْنَھُمْ وَیَاْمُرُوْنَھُمْ وَیَنْھَوْنَھُمْ وَلَیَتَعَلَّمَنَّ قَوْمٌ مِنْ جِیْرَانِھِمْ وَیَتَفَقَّھُوْنَ وَیَتَّعِظُوْنَ اَوْ لَاُعَاجِلَنَّھُمُ الْعُقُوْبَۃَ۔ (رواہ الطبرانی فی الکبیر (جمع الفوائد)

ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ ارشاد فرمایا اور اس میں مسلمانوں کے بعض گروہوں اور قبیلوں کی (انکی کارکردگی اور خدمت کی بنا پر) تعریف فرمائی۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا بعض دوسرے گروہوں اور قبیلوں کا یہ کیا حال ہے کہ وہ اپنے پڑوسیوں میں دین کی سمجھ اور اس کا شعور پیدا کرنے کی کوشش نہیں کرتے اور نہ ان کو تعلیم دیتے ہیں اور نہ نصیحتیں کرتے ہیں اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرض بھی ادا نہیں کرتے (اس کے بعد آپ نے روئے سخن بدلتے ہوئے فرمایا) اور بعض گروہوں کا یہ حال ہے کہ وہ پڑوسیوں سے دین کا علم اور اس کا فہم و شعور حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرتے اور نہ وہ اُن سے نصیحتیں لینے کے لئے جاتے ہیں۔ اللہ کی قسم (دین کا علم اور دین کی سمجھ رکھنے والے) ہر گروہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے

پڑوسیوں کی تعلیم کا اہتمام کرے اور ان میں دین
کی سمجھ پیدا کرنے کی کوشش کرے اور ان کو
وعظ و نصیحت کیا کرے اور بُری باتوں سے
ان کو روکا کرے اور اچھی باتوں کیلئے ان سے کہا
کرے۔ اور اسی طرح (جن گروہوں میں علم دین
نہیں) ان کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے علم رکھنے
والے پڑوسیوں سے علم حاصل کیا کریں اور نصیحت
لیا کریں اور دین کو سمجھنے کی کوشش کیا کریں
(بہرحال جاننے والوں کے لئے جاننے
والوں سے سیکھنا ان کے دینی فرائض میں سے
ہے اور ہر گروہ کو چاہئے کہ وہ اپنا یہ فرض
ادا کیا کرے) اور اگر کسی گروہ نے اپنے اس
فریضہ کی ادائیگی میں غفلت اور کوتاہی کی
تو میں ان کو جلدی سخت سزا دلواؤں گا۔

اس حدیث سے یہ بات بہت وضاحت کے ساتھ معلوم ہو گئی کہ دین کی تبلیغ اور ناواقفوں کی تعلیم و تربیت اور اصلاح و ارشاد کے بارے میں اس اُمت کی ذمہ داری کیا ہے اور اگر وہ اس ذمہ داری کو ادا نہ کرے تو اللہ اور رسول کے نزدیک وہ کتنے بڑے جرم کی مرتکب ہے۔

اُمت کی اسی عام ذمہ داری کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ایک بہت مختصر

اور مشہور جملہ میں اس طرح ادا فرمایا۔ اَلَا كُلُّكُمْ رَاعٍ وَ كُلُّكُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ [1] جس کا مطلب یہ ہے کہ تم میں سے ہر ایک اپنے حلقہ کا نگراں ہے اور ہر ایک کو اپنے زیر نگرانی حلقہ کی بابت خدا کے سامنے جواب دہی کرنا ہے۔

ان آیتوں اور حدیثوں سے یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ دین کی خدمت و نصرت کے ان شعبوں اور ان شکلوں یعنی تبلیغ و دعوت، امر بالمعروف و نہی عن المنکر تعلیم و تربیت اور اصلاح و ارشاد کی اس امت پر کتنی عظیم ذمہ داری ہے اور اس کے بارے میں اللہ و رسول کی طرف سے کتنی سخت تاکید ہے اور اس کام کے کرنے والوں کا کیا مقام اور کتنا بلند درجہ ہے اور اس میں غفلت اور سستی کرنے والے کتنے معتوب اور اس کو بالکل چھوڑ دینے والے کتنے ملعون اور مغضوب ہیں۔

قتال فی سبیل اللہ جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے، دین کی خدمت و نصرت کی ایک خاص شکل اور اس کا ایک خاص شعبہ قتال فی سبیل اللہ بھی ہے، اس کے بارے میں آیات و احادیث سننے سے پہلے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ جنگ و قتال اپنی ذات سے ہرگز کوئی اچھی چیز نہیں ہے لیکن جس طرح کسی بیماری کے علاج کے لئے جسم میں انجکشن کی سوئی بھونکی جاتی ہے اور جس طرح آنکھ میں روشنی لانے کے لئے آنکھوں کا بھی آپریشن کیا جاتا ہے، یا جسم کے کسی سڑے ہوئے حصّہ کو کاٹ کر جسم سے الگ کرنا مریض کے ساتھ خیر خواہی سمجھا جاتا ہے، اسی طرح جب کسی بڑے فتنہ و فساد کو روکنے اور کسی ظلم و شرارت سے اللہ کے بندوں کی حفاظت کرنے کے لئے یا اللہ کے اور اس کے بندوں کے درمیان حائل ہونے والی یا ایمانی اور اصلاحی دعوت کی راہ میں مزاحمت کرنے والی کسی ظالم طاقت کا زور توڑنے

---

[1] رواہ البخاری ۔ مشکوٰۃ شریف کتاب الامارۃ۔

کے لیے جنگ و قتال اور طاقت کا استعمال کرنا ہی ناگزیر ہو جائے اور اسکے سوا کوئی چارہ کار نہ رہے اور طاقت کے استعمال سے اصلاح حال کی پوری اُمید ہو، تو اللہ کا دین اسلام اور اس کا مقدس صحیفہ **قرآن مجید** خاص شرائط کے ساتھ جہاد و قتال کی اجازت بلکہ اس کا حکم، اللہ اور رسول پر ایمان لانے والے ان بندوں کو دیتا ہے جو اس کے ضروری مسائل اپنے پاس رکھتے ہوں اور اس کی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کے اہل ہوں۔

جہاد کے بارے میں غلط فہمی کی بنیاد جہاد کے بارے میں غلط فہمی بہت سوں کو دراصل اس سے ہوتی ہے کہ ناواقفی سے اس کا مطلب "مسلمانوں کی قومی جنگ" سمجھا جاتا ہے، حالانکہ اسلام اور قرآن نے ہر قومی جنگ کو حرام قرار دیا ہے، کسی قتال کو "شرعی اور اسلامی جہاد" جب ہی کہا جا سکتا ہے جب کہ وہ محض اللہ کے لئے اور اُس کے کلمہ کو بلند کرنے کے لئے اس کی رضا اور جنت کی طلب اور شوق میں ہو اور ان اخلاقی شرائط اور دینی حدود کی پابندی کیساتھ ہو جو اسلام نے اس کے لئے مقرر کی ہیں۔

پس جو جنگ قوم پرستانہ نقطۂ نظر سے خالص دنیوی اور مادی مقاصد کے لئے کی جائے جیسا کہ مادہ پرستی کے اس دور میں عام طور سے ہوتا ہے تو خواہ اس کے کرنے والے مسلمان ہی ہوں دین و شریعت کی اصطلاح میں اس کو ہرگز جہاد نہیں کہا جائے گا، بلکہ اسلام کی نگاہ میں وہ فساد ہوگا اور اس کے علمبردار مجاہدین نہیں، بلکہ اللہ کی نگاہ میں مجرمین اور مفسدین فی الارض ہوں گے۔

جہاد کے بارے میں قرآنی آیات اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات جہاد کی اس حقیقت کو ذہن میں رکھ کر اب اسکے بارے میں قرآن مجید کی چند آیتیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کچھ حدیثیں سنئے:-

پہلے سورۂ حج کی وہ آیت سنئے، جس کے ذریعہ سب سے پہلے مسلمانوں کو جہاد کی اجازت ملی اور اس کا حکم دیا گیا تھا:۔

أُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقَاتَلُوْنَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوْا وَإِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ ۝ اَلَّذِيْنَ أُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ إِلَّا أَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ۔

جن اہل ایمان کے دشمن ظالموں نے جنگ قائم کر رکھی ہے اب ان کو بھی (مسلح مقابلہ کی) اجازت دی جاتی ہے، کیونکہ مظلوم ہیں اور اللہ ان کی مدد کرنے پر ضرور قادر ہے۔ یہ وہ مظلوم بندے ہیں جو ناحق صرف اس جرم میں اپنے گھروں سے نکالے گئے کہ وہ کہتے تھے کہ ہمارا رب صرف ایک اللہ ہے۔

اس کے بعد ظلم اور زور دستی کی مدافعت کی حکمت اور مصلحت اور حق کی حمایت کرنے والوں کی نصرت کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی ازلی سنّت بیان کرنے کے بعد ارشاد فرمایا گیا ہے کہ (یہ مظلوم بندے جن کو مسلح مقابلہ کی اجازت دی جا رہی ہے، ان کے بارے میں اللہ کو علم ہے، کہ)۔

اَلَّذِيْنَ إِنْ مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَآتَوُا الزَّكٰوةَ وَأَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْأُمُوْرِ ۝ (الحج - ع - ۶)

یہ ایسے ہیں کہ اگر ہماری طرف سے ان کو زمین پر حاکمانہ اقتدار بخشا جائے، تو وہ نمازیں قائم کریں گے، زکوٰۃ ادا کریں گے اور نیکیوں کے احکام جاری کریں گے اور برائیوں کو روکیں گے اور تمام باتوں کا انجام کار اللہ ہی کے ہاتھ ہے۔

سورۂ الحج کی اذنِ جہاد والی آیتوں کے دو خاص نکتے

سورۂ حج کی ان آیتوں سے دو باتیں بہت صفائی کے ساتھ معلوم ہوئیں، ایک یہ کہ مسلح جہاد و قتال کی اجازت اور اس کے حکم کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ اُن ظالموں کا زور توڑ دیا جائے جو دعوتِ حق اور نیکی کی راہ میں حائل ہوتے ہیں اور اللہ کے بندوں کو اس کے راستے پر چلنے سے روکتے اور ان کو طرح طرح سے ایذائیں دیتے اور ستاتے ہیں اور اختیار و اقتدار اُن ہاتھوں میں آجائے جو خدا شناس اور خدا پرست ہوں، نیکیوں اور بھلائیوں کو رواج دینے والے اور منکرات و فواحش سے لوگوں کو روکنے والے ہوں اور ظاہر ہے کہ جب حالات ایسے ہوں کہ یہ مقصد طاقت کے استعمال کے بغیر حاصل نہ ہو سکے تو اس کے لئے طاقت کا استعمال اور جان و مال کی قربانی انسانیت کے حق میں کتنی بڑی نیکی ہوگی۔

دوسری بات اس آیت سے یہ معلوم ہوئی کہ مسلمانوں کا جو گروہ جہاد و قربانی کی اس مقدس راہ میں قدم اٹھائے، اس کو خدا پرستی میں ایسا مخلص اور اتنا پختہ اور تربیت یافتہ ہونا چاہئے کہ جب اس جد و جہد کے نتیجے میں اس کو دنیا کے کسی حصے میں اقتدار و حکومت حاصل ہو جائے، تو وہ حکومتی وسائل کو اپنی نفسانی خواہشات اور دنیاوی تمنائیں پورا کرنے کے بجائے خدا پرستی اور نیکی پھیلانے میں اور ہر قسم کی برائیوں اور خباثتوں سے دنیا کو پاک کرنے میں لگائے اور حکومت اور اُس کے خزانے ہاتھ آجانے کے بعد بھی اللہ کی عبادت اور دنیا کی اصلاح ہی اس کا خاص مشغلہ اور نصب العین رہے۔

افسوس ہے کہ ہمارے اس زمانہ میں مسلمانوں نے، خاص کر مسلمانوں کے اُس طبقہ نے جس کے ہاتھوں میں اس وقت اسلامی ملکوں کا نظامِ حکومت و سیاست ہے، اس حقیقت کو بالکل فراموش کر دیا ہے، آج ان کو اور اُن کے فوجی افسروں اور عام سپاہیوں کو دیکھ کر کسی طرح بھی یہ اندازہ نہیں کیا جا سکتا، کہ ان کو اسلام کے اس نصب العین سے کچھ بھی

تعلق ہے۔

سورۂ توبہ کی ایک آیت میں مجاہدین کے اوصاف

اس کے بعد سورۂ توبہ کی بھی ایک آیت سُن لیجئے، جس میں مجاہدین فی سبیل اللہ کی فضیلت اور ان کے لئے جنت کی خاص بشارت کے ساتھ ان ایمانی اوصاف کا بھی کچھ تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے، جو اُن میں ہونے چاہئیں:-

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ	یقیناً اللہ تعالیٰ نے مومنوں سے ان کی
اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ	جانیں اور ان کا مال اس قیمت پر خرید لیا
لَهُمُ الْجَنَّةَ ؕ يُقَاتِلُوْنَ	ہے کہ مومنین کیلئے جنت ہے (اب جبکہ
فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ	وہ اپنی جانوں کا سودا اللہ سے کر چکے اور سب
وَيُقْتَلُوْنَ وَعْدًا عَلَيْهِ	کچھ اللہ کے ہاتھ بیچ چکے تو) اُن کی شان یہ ہے
حَقًّا فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ	کہ وہ اپنے کسی دنیاوی مقصد کی خاطر نہیں،
وَالْقُرْاٰنِ ؕ وَمَنْ اَوْفٰى	بلکہ اللہ ہی کی راہ میں جنگ کرتے ہیں پس
بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ فَاسْتَبْشِرُوْا	مارتے بھی جاتے ہیں اور مرتے بھی ہیں۔ (ان
بِبَيْعِكُمُ الَّذِيْ بَايَعْتُمْ	جاں فروش اہل ایمان کیلئے اللہ کی طرف سے
بِهٖ ؕ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ	جنت و رحمت کا وعدہ ہے) وعدہ ہے اللہ
الْعَظِيْمُ ۔ اَلتَّآئِبُوْنَ	کے ذمہ جو ثابت اور مقرر ہے (اللہ کی تینوں
الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ	مشہور مقدس کتابوں) توراۃ، انجیل اور
السَّآئِحُوْنَ الرّٰكِعُوْنَ	قرآن میں اور اللہ سے زیادہ اپنے وعدے
السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ	کا پورا کرنے والا کون ہو سکتا ہے (پس اے

بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ
عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحَافِظُوْنَ
لِحُدُوْدِ اللّٰهِ ۭ وَبَشِّرِ
الْمُؤْمِنِيْنَ ۝
(توبہ - ع - ۱۴)

ایمان والو!) اپنے اس سودے پر جو تم نے (اپنے
جان و مال کا) اللہ سے کیا ہے، خوشیاں مناؤ
یہ تمہاری بہت ہی بڑی کامیابی اور فیروزمندی
ہے (اللہ کی راہ میں جنگ کرنے والے ان
اہل ایمان کے اوصاف اور ان کی نشانیاں
یہ ہیں، یہ اپنی خطاؤں اور قصوروں سے توبہ
کرنے والے ہیں، عبادت میں سرگرم رہنے والے
ہیں، اللہ کی حمد و ثنا کرنے والے ہیں (اللہ
کے لئے اور اس کے دین کیلئے، ملک بہ ملک
قریہ بہ قریہ اور دربدر) پھرنے والے ہیں،
رکوع اور سجود کے ذریعہ اللہ کے حضور میں اپنی
بندگی اور نیازمندی ظاہر کرنے والے ہیں
نیکیوں کا حکم دینے والے اور برائیوں سے
روکنے والے ہیں اور اللہ کی مقرر کی ہوئی ساری
حدوں کی حفاظت کرنے والے ہیں اور اے
پیغمبر ان اہل ایمان کو ہماری طرف سے خوشخبری
سنا دیجئے (کہ ہم نے اپنی رضا اور رحمت اور
محبت و جنت ان کے لئے لکھ دی ہے)۔

اور اللہ کی راہ میں اور اس کے دین کی نصرت کیلئے جان اور سر کی بازی لگانے والے

انہی مجاہدین کے متعلق سورۂ صف میں فرمایا گیا ہے:۔

فی سبیل اللہ جم کر قتال کرنے والے بندے اللہ کے محبوب ہیں!

إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ	بلاشبہ اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے ان بندوں سے
يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا	جو اُسکی راہ میں یعنی اس کے مقدس دین اور
كَأَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ	اس کی نازل کی ہوئی ہدایت کی خدمت و
(صف - ع - ۱)	نصرت اور وفاداری میں اس طرح صف بنا
	کر (اور قدم جما کر) جنگ کرتے ہیں کہ گویا وہ
	سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں۔

اللہ کی راہ میں شہید ہونے والے مُردہ نہیں بلکہ زندۂ جاوید ہوجاتے ہیں قتال فی سبیل اللہ کی عظمت شان اور ترغیب و تاکید سے قرآن مجید کے رکوع کے رکوع بھرے ہوئے ہیں، یہاں صرف دو آیتیں اور سُن لیجئے، جن میں بتایا گیا ہے کہ جو بندے اس راہ میں بظاہر مارے گئے ہیں، انہیں نہ مردہ کہا جائے اور نہ مردہ کہا جائے، بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انہیں ایک خاص الخاص زندگی عطا ہوئی ہے، وہاں وہ انواع و اقسام کی نعمتیں پاتے اور شاداں و فرحاں رہتے ہیں۔

سورۂ بقرہ میں ارشاد فرمایا گیا:۔

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ	اور جو بندے راہِ خدا میں مارڈالے جائیں
فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ أَمْوَاتٌ	ان کو مردہ نہ کہو، بلکہ وہ (دوسرے عالم میں
بَلْ أَحْيَاءٌ وَّلٰكِنْ لَّا	خدا کے حضور میں) بالکل زندہ ہیں لیکن تم

تَشْعُرُوْنَ۔ (البقرہ - ع - ۱۹) کہ اس زندگی کا یہاں شعور نہیں ہے۔

اور سورۂ آلِ عمران میں فرمایا گیا:۔

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ؕ بَلْ اَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ۙ فَرِحِيْنَ بِمَا اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ۔ (آلِ عمران - ع - ۱۷)	اور جو بندے اللہ کی راہ میں قتل کئے جائیں ان کو تم مرا ہوا نہ کہو بلکہ وہ (دوسرے عالم میں) اپنے مالک کے حضور میں (جسکے لئے انہوں نے جان دی ہے) زندہ ہیں، ان کو وہاں (انواع و اقسام کا) رزق عطا ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ نے ان کو جو کچھ اپنے فضلِ خاص سے عطا فرمایا ہے وہ اس پر شاداں و فرحاں ہیں۔

زندہ ہو جاتے ہیں جو مرتے ہیں حق کے نام پر
اللہ اللہ موت کو کس نے مسیحا کر دیا

حدیثوں میں جہاد و شہادت کی ترغیب و فضیلت ان آیتوں کے بعد چند حدیثیں بھی قتال فی سبیل اللہ کی فضیلت و ترغیب کے سلسلہ میں سُن لی جائیں۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

لَغَدْوَةٌ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوْ رَوْحَةٌ خَيْرٌ مِنَ الدُّنْيَا وَمَا فِيْهَا۔ (رواہ البخاری و مسلم)	ایک دفعہ صبح کو اللہ کے راستہ میں نکلنا یا ایک دفعہ شام کو نکلنا دنیا و مافیہا سے بہتر اور زیادہ قیمتی ہے۔

اور حضرت عبدالرحمٰن ابن جبیر انصاریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

مَا اغْبَرَّتْ قَدَمَا عَبْدٍ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فَتَمَسَّهُ النَّارُ (رواہ البخاری)

ایسا نہیں ہوگا کہ جس بندے کے قدموں پر اللہ کے راستوں کی گرد پڑی ہو، پھر اس کو دوزخ کی آگ چھو سکے۔

اور حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

اَلْقَتْلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ یُکَفِّرُ کُلَّ شَیْءٍ اِلَّا الدَّیْنَ۔

راہِ خدا میں شہید ہونا ہر چیز کا کفارہ ہو جاتا ہے (اور ہر بوجھ سے وہ بندہ ہلکا ہو جاتا ہے) سوائے قرضے کے۔

اور حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

مَا مِنْ رَجُلٍ یَدْخُلُ الْجَنَّةَ یُحِبُّ اَنْ یَرْجِعَ اِلَی الدُّنْیَا وَلَهٗ مَا فِی الْاَرْضِ مِنْ شَیْءٍ اِلَّا الشَّهِیْدُ یَتَمَنّٰی اَنْ یَرْجِعَ اِلَی الدُّنْیَا فَیُقْتَلَ عَشَرَةَ مَرَّاتٍ لِمَا یَرٰی مِنَ الْکَرَامَةِ۔ (رواہ البخاری ومسلم)

کوئی شخص جنت میں جانے کے بعد یہ نہ چاہے گا کہ وہ پھر دنیا میں واپس جائے، اگرچہ اسکو ساری زمین کی دولتیں اور نعمتیں ملیں البتہ اللہ کی راہ میں شہید ہونے والا بندہ اس کی تمنا کرے گا کہ وہ پھر دنیا میں لوٹایا جائے اور پھر وہ اللہ کی راہ میں قتل کیا جائے دس مرتبہ، بہ سبب اس اعزاز واکرام کے جو وہ وہاں شہادت کے صلہ میں دیکھے گا۔

اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر جہاد میں اپنی شرکت کی تمنا ظاہر کرنے کے بعد ایک حدیث میں فرمایا:-

وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ لَوَدِدْتُ	قسم اُس ذات پاک کی جس کے قبضہ میں میری
اَنْ اُقْتَلَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ثُمَّ	جان ہے، میں چاہتا ہوں کہ اللہ کے راستہ
اُحْیٰ ثُمَّ اُقْتَلَ ثُمَّ اُحْیٰ	میں شہید کیا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں اور پھر
ثُمَّ اُقْتَلَ ثُمَّ اُحْیٰ ثُمَّ اُقْتَلُ	قتل کیا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں اور پھر قتل
(رواہ البخاری ومسلم)	کیا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں اور پھر قتل
	کیا جاؤں۔

قتال فی سبیل اللہ کی عظمت اور اس راہ کی موت یعنی شہادت کی فضیلت معلوم کرنے کے لئے یہی ایک آخری حدیث کافی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی خواہش اور تمنا تھی کہ اللہ کے لئے اور اس کے دین کی وفاداری میں لڑی جانے والی ہر جنگ میں آپ بنفس نفیس شریک ہوں اور اعداء حق کی تلواروں سے آپ شہید ہوں اور پھر زندہ کئے جائیں اور پھر شہید ہوں اور پھر زندہ کئے جائیں اور پھر شہید ہوں۔

ے می خواہم ز خدا بد عا صد ہزاراں جاں
تا صد ہزار بار بمیرم برائے تو!

بہرحال اپنے موقع پر مقررہ حدود و شرائط کے ساتھ جہاد و قتال فی سبیل اللہ بھی کار نبوت یعنی دین کی خدمت و نصرت کا اسی طرح ایک شعبہ ہے جس طرح دعوت و تبلیغ تعلیم و تزکیہ، اصلاح و ارشاد، امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور جیسا کہ پہلے عرض کیا جاچکا ہے اب اُمتِ محمدی ہی خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی قائم مقام اور نائب مناب ہونے کی حیثیت سے قیامت تک ان سب چیزوں کی ذمہ دار ہے۔

امت کی طرف سے نصرتِ دین کے تمام شعبوں کی انجام دہی کا صحیح ترین نظام خلافتِ راشدہ کا نظام تھا

امت کی طرف سے ان کاموں کی انجام دہی کی صحیح ترین شکل تو وہ تھی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد کچھ عرصہ تک "خلافتِ راشدہ" کی شکل میں قائم رہی، وہ پوری امت کا ایک اجتماعی نظام تھا جس نے اپنے کو مقصد اور طریقۂ کار میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کا پوری طرح پابند کرلیا تھا۔

وفاتِ نبوی کے بعد انتخابِ خلیفہ کے مسئلہ کی اصل نوعیت کیا تھی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد امت کے سامنے انتخابِ خلیفہ کا جو سوال آیا تو اس کی نوعیت۔ جیساکہ ناواقفی سے بہت لوگ سمجھتے ہیں، کسی حکمران بادشاہ یا کسی صدر جمہوریہ کے انتخاب کی نہ تھی، بلکہ صحابۂ کرام کے سامنے اس وقت اصل مسئلہ یہ تھا، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خلق اللہ کی ہدایت کے لئے اور دنیا میں اللہ کا کلمہ بلند کرنے اور اس کا دین پھیلانے کے لئے اور دنیا کے نقشے کو اللہ کی مرضی کے مطابق بنانے کے لئے جو جدوجہد کر رہے تھے اور اس سلسلہ میں دعوت وتبلیغ، تعلیم وتزکیہ، امر بالمعروف ونہی عن المنکر اور جہاد وقتال اور اقامتِ عدل کی قسم کے جو مختلف النوع کام اُمت کو ساتھ لے کر انجام دے رہے تھے، اب کون ہم میں اس کے لئے زیادہ اہل ہے کہ اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خلیفہ اور نائب خصوصی بنا کر ہم اس کی سربراہی میں اس مقدس جدوجہد کو اسی طرح جاری رکھیں، اس موقع پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جو خطبہ دیا تھا اس کا ایک فقرہ کتابوں میں یہ بھی نقل کیا گیا ہے:۔

اَلَا اِنَّ مُحَمَّدًا قَدْ مَاتَ وَلَا	حضرت محمد علیہ الصلوٰۃ والسلام کا وصال
بُدَّ لِهٰذَا الدِّیْنِ مِمَّنْ	ہوگیا اور اس دین کے کاموں کے لئے کسی

يَقُوْمُ بِهٖ۔ ایسے آدمی کا انتخاب ضروری ہے جو اس کی ذمہ داریاں سنبھالے۔

(مواقف، المرصد الرابع)

الغرض اس وقت صحابۂ کرام کے سامنے مسئلہ یہی تھا کہ آپ کے فیض یافتوں میں سے کسی ایسی مناسب تر شخصیت کو منتخب کرلیں جو ان سب کا ملوں میں آپ کے جانشین اور خلیفہ کی حیثیت سے آپ ہی کے طرز پر امت کی سربراہی کرے اور امت کا قافلہ اس کی رہنمائی میں اسی طرح اس راستہ پر چلتا رہے جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کا سفر شروع کرا کر دنیا سے تشریف لے گئے ہیں[1]۔

خلافت راشدہ کے دور میں (خاص کر حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کے زمانۂ خلافت میں) یہ سب کام ٹھیک اسی طرح اور اسی طرز پر ہوتے رہے جس طرح اور جس طرز پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ہوتے تھے۔

خلافتِ راشدہ کے بعد دین کی خدمت و نصرت کا نظام

لیکن خلافت راشدہ کے بعد جب حالات بگڑ گئے اور "خلافت برنہج نبوت کی نیابت" کے بجائے شاہی اور جب دنیا کا غلبہ ہوگیا، تو اس تغیر کا سب سے بڑا اثر اس کارِ نبوت پر پڑا اور یہ کام بطور نصب العین کے خلفاء کے سامنے نہیں رہا۔ (مستثنیات کا یہاں ذکر نہیں ہے) لیکن اُمت میں اس فرض کا احساس کم و بیش ہر دور میں رہا، اس لئے اللہ کے باتوفیق بندے اپنی اپنی صلاحیتوں اور زمانہ کے احوال و ظروف کے مطابق اس سلسلہ میں کچھ نہ کچھ کرتے رہے۔ جہاد و قتال کے شعبے کو اپنی خصوصیات اور اپنے شرائط کے ساتھ جاری رکھنے کا کام تو ادارہ حکومت ہی سے

---

[1] انتخاب خلیفہ کے مسئلہ کی اس واقعی نوعیت کو سمجھ لینے کے بعد وہ بہت سی گتھیاں آپ سے آپ سلجھ جاتی ہیں جو اس مسئلہ کے بارے میں شیعہ سنی اختلاف کی بنیاد بن گئی ہیں۔ ۱۲

متعلق تھا، افرادِ اُمت اس میں بے بس تھے اور اسی لئے اس کے مکلف بھی نہیں تھے، لیکن دوسرے شعبے جن کو انفرادی طور پر افراد بھی سنبھال سکتے تھے، ان کو مختلف زمانوں اور مختلف علاقوں میں اپنے حالات کے مطابق اللہ کے بندوں نے سنبھالا، اور دین کی خدمت ونصرت اور ہدایت وارشاد کے ان میدانوں میں جد وجہد ہر دور میں کچھ نہ کچھ ہوتی رہی اور آج دین وایمان کا اور خیر وسعادت کا جو کچھ سرمایہ اس اُمت میں موجود ہے، وہ دراصل اللہ کے ان باتوفیق بندوں کی کوشش ہی کا نتیجہ ہے۔

دین کی خدمت اور اس کی راہ میں جد وجہد کرنیوالے "انصار اللہ" اور "خلفاء نبوی" ہیں

امت کی پوری تاریخ میں اللہ کے جن بندوں نے دین کی خدمت ونصرت اور بندگانِ اللہ کی اصلاح وہدایت کی جو خاص کوششیں اللہ کے لئے کیں، خواہ دعوت وتبلیغ یا تعلیم وتربیت کی شکل میں، خواہ وعظ وارشاد اور تصنیف وتالیف کی شکل میں یا کسی اور صورت میں، وہ بلاشبہ "انصار اللہ" اور "حزب اللہ" میں شامل ہیں، اور اگرچہ حکومت وسلطنت سے ان کا کبھی کوئی واسطہ نہ رہا ہو لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خلافت ونیابت میں ان کا حصہ ہے اور وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلفاء ونائبین میں سے ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ کی تحقیق کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خلافت دو قسم کی ہے

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے "فیوض الحرمین" میں تفصیل سے اس پر روشنی ڈالی ہے کہ جس طرح جہاد وقتال اور اقامتِ عدل وغیرہ خدمت دین ونصرتِ دین کے حکومتی شعبوں کے صحیح طور پر سنبھالنے والے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلفاء ہیں اسی طرح کارِ نبوت کے دوسرے شعبوں مثلاً دعوت وتبلیغ، تعلیم وتربیت، اصلاح و

ارشاد وغیرہ کے سنبھالنے والے اور ان راہوں میں اخلاص اور خدا طلبی کی صفت کیساتھ جد وجہد کرنے والے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلفاء ہیں، فرق بس یہ ہے کہ پہلی قسم کے خلفاء ظاہری اور بیرونی پہلو کے خلفاء ہیں اور دوسری قسم کے خلفاء اندرونی اور باطنی پہلو کے خلفاء ہیں۔ شاہ صاحبؒ نے پہلی قسم کی خلافت کا نام "خلافتِ ظاہرہ" اور دوسری کا نام "خلافتِ باطنہ" رکھا ہے۔ (فیوض الحرمین)۔

حکومت والی خلافت اُمت میں عرصے مفقود ہے لیکن دوسری خلافت باقی وجاری ہے

بلکہ اب تو واقعہ یہ ہے کہ حکومت والی خلافت کا نظام تو عرصہ سے ختم ہو چکا ہے، مسلمانوں کی جو حکومتیں ہیں (اور خیر سے اب بھی چھوٹی بڑی بیسیوں ہیں) یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ ان میں سے اکثر کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم والے مقصد سے کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ ان کو اس کا دعویٰ ہی ہے، بلکہ ان میں سے بعض تو دین اور ہدایت الٰہی سے اتنی ہی بے تعلق اور اس کے بارے میں اتنی ہی "جانب دار" ہیں جتنی کہ یورپ وایشیا کی دوسری نامسلمان سیکولر حکومتیں، والعیاذ باللہ رب العلمین۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دوسری خلافت یعنی حکومتی نظام کے بغیر داعیانہ اور مصلحانہ طور پر آپ کے دین کی خدمت ونصرت اور آپ کی لائی ہوئی ہدایت سے اللہ کے بندوں کو بہرہ مند کرنے کے لئے مخلصانہ جد وجہد باقی وجاری ہے اور اس کا دروازہ کھلا ہوا ہے، بلکہ اس کا میدان آج ہمیشہ سے زیادہ وسیع ہے، اللہ کے بندے اس میدان میں اتریں اور اپنی صلاحیت واستعداد کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے طریقۂ زندگی کو رواج دینے کی کوشش کریں، اس راہ میں محنت ومشقت کرنا اور قربانی دینا ہمارے اس دور کا جہادِ عظیم اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سچی وفاداری اور آپ کی سچی خلافت ونیابت ہے۔ اللہ کے

جو بندے اخلاص اور صدق نیت کے ساتھ اس راستہ پر بڑھیں گے، اللہ تعالیٰ ان کے لئے دوسرے دروازے بھی کھولے گا، مکہ معظمہ میں ایسے ہی حالات میں مسلمانوں کو سورۂ عنکبوت کی آخری آیت کے ذریعہ یہ خوشخبری سنائی گئی تھی :۔

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ ۔

(عنکبوت، آخری آیت)

اور جو بندے ہماری راہ میں اور ہمارے دین کیلئے جدوجہد کریں گے، ہم ان کو اپنے راستوں کی رہنمائی کریں گے، یقیناً اللہ تعالیٰ نیکوکار بندوں کے ساتھ ہے اور ان کا ساتھ دینے والا ہے۔

سیاست وحکومت

سیاست وحکومت ایک حیثیت سے انسانی زندگی کا اہم ترین شعبہ ہے، دنیا کے صلاح وفساد پرسب سے زیادہ اثر اسی کے صلاح وفساد کا پڑتا ہے، اس لئے یہ ممکن نہ تھا کہ اللہ تعالیٰ اپنی ہدایت اور رہنمائی سے اس اہم شعبہ کو بالکل خارج کردیتا اور اسکے بندے بالکل آزاد ہوتے کہ سیاست وحکومت کی گاڑی وہ جس طرح چاہیں چلائیں۔ بہرحال اللہ تعالیٰ کے نازل کئے ہوئے دین اسلام نے اور اس کی اتاری ہوئی ہدایت نے جس طرح انسانی زندگی کے دوسرے شعبوں میں انسان کی رہنمائی کی اور اس کو بتایا کہ یہ کام اس طرح کرنا ٹھیک ہے اور اس کے خلاف کرنا غلط ہے اور گناہ ہے' اسی طرح سیاست وحکومت کے اس شعبہ کے بارے میں بھی اس نے انسانوں کی پوری رہنمائی کی ہے اور اپنے ماننے والوں کو زندگی کے اس میدان میں بھی صحیح اور خدا پرستانہ طریق کار اختیار کرنے کا پابند کیا ہے۔ مسلمان جس طرح عقائد وعبادات میں، اخلاق اور معاشرت ومعاملات میں، دین کی خدمت ونصرت اور اس کے تمام شعبوں میں اللہ ورسول کے احکام اور اُن کی ہدایات پر چلنے کا مکلف ہے، ٹھیک اسی طرح وہ سیاست وحکومت کے بارہ میں بھی ان اصول و احکام کا پابند ہے، جو اسلام نے اس شعبہ سے متعلق دیئے ہیں۔

جن قوموں کے پاس "دین اسلام" جیسا کوئی مکمل ضابطہ حیات نہیں تھا جو آج کل کی ترقی یافتہ اور پُرپیچ سیاست میں بھی ان کی رہنمائی کر سکتا، یا کم از کم ان کا ساتھ ہی دے سکتا، ان کا دین و سیاست کی تفریق کے نظریہ کو اپنانا بالکل قدرتی بات تھی، وہ بیچارے یہ نہ کرتے تو کیا کرتے، لیکن سیاست و حکومت کے کاروبار سے تعلق رکھنے والے مختلف ملکوں کے جن مسلمانوں نے اس نظریے کو اپنایا ہے اور اپنا رہے ہیں، ہر واقف کار جانتا ہے کہ انہوں نے جدید زمانہ کے حالات و اقتضاءات اور سیاست و حکومت سے متعلق اسلامی اصول و تعلیمات کا علمی جائزہ لے کر، غور و فکر کے بعد یہ فیصلہ نہیں کیا ہے کہ اس زمانہ میں سیاست و حکومت کی گاڑی کو اللہ و رسُول کی ہدایت اور اسلامی احکام کا پابند کر کے چلایا نہیں جا سکتا، بلکہ اصل واقعہ یہ ہے کہ سیاست میں اسلامی احکام کا پابند بننے سے خود ان کے ذاتی مفادات اور نفسانی خواہشات اور ان کی بے راہ روی و نفس پرستی پر جو پابندیاں عائد ہوتی ہیں اور انہیں قربانی اور نفس کشی کی جو زندگی اپنانی پڑتی ہے اس کے لئے وہ اپنے آپ کو آمادہ نہیں کر سکے، اس لئے انہوں نے اپنی خیر بھی دین و سیاست کی تفریق ہی میں دیکھی اور یہ نعرہ لگانا شروع کر دیا۔ ورنہ اگر آج کسی ایک مسلمان حکومت کے حکمران حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی مثال کو سامنے رکھ کر تقویٰ اور قربانی والی زندگی اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیں (اور اللہ نے ان کو تفقہ فی الدین بھی دیا ہو، یا اہلِ بصیرت اور اصحابِ تفقہ کا تعاون انہیں حاصل ہو) تو وہ دنیا کو عملی طور پر دکھا سکتے ہیں کہ اس نئے زمانہ میں بھی قومی اور بین الاقوامی میدانوں میں سب سے زیادہ کامیاب وہی سیاست ہو سکتی ہے جو اسلامی تعلیم کی رہنمائی میں چلائی جائے اور اسی سے دنیا کے اُلجھے ہوئے مسائل حل ہو سکتے ہیں۔ ہماری اس دنیا میں اسلام کی سب بڑی مشکل اور اس کے راستہ کی سب سے بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ اس کے ماننے والوں میں

خاص کران کے سربرآوردہ طبقہ میں غالب اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جو اسلام کے اصول واحکام اور اللہ و رسُولؐ کی ہدایات کے مقابلہ میں اپنی نفسانی خواہشات اور ذاتی مفادات کے زیادہ وفادار ہیں۔

بہرحال زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح سیاست و حکومت کے بارہ میں بھی اسلام کی خاص ہدایات اور منضبط اصول واحکام ہیں۔ ہم نے جس طرح پچھلے صفحات میں اسلامی تعلیم کے مختلف شعبوں کے متعلق صرف اصولی گفتگو کی ہے اسی طرح سیاست و حکومت کے متعلق بھی یہاں صرف اصولی ہی گفتگو کی جائے گی، تفصیلات ان کتابوں میں دیکھی جاسکتی ہیں جو خاص اسی موضوع پر لکھی گئی ہیں۔

کائنات کا حقیقی مالک و فرمانروا اسلام سیاست و حکومت کے باب میں جو کچھ رہنمائی کرتا ہے اس میں اساس و بنیاد کی حیثیت اس نظریہ بلکہ عقیدے کو حاصل ہے کہ کائنات کی اس ساری مملکت کا اصل مالک و فرمانروا اُس کا خالق اور پروردگار ہے اور سارے انسان اُس کے بندے ہیں، اصل مالک اُس کے سوا کوئی بھی نہیں ہے۔ قرآن مجید میں جابجا فرمایا گیا ہے:۔

لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔	اللہ ہی کے لئے آسمان وزمین کی بادشاہت ہے۔
لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔	زمین وآسمان کی بادشاہت دراصل اللہ ہی کی ہے۔
اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَاۗءُ مِنْ عِبَادِهٖ۔	دنیا اور اس کی زمین اللہ ہی کی ہے۔ وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہے اس کا وارث بناتا ہے۔

نظریۂ خلافت اسلام کی اصطلاحی زبان میں ادارۂ حکومت کے لئے خلافت اور سربراہ حکومت کے لئے خلیفہ کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے (جس کے اصل معنی جانشین، نائب یا نمائندہ کے ہیں)، یہ صرف ایک لفظی تعبیر ہی نہیں ہے بلکہ اس کی بنیاد اس حقیقت پر ہے کہ اسلامی نظام میں حکمران کی حیثیت صرف یہ ہے کہ وہ ایک مقرر کیا ہوا منتظم اور متولی ہے۔ اس کا منصب یہ نہیں ہے کہ جس طرح چاہے حکومت کرے، بلکہ اس کا مقام و کام صرف یہ ہے کہ دنیا کے جس حصہ کے انتظام کی ذمہ داری اس کے سپرد کی گئی ہے وہ اپنے کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے سچے جانشینوں کا جانشین سمجھتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق اور اس کے مقرر کئے ہوئے اصول و ضوابط کا پابند رہ کر اپنی اس ذمہ داری کو انجام دے، وہ غیر مسئول نہیں ہے، بلکہ اس کو دنیا میں بندوں کے سامنے اور آخرت میں اللہ کے سامنے جواب دینا ہے۔

بہرحال اسلام نے حکومت اور حکمران کے لئے خلافت اور خلیفہ کا لفظ استعمال کر کے اس نظریۂ خلافت کو حکومت کی بنیاد بنا دیا ہے۔

نیز یہ دونوں لفظ اس حقیقت کو بھی یاد دلاتے ہیں کہ اسلامی حکومت اور اُس کے سربراہ کا کام صرف سیاست و حکومت کے دائرہ ہی میں محدود نہیں ہے، بلکہ اس کی اصل ذمہ داری جیسا کہ چند ورق پہلے تفصیل سے بتایا جا چکا ہے یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انسانی دنیا کی ہدایت و اصلاح کا جو کام لے کر آئے تھے وہ اپنے حالات و امکانات کے مطابق اُس کے لئے برابر جدوجہد کرتا ہے۔

الغرض دین و شریعت کی زبان میں اسلامی حکومت کے سربراہ کے لئے لفظ خلیفہ کے استعمال ہونے کا اصل منشا یہی ہے کہ یہ حقیقت نظروں سے کبھی اوجھل نہ ہو کہ اس کی

حیثیت دنیا کے کسی بادشاہ یا راجہ مہاراجہ کی نہیں ہے اور نہ اس کا منصب و مقام وہ ہے جو آج کل جمہوری حکومتوں "میں اُن کے صدر یا وزیر اعظم کا ہوتا ہے، بلکہ اس کی اصل پوزیشن یہ ہے کہ وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کے سچے جانشینوں کا جانشین اور اُن کے مشن کا امین ہے اور اس کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ امورِ مملکت نیز دیگر تمام متعلقہ امور کو آپ ہی کے طریقے پر انجام دے۔

وہ جتنا آپ کے راستہ سے ہٹے گا، منصبِ خلافت کی ذمہ داریوں کے ادا کرنے میں اسی قدر قصور وار ہوگا۔

اسلامی حکومت کے سربراہ (خلیفہ) کا انتخاب ادارۂ خلافت اور خلیفہ کی اسلام میں جو حیثیت ہے اس کے معلوم ہو جانے کے بعد یہ بات آپ سے آپ متعین ہو جاتی ہے کہ یہ کوئی نسلی اور موروثی منصب نہیں ہے کہ باپ کے بعد بیٹا اور اُس کے بعد پوتا گدی کا وارث ہو بلکہ دراصل یہ پوری امت کا حق ہے کہ وہ اس منصب کے لیے جس کو موزوں سمجھے اس کو منتخب کرے، الغرض اسلام میں یہ منصب انتخابی ہے، ہاں اس انتخاب کی عملی شکلیں زمانہ کے حالات کے لحاظ سے مختلف ہو سکتی ہیں، جس کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔

شوریٰ کی پابندی اسلامی نظامِ حکومت میں خلیفہ کو شوریٰ کا بھی پابند کیا گیا ہے، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو صاحبِ وحی بھی تھے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے مامور تھے کہ پیش آمدہ معاملات اور مہمات کے بارے میں (جن میں وحی نے رہنمائی نہ کی ہو) اپنے اصحاب و رفقاء سے مشورہ کریں (وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ)۔

اور قرآن مجید ہی میں ایک دوسری جگہ اُمتِ محمدیہ کا لائحۂ عمل اور دستور بیان

کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: "وَ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ" اور ان کے کام باہمی مشورہ سے ہوتے ہیں۔

لیکن اگر کسی اہم معاملہ میں خلیفہ کو یقین ہو کہ جو کچھ میں سمجھ رہا ہوں وہی صحیح ہے اور اس کے خلاف چلنے میں بڑا خطرہ ہے، تو شوریٰ کے اختلاف رائے کے باوجود وہ اپنے یقین اور شرح صدر کی بنا پر اپنی رائے پر اصرار کر سکتا ہے اور جاننے والے جانتے ہیں کہ عملی دنیا میں یہ بالکل ناگزیر ہے اور آج کی جمہوریتوں میں بھی عملاً بکثرت ایسا ہی ہوتا رہتا ہے۔

اسلام کا حکومتی شوریٰ اور حکومت و اقتدار کا مقصد اگرچہ اوپر کی سطروں سے ضمناً یہ بات معلوم ہو چکی ہے، لیکن مستقلاً بھی اس کا ذکر ضروری ہے کہ اسلام میں حکومت و اقتدار صرف اس مقصد کے لئے مطلوب ہے کہ دنیا میں اللہ پرستی فروغ پائے، نیکیوں کا رواج ہو، اور بداخلاقیوں اور بدکرداریوں کی روک تھام ہو۔ ابھی چند صفحے پہلے سورۂ حج کی اذنِ جہاد والی آیت گزر چکی ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مظلوم اصحابِ کرام کو ان کے ظالم دشمنوں کے خلاف جہاد و قتال کی اجازت دیتے ہوئے اور ان کو اللہ کی مدد کا اطمینان دلاتے ہوئے ان کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ:۔

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَ لِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ (الحج)

یہ ہمارے ایسے بندے ہیں کہ اگر ہم ان کو دنیا کے کسی حصہ میں اقتدار حکومت عطا کر کے حکمران بنا دیں تو یہ نمازیں قائم کریں گے، زکوٰتیں ادا کریں گے، اچھے اخلاق اور اچھے کاموں کے احکام جاری کریں گے اور بداخلاقیوں اور بدکرداریوں کی روک تھام کریں گے۔

یہ آیت گویا اسلام کا حکومتی منشور بھی ہے۔

اسلامی حکومت کی ذمہ داریاں سورۂ حج کی مذکورۂ بالا آیت سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ اسلام میں حکومت و اقتدار صرف اسی لئے مطلوب ہے کہ اللہ پرستی کو فروغ ہو نیکی کا پھیلاؤ اور ترقی کرے اور بدکاری اور بداخلاقی کا خاتمہ ہو اور اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ اسلامی حکومت کی سب سے بڑی ذمہ داری یہ ہے کہ اس مقصد کے حصول کیلئے جو ذرائع ضروری ہوں وہ ممکن حد تک ان کو بروئے کار لائے، مثلاً اس مقصد کا تقاضا جس قسم کے نظام تعلیم کے لئے ہو وہ تعلیمی نظام قائم کرے، اسی طرح اپنی ساری کارروائیوں میں بطور نصب العین کے اس مقصد کو سامنے رکھے، علیٰ ہٰذا القیاس ارشاد و احتساب کا محکمہ قائم کرے، وقت آجانے پر اپنی حفاظت کیلئے اور اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے مقررہ شرائط کے ساتھ جہاد کرے۔

نظریۂ خلافت کے مطابق اسلامی حکومت کی حیثیت چونکہ ایک ایسے انتظامی اور تولیتی ادارے کی ہے جو دراصل اللہ کی طرف سے اس کے ملک ا، اس کی رعیت کا انتظام کرنے کا ذمہ دار ہے اس لئے اس کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے وسائل کی حد تک اس کی پوری پوری فکر اور کوشش کرے کہ اس کے زیرِ انتظام سارے بندوں کو (بلا تفریق مذہب و ملت) زندگی کی ضروریات حاصل ہوں اور کسی بھی طبقہ پر کوئی نامناسب بوجھ نہ پڑے سب اپنے کو امن و حفاظت میں دیکھیں اور ان کی جان و مال اور عزت و آبرو محفوظ ہے۔

عہد نبوی اور خلافت راشدہ کے مثالی دور میں ان تمام ذمہ داریوں کی ادائگی کی جس طرح فکر و کوشش کی جاتی تھی اس کی تفصیلات کتب سیر میں دیکھی جاسکتی ہیں، اور

خلافت وخلیفہ کا لفظ ان سب ذمہ داریوں کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔

اسی طرح اسلامی حکومت کی یہ بھی ایک ذمہ داری ہے کہ انصاف کا ایسا انتظام ہو کہ ہر ایک کے لئے اس کا حاصل کرنا آسان ہو[1]، نیز انصاف بالکل بے لاگ ہو، نہ تعلق اور یگانگت کی بنا پر اور نہ کسی دوسری وجہ سے کسی کے ساتھ خلاف انصاف کوئی رعایت ہو اور نہ مخالفت یا عداوت کی وجہ سے یا کسی اور سبب سے کسی کے ساتھ کوئی زیادتی یا بے انصافی ہو، قرآن مجید میں صراحۃً ارشاد ہے:۔

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ	اللہ تعالیٰ انصاف کا حکم دیتا ہے۔

دوسری جگہ فرمایا گیا ہے:۔

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا	اللہ تعالیٰ تم کو حکم دیتا ہے کہ ساری امانتیں
الْاَمَانَاتِ اِلٰٓی اَھْلِھَا وَاِذَا حَکَمْتُمْ	ان کے حقداروں کو ادا کرو اور جب لوگوں کے
بَیْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْکُمُوْا بِالْعَدْلِ	مابین فیصلے کرو تو ہر فیصلہ انصاف کیساتھ
اِنَّ اللّٰہَ نِعِمَّا یَعِظُکُمْ بِہٖ۔	کرو، اللہ تعالیٰ کی یہ بہت اچھی نصیحت ہے
(النساء۔ رکوع۔ ۸)	جو تم کو کرتا ہے۔

اس آیت میں انصاف کے حکم کے علاوہ اور اس سے پہلے یہ حکم بھی دیا گیا ہے کہ امانتیں ان کے حقداروں کو ادا کی جائیں، عربی زبان اور خاص کر قرآن مجید کی اصطلاح

---

[1] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین جن لوگوں کو کسی علاقہ کا حاکم یا قاضی مقرر کرتے تھے تو ان کو ایک خاص تاکید یہ بھی فرماتے تھے کہ انصاف کے طالبوں اور داد خواہوں کے لئے ان کا دروازہ ہر وقت کھلا رہے اور دروازہ پر کوئی دربان بھی نہ رہے، احادیث وسیرت کی کتابوں میں یہ روایتیں دیکھی جاسکتی ہیں۔ ۱۲

میں امانت کا لفظ بہت وسیع ہے اور اس کی اسی وسعت کی بنا پر ادائے امانت الی اہلہا کے اس حکم میں یہ بھی بہت بڑی ذمہ داری ہے کہ حکومت کے عہدے اور منصب انہیں لوگوں کو سپرد کیے جائیں جو حُسنِ سیرت اور تقویٰ کے لحاظ سے بھی اس کے اہل ہوں۔

بے لاگ انصاف کے بارے میں ایک آیت سورۂ مائدہ کی اور سُن لی جائے ارشاد ہے۔

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا	اے ایمان والو ہمیشہ اللہ کیلئے کھڑے ہونے
قَوّٰامِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ	والے انصاف کے ساتھ شہادت دینے والے
وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ	اور کسی خاص قوم اور گروہ کی عداوت تمہارے
عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ	لئے بے انصافی کرنے کا باعث نہ بن جائے
اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ، وَاتَّقُوا	(ہر معاملہ میں ہر ایک کے ساتھ) انصاف ہی
اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌ بِمَا	کرو کہ یہی قرین تقویٰ ہے اور اللہ سے
تَعْمَلُوْنَ۔	ڈرتے رہو، بلاشبہ اللہ تعالیٰ تمہارے سب
(المائدہ - ع - ۲)	اعمال سے باخبر ہے، کوئی بات اس کے علم
	سے باہر نہیں ہے۔

ان آیتوں کے بعد اس سلسلے میں رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک دو حدیثیں بھی سُن لیجئے، جن میں آپ نے بتایا ہے کہ عادل و منصف حکمران کا مقام اللہ تعالیٰ کے نزدیک کیا ہے اور بے انصافی کرنے والے حاکموں کا انجام آخرت میں کیا ہونے والا ہے۔

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

اِنَّ اَحَبَّ النَّاسِ اِلَى اللّٰهِ يَوْمَ	قیامت کے دن اللہ کو زیادہ محبوب اور

الْقِيَامَةِ وَاَقْرَبَهُمْ مِنْهُ مَجْلِسًا اِمَامٌ عَادِلٌ وَاِنَّ اَبْغَضَ النَّاسِ اِلَى اللّٰهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَاَشَدَّهُمْ عَذَابًا اِمَامٌ جَائِرٌ۔ (رواہ الترمذی)

اُس سے قریب تر منصف حکمراں ہوگا اور اس دن اللہ کو سب سے زیادہ مبغوض اور سب سے زیادہ سخت عذاب میں مبتلا ظلم و بے انصافی سے حکومت کرنے والا حاکم ہوگا۔

اور حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اِنَّ اَفْضَلَ عِبَادِ اللّٰهِ عِنْدَ اللّٰهِ مَنْزِلَةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ اِمَامٌ عَادِلٌ رَفِيْقٌ وَاِنَّ شَرَّ النَّاسِ عِنْدَ اللّٰهِ مَنْزِلَةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ اِمَامٌ جَائِرٌ خَرِقٌ۔ (رواہ البیہقی فی شعب الایمان)

کہ قیامت کے دن اللہ کے بندوں میں افضل ترین وہ صاحب عدل حاکم ہوگا جو نرم اور رحمدل بھی ہو اور بدترین آدمی اس دن اللہ کے نزدیک وہ حاکم ہوگا جو حکومت کرنے میں بے انصاف اور تشدد پسند ہوگا۔

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حکومت اور اہلِ حکومت کے لئے صرف عدل و انصاف ہی نہیں، بلکہ عوام کے دکھ درد کا احساس اور ان کی سہولت اور رفاہیت کے لئے بھی فکرمندی اور دردمندی بھی ضروری ہے۔

حضرت انسؓ کی ایک روایت میں ہے:-

كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا بَعَثَ اَحَدًا مِنْ اَصْحَابِهٖ فِيْ بَعْضِ اَمْرِهٖ قَالَ بَشِّرُوْا وَلَا تُنَفِّرُوْا وَيَسِّرُوْا وَلَا تُعَسِّرُوْا۔ (رواہ البخاری ومسلم)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب اپنے اصحاب میں سے کسی کو حاکم یا عامل بنا کر کسی علاقے کی طرف روانہ کرتے تھے تو اس کو نصیحت فرماتے تھے کہ لوگوں کو خوشخبریاں سناؤ (اور ان میں شوق و جذبہ پیدا کرو) اور ایسی باتیں اُن سے نہ کیجئو جن سے ان میں نفرت اور بُعد پیدا ہو اور اُن

کیلئے آسانیاں اور سہولتیں پیدا کیجیو، ان کو
دشواریوں اور مشکلوں میں نہ ڈالیو۔

اس حدیث سے یہ بات اور زیادہ واضح ہوجاتی ہے کہ اسلامی حکومت اس کی اہل اور سزاوار ہے کہ اس کے کارندوں کا طرز عمل عوام کو مرغوب اور دہشت زدہ کرنے والا اور ان کو مشکلوں اور دشواریوں میں مبتلا کرنے والا نہ ہو، بلکہ اُن کے لئے سہولتیں اور اُن کے دلوں میں امنگیں پیدا کرنے والا ہو۔

قانون یہیں سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ قانون سازی میں بھی یہی بات ایک رہنما، اصول اور بنیادی پالیسی کے طور پر سامنے رکھی جائے گی کہ عوام بے ضرورت دشواریوں اور تنگیوں میں مبتلا نہ ہوں، بلکہ حتی الوسع ان کے لئے آسانیاں اور کشادگیاں پیدا کی جائیں قرآن مجید میں رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں فرمایا گیا ہے:۔

يَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلَالَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ

جن بوجھوں کے نیچے یہ لوگ دبے ہوئے ہیں یہ رسُول ان بوجھوں کو ان کے اوپر سے اتارتے ہیں اور جو بندشیں ان پر چلی آرہی تھیں ان کو یہ رسُول ختم کرتے ہیں۔

قانون کے بارے میں یہ بنیادی اصول بھی ملحوظ رہنا چاہئے کہ اسلام میں قانون کا اصل سرچشمہ اللہ و رسول یا دوسرے لفظوں میں کتاب و سنت ہے، پس جو قوانین کتاب و سنت میں ہمیشہ کے لئے طے کردیئے گئے ہیں، وہ تو مفروغ عنہ ہیں، ان میں کسی ترمیم و تبدیلی کا اب کسی کو اختیار نہیں، لیکن اس دنیا میں پیش آنے والے معاملات اور ضروریات کے بہت سے گوشے وہ ہیں جن کے متعلق قرآن و حدیث میں کوئی صاف حکم موجود نہیں ہے اور حکومت کیلئے

روزمرہ ایسے نئے نئے مسائل پیدا ہوتے رہتے ہیں جن کے لئے حسب ضرورت قانون بنانا حکومت کی ذمہ داری ہے، پس یہ قانون سازی بھی انہیں اصولوں کی روشنی میں ہوگی جو کتاب وسنت اور خلفاء راشدین کے طرز عمل سے مستنبط ہوتے ہیں اور جیسا کہ عرض کیا گیا اس میں عوام کی سہولت اور آسانی کو بھی ایک بنیادی اصول کے طور پر سامنے رکھا جائے گا۔

اسلامی حکومت میں عہدوں کے طالبوں اور خواہشمندوں کو عہدے نہیں دیئے جائیں گے

اسلامی حکومت کے امتیازی اصولوں میں سے ایک یہ بھی قابل ذکر ہے کہ جو شخص کسی حکومتی عہدے کا طالب یا خواہشمند ہو اس کو عہدے کے قابل نہیں سمجھا جاتا۔

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ راوی ہیں کہ میرے خاندان کے دو آدمیوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی حکومتی عہدے کے لئے درخواست کی تو آپ نے فرمایا:۔

اِنَّا وَاللہِ لَا نُوَلِّی عَلٰی ھٰذَا الْعَمَلِ اَحَدًا سَاَلَہٗ وَلَا اَحَدًا حَرَصَ عَلَیْہِ۔ (رواہ البخاری ومسلم)	اللہ کی قسم! ہم کسی ایسے آدمی کو حکومتی عہدہ سپرد نہیں کرتے جو اس کے لئے خود طالب اور حریص ہو[1]۔

اسلامی حکومت کے عہدے داروں کی معاشرت کا معیار زیادہ بلند نہیں ہونا چاہئے

اسی طرح ایک چیز یہ بھی اس سلسلہ میں قابلِ ذکر ہے کہ حکومت کے عہدے داروں کو اکی ممانعت ہے

---

[1] عام اصول تو یہی ہے لیکن اگر کوئی مخلص بندہ کسی خاص موقع پر محسوس کرے کہ اس اہم خدمت کو اللہ کی توفیق سے میں اچھی طرح انجام دے سکتا ہوں تو اس کے لئے یہ جائز ہے کہ وہ اپنے کو پیش کرے اور حکومت کے ذمہ دار اگر مطمئن ہوں، تو وہ خدمت اس کے سپرد کر سکتے ہیں۔ ۱۲

کہ وہ بڑے لوگوں کی سی زندگی گزاریں، بلکہ انہیں حکم ہے کہ ان کی زندگی کا معیار زیادہ بلند نہ ہو۔

حضرت عمر بن الخطابؓ سے متعلق مروی ہے کہ وہ اپنے عہد خلافت میں جب عمّال حکومت کو اپنے عہدے کا چارج لینے کے لئے رخصت کرتے تھے تو ان پر پابندی لگا دیتے تھے کہ وہ اپنے علاقۂ حکومت میں ٹھاٹھ باٹھ سے نہ رہیں، سواری اور کھانے میں بھی بڑے لوگوں کا طریقہ اور فیشن اختیار نہ کریں اور اگر وہ اس ہدایت کی خلاف ورزی کریں گے تو نااہل قرار دیئے جائیں گے اور سزا کے مستحق ہوں گے، حدیث کی کتابوں میں ان کی اس ہدایت کے یہ الفاظ نقل کئے گئے ہیں:۔

شَرَطَ عَلَيْهِمْ اَنْ لَا تَرْكَبُوْا	تم اپنی سواری کے لئے ترکی گھوڑا نہ رکھنا،
بِرْذَوْنًا وَلَا تَاكُلُوْا نَقِيًّا	اور روٹی میدے کی نہ کھانا (یعنی ملکا آٹے کی
وَلَا تَلْبَسُوْا رَقِيْقًا وَلَا تَغْلِقُوْا	کھانا) اور باریک قسم کے کپڑے نہ پہننا،[1]
اَبْوَابَكُمْ دُوْنَ حَوَائِجِ النَّاسِ	اور اپنی ضرورتیں لے کر آنے والے عوام کے
فَاِنْ فَعَلْتُمْ شَيْئًا مِّنْ ذٰلِكَ	لئے اپنا دروازہ بند نہ کرنا اور اگر تم ان میں سے
فَقَدْ حَلَّتْ بِكُمُ الْعُقُوْبَةُ	کوئی ایک بات بھی کی، تو تم سزا پاؤ گے،
ثُمَّ يُشَيِّعُهُمْ۔	اس ہدایت اور تنبیہ کے بعد آپ انہیں
(مشکوٰۃ)	رخصت کرتے تھے۔

شروع میں شَرَطَ عَلَيْهِمْ کے لفظ اور آخر میں عُقُوْبَة یعنی سزا کی آگاہی سے

---

[1] اس زمانہ میں یہ تینوں باتیں یعنی سواری کے لئے ترکی گھوڑا رکھنا، میدے کی روٹی کھانا اور باریک کپڑا پہننا بڑے لوگوں کا طریقہ اور فیشن تھا۔ ۱۲

ظاہر ہے کہ حضرت عمرؓ کے نزدیک اس کی حیثیت صرف ایک مستحسن اور پسندیدہ بات کی نہ تھی، بلکہ وہ اپنے عمّال حکومت کے لئے ان ہدایات کی پابندی ضروری سمجھتے تھے۔

حکومت و سیاست سے متعلق اسلام کی جو تعلیمات اور اللہ و رسول کی جو ہدایات اوپر کی سطروں میں ذکر کی گئیں، ظاہر ہے کہ ان پر عمل کرنے اور ان کے مطابق نظام حکومت چلانے کی اصل ذمہ داری ان مسلمانوں پر ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے کسی حصۂ زمین کا اقتدار بخشا ہے، ان کے علاوہ ان ملکوں کے مسلمانوں کے جو دوسرے طبقے ہیں اُن کی ذمہ داری یہ ہے کہ اپنی حکومت کو اللہ و رسول کی مرضی کے مطابق اس منہاج کا پابند کرنے کے لئے جو خدمت اور مدد اور جد و جہد وہ کر سکتے ہوں جس سے اس مقصد تک پہنچنے کی حقیقت پسندانہ توقع ہو وہ اس میں دریغ نہ کریں۔

اسلامی ممالک کی موجودہ حکومتوں کو اسلامی حکومت بنانے کے سلسلہ کا بنیادی کام!

اس جگہ یہ عرض کر دینا بھی اپنی ذمہ داری معلوم ہوتی ہے کہ اسلام کے مزاج، مسلمانوں کی پچھلی تاریخ اور اپنے زمانہ کے احوال پر غور کرنے کے بعد کہیں اس میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے کہ جن علاقوں میں مسلمان خدا کے فضل سے اکثریت میں ہیں اور اس وجہ سے وہاں اقتدار مسلمانوں ہی کے ہاتھوں میں ہے، وہاں بھی حکومت کو صحیح معنی میں اسلامی حکومت بنانے کی سچی خواہش رکھنے والوں کے لئے سب سے پہلا بنیادی کام کرنے کا یہی ہے کہ وہاں کے مسلمانوں کی زندگی کو ایمانی اور اسلامی بنانے کی کوشش کی جائے اور زندگی کے ایمانی و اسلامی بننے کا مطلب اور اس کا معیار یہ ہے کہ دنیا کی فکر اور محبت پر آخرت کی فکر اور دین کی محبت غالب ہو جائے اور رضائے الٰہی کی طلب اور ثواب آخرت کی طمع میں نفس

کی خواہشوں کو قربان کرنا ان کے لئے آسان ہوجائے۔ مسلمانوں میں جب تک وسیع پیمانے پر اصلاحی جدوجہد کے ذریعہ یہ تبدیلی نہ ہوگی، کم از کم ہمارے اس زمانہ میں وہاں کی حکومت کا صحیح معنی میں اسلامی حکومت بن جانا، ایک خواب ہی رہے گا۔ یہ راستہ اگرچہ بے مزہ اور دیر طلب ہے، لیکن راستہ صرف یہی ہے اور اس کے سوا جن راستوں کو لوگ مختصر سمجھ کر آج کل چلنے لگے ہیں وہ دراصل اس منزل پر پہنچانے والے راستے نہیں ہیں ——

یَالَیْتَ قَوْمِیْ یَعْلَمُوْنَ۔

بلکہ اس ناچیز کو تو یہ بھی یقین ہے کہ اسلامی نظام حکومت اگر کہیں قائم بھی ہوجائے تو صرف اسی صورت میں وہ چل سکتا اور کامیاب ہوسکتا ہے جبکہ وہاں کے مسلمانوں میں صلاح و تقویٰ کا غلبہ ہو، جس ملک کے مسلمانوں میں نفس پرستی اور فسق و فجور کا غلبہ ہوگا وہاں اسلامی نظام ہرگز نہیں چل سکے گا، بلکہ ان مسلمانوں ہی کے ہاتھوں اس کی دھجیاں اڑیں گی اور اس کی مٹی پلید ہوگی۔

یہاں تک جو کچھ عرض کیا گیا وہ براہِ راست ان ملکوں کے مسلمانوں سے متعلق تھا جہاں اقتدار مسلمانوں ہی کے ہاتھوں میں ہے۔

غیر اسلامی اقتدار کے تحت رہنے والے مسلمانوں کا مسئلہ اب چند اصولی باتیں ان مسلمانوں کے بارے میں بھی عرض کرنی ہیں جو ایسے علاقوں اور ملکوں میں رہتے ہیں جہاں اقتدار مسلمانوں کے ہاتھ میں نہیں ہے، مثلاً جو پوزیشن ہمارے ہندوستان کی یا چین یا بعض اُن یورپین ممالک کی بھی آبادیاں ہیں۔

ایسے ملکوں کے احوال چونکہ بہت مختلف ہیں اور اس سے بھی زیادہ مختلف ہوسکتے

ہیں اس لئے سیاست وحکومت کے شعبہ سے متعلق وہاں کے مسلمانوں کے لئے اپنی دینی ہدایت وتعلیم کی روشنی میں کوئی ایک لائحہ اور طریق کار متعین نہیں کیا جاسکتا، بس چند ایسی اصولی باتیں لکھی جاسکتی ہیں، جو مختلف احوال وظروف میں ان کی رہنمائی کرسکیں، ذیل میں وہی لکھی جارہی ہیں۔

(۱)

ایک زمانہ وہ تھا کہ مصر کے فرعونی دور میں فرعون کے بلائے ہوئے جادوگروں پر جب موسیٰ علیہ السلام کی صداقت ظاہر ہوگئی اور انہوں نے ان کی ایمانی دعوت کو حق جان کر قبول کرلیا اور اپنے مومن ومسلم ہونے کا اعلان کردیا، تو فرعون نے صرف اسی جرم میں ان کو قابل دار اور گردن زدنی ٹھہرا کر ان کے ہاتھ پاؤں کاٹے جانے اور سولی پر چڑھا دیئے جانے کا حکم دیدیا، نیز ایمان لانے والی اپنی بیوی کے ساتھ بھی اس ظالم نے تشدد وسنگدلی کا ایسا ہی برتاؤ کیا۔

اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر جن غربا وضعفا نے شروع میں اسلام قبول کیا، مکہ کے ظالم کافر مشرکوں نے ان پر ایسے ایسے جان لیوا ظلم کئے جن کی یاد آج بھی مضبوط سے مضبوط آدمی کو رلا دیتی ہے۔ بس کہنا یہ ہے کہ ظلم وبربریت کا یہ دور تو غالباً اب گزر گیا اور امید یہی ہے کہ فتنۂ دجال سے پہلے یہ تاریخ انشاء اللہ اب کہیں نہیں دہرائی جائے گی۔ لیکن اگر بالفرض کسی ملک میں مسلمانوں کے لئے حالات ایسے ہی ہوجائیں اور وہاں کی حکومت اسلام اور مسلمانوں کی ایسی ہی دشمن اور ان کے حق میں ایسی ہی ظالم وجلاد ہوجائے تو اُن کے لئے تین ہی راستے ہوں گے۔ یا تو کسی ایسے ملک اور ایسی سرزمین کی طرف ہجرت کرجائیں جہاں ایمان واسلام کے ساتھ زندگی گزار سکیں

(خواہ وہ بھی کوئی غیر اسلامی ہی ملک ہو) جیسا کہ صحابہ کرامؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے مکہ سے حبشہ کی طرف ہجرت کی تھی اور اگر اس کی بھی گنجائش نہ ہو تو پھر دوسری عزیمت کی راہ یہ ہے کہ اس راہ میں جان دینے والے دوسرے شہداء سابقین کی طرح خود بھی جان دیدیں اور جنت میں اپنے پیش رَووں سے جا ملیں، انشاء اللہ ان کے خون کا ایک ایک قطرہ اس ملک میں ایمان و ہدایت کے پھیلنے کا ذریعہ بنے گا اور جو کمزور دل والے اس کی ہمت نہ کر سکیں اُن کے لئے رخصت و اجازت اس کی بھی ہے کہ اپنے ایمان و اسلام کو چھپا کر اسی ملک میں رہیں اور کسی اچھے موقع اور اچھے وقت کے منتظر رہیں اور اللہ تعالیٰ سے دُعا بھی کرتے رہیں :-

رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ	اے ہمارے رب! ہمیں اس آبادی سے
الظَّالِمِ اَهْلُهَا وَاجْعَلْ لَّنَا	نکال لے جس کے باشندے ظالم ہیں اور
مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا وَّاجْعَلْ لَّنَا	ہمارے لئے اپنی طرف سے کوئی حامی اور
مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا ○	کوئی مددگار پیدا کر دے (جس کے ذریعہ
(النساء ع - ۱۰)	ہمیں اس ظلم و زبردستی سے نجات ملے)۔

(۲)

جیسا کہ عرض کیا گیا اوپر والی صورت ہمارے علم میں اس وقت دنیا کے کسی ملک اور کسی خطہ میں بھی نہیں ہے، ہاں بعض حکومتیں اس وقت بھی ایسی ہیں جو اِن پرانے قسم کی ظالمانہ طریقوں سے تو نہیں، لیکن نئی شاطرانہ چالوں اور سیاسی عیاریوں سے مسلمانوں کو اسلام سے (بلکہ اللہ اور مذہب کے ہر ماننے والے کو اُس کے مذہب اور اُس کے معبود سے) توڑنے کی کوشش خفیہ و علانیہ کرتی ہیں، لیکن انہوں نے اللہ پرستی اور کسی مذہب

ماننے کو قانوناً جرم قرار نہیں دیا ہے، بلکہ جیسا کہ عرض کیا گیا دوسرے مکارانہ طریقوں سے وہ اس مقصد کو حاصل کرنا چاہتی ہیں۔

ایسی حکومتوں کے مسلمان شہریوں کے لئے لائحہ عمل یہ ہے کہ وہ اللہ اور اُس کے مقدس دین کی سچی وفاداری اور اس راہ میں عزیمت اور صبر کو اپنی پالیسی کی بنیاد بنائیں اور اپنے گھروں میں اللہ پرستی اور اسلامی زندگی کی فضا قائم رکھنے کے لئے اور نئی نسل کی دینی تعلیم و تربیت کے لئے جو تدبیر اور جو محنت و کوشش وہ اپنے موجودہ حالات میں کر سکتے ہوں اس میں کمی نہ کریں (ہماری سوچی سمجھی رائے یہ ہے کہ اگر سچا احساس اور صادق عزم ہو تو یہ سب کچھ ہو سکتا ہے) اور اسی کے ساتھ اپنی ملکی حکومت کو اس غلطی سے بچانے کے لئے اور حالات کو بہتر بنانے کے لئے جو خیر خواہانہ اور دانشمندانہ تدبیریں اور کوششیں ممکن ہوں اُن سے بھی غافل نہ رہیں، اس کے راستے سیاسی بھی ہو سکتے اور بالکل غیر سیاسی بھی، اور ان کوششوں کے نتیجے ایسے بھی نکل سکتے ہیں جن کا عام انسانوں کو وہم و گمان بھی نہ ہو، اللہ کی قدرت ہمارے سوچ و فکر اور ہمارے قیاس و اندازہ سے بہت زیادہ وسیع ہے اور اس کی یہ غیر مبتدل سنّت اور اُس کا یہ قطعی وعدہ ہے کہ اُس پر ایمان لانے والے اُس کے بندے اگر اس کے ساتھ سچی وفاداری کا ثبوت دیں گے اور ایسے ناموافق اور صبر آزما حالات میں جو کچھ وہ کر سکتے ہیں اُس کے کرنے میں کمی نہ کریں گے تو اللہ تعالیٰ اُن کی مدد فرمائے گا اور پردۂ غیب سے وہ ظاہر ہوگا جو ان کی مشکلات کو حل کر کے حالات کو ان کے موافق بنا دے گا۔ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ○

(۳)

جن ملکوں میں اقتدار اس وقت مسلمانوں کے ہاتھوں میں نہیں ہے اور وہاں مسلمان

کی آبادی بھی خاصی ہے ان میں سے اکثر و بیشتر کی نوعیت اس دور میں یہ ہے کہ ان ملکوں کو اور ان کی حکومتوں کو اسلام سے اور اللہ و مذہب سے ضد اور بیر نہیں ہے، بلکہ وہاں کے مسلمانوں کو بھی ملک کے دوسرے طبقوں کی طرح عقیدہ اور عمل کی دستوری آزادی حاصل ہے لیکن ان حکومتوں کا نظام چونکہ غیر اسلامی اور خالص مادہ پرستانہ ہے اس لئے اُن کے بعض قوانین ایسے بھی ہیں جو اسلامی احکام سے ٹکراتے ہیں اور ان کی وجہ سے اسلامی احکام پر چلنا سخت مشکل ہو جاتا ہے[1]، پھر ان میں بعض ملک ایسے بھی ہیں جن میں مسلمانوں کی تعداد کروڑوں تک پہنچی ہوئی ہے، مثلاً ہمارے ملک ہندوستان ہی کو لے لیجئے، یہاں مسلمانوں کی آبادی ۱۰ - ۱۲ کروڑ کے درمیان ہے، ظاہر ہے کہ ان مسلمانوں کو اپنے ان ملکوں ہی میں رہنا ہے، نہ تو ان کے لئے ہجرت کا سوال پیدا ہوتا ہے اور نہ مسلمانوں کا کوئی ملک ان کو اپنے دامن میں جگہ دے سکتا ہے۔ تو جب واقعات کی اس دنیا میں یہ طے ہے کہ ان کروڑوں مسلمانوں کو اپنے ملکوں ہی میں رہنا ہے اور اس کے سوا کوئی دوسری امکانی صورت اُن کے لئے نہیں ہے تو ظاہر ہے کہ یہ مسلمان اپنے ملکوں کی حکومتوں کے غیر اسلامی ہونے کی وجہ سے ہمیشہ کے لئے حکومت اور اہلِ حکومت کے مکمل بائیکاٹ اور بے تعلقی کا فیصلہ تو نہیں کر سکتے اور نہ شریعت نے اُن سے اس ناقابلِ عمل پالیسی کا مطالبہ کیا ہے۔

اسی طرح مسلمانوں کے لئے مسلمان رہتے ہوئے اس کی بھی گنجائش نہیں ہے کہ وہ زندگی کے سیاست و حکومت جیسے اہم شعبہ کو دین و شریعت کے دائرہ اقتدار و رہنمائی سے بالکل باہر قرار دیتے ہوئے ملک کے صرف ایک شہری کی حیثیت سے دوسرے غیر مسلم

---

[1] اور بد قسمتی سے یہ مشکل تو اس وقت اکثر ان ملکوں کے مسلمانوں کو بھی درپیش ہے جن کا اقتدار خود مسلمانوں ہی کے ہاتھوں میں ہے کیونکہ ان کا نظام حکومت بھی اسلامی تعلیم و ہدایت کا پابند نہیں ہے۔ ۱۲

شہریوں کی طرح ملکی سیاست وحکومت میں جس طرح چاہیں حصہ لیں۔ اس کا مطلب
تو یہ ہوگا کہ ہم نے زندگی کے اس اہم شعبہ میں اپنے کو اللہ و رسول کی ہدایت و اطاعت
کا پابند نہیں کیا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ اسلام سے ایک طرح کا انحراف ہوگا۔

اس لئے ان ملکوں کے مسلمانوں کے لئے اس کے سوا کوئی راہ نہیں ہے کہ وہ
اپنے لئے ایک خاص پالیسی اپنے اپنے حالات کے مطابق اسی بنیاد پر وضع کریں کہ
انہیں اول و آخر مسلمان اور تابحد استطاعت و امکان اللہ و رسول کے احکام کا پابندہ
کر زندہ رہنا ہے، اور اس چیز کو ہر دوسری چیز سے حتیٰ کہ اپنے جان و مال اور عزت و آبرو
سے بھی عزیز تر اور مقدم رکھنا ہے اور اسی کے ساتھ اپنے ملک کا بھی خواہ خیر اندیش اور
اچھا شریف شہری بھی بننا ہے۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلی ضرورت یہ ہے کہ ان دونوں بنیادی باتوں کے بارے
میں خود مسلمانوں کا ذہن صاف اور بالکل صاف ہو اور یہ ان کا اجتماعی اور قومی فیصلہ ہو۔
اگر بالفرض کسی ملک کے مسلمانوں کے ذہن اس بارے میں پوری طرح صاف نہ ہوں، تو
ضروری ہوگا کہ پہلے اس مقصد کے لئے ایک مہم چلا کر اس کو مسلمانوں کا ایسا اجتماعی اور
قومی فیصلہ بنا لیا جائے جس کے بارے میں آئندہ کوئی تذبذب اور کوئی قابل لحاظ اختلاف
رائے نہ رہے۔

ایک بات یہ بھی بنیادی اصول ہی کے طور پر اس سلسلہ میں یہاں قابل ذکر ہے کہ
دنیا کے دوسرے مسلمانوں کی طرح ان ملکوں کے رہنے والے مسلمانوں کے لئے بھی یہ توضروری
ہے بلکہ گویا شرط ایمان ہے کہ وہ اسلام، اسلامی تعلیم یعنی انفرادی و اجتماعی زندگی کے لئے
قرآن مجید کے بتائے ہوئے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے قانون حیات

اور نظام زندگی کو حق و ہدایت سمجھیں اور اس کے خلاف ہر نظریہ اور ہر نظام کو غلط اور باطل یقین کریں اور اس لئے انسانی ہمدردی کے تقاضے سے بھی اُن کی دلی آرزو اور چاہت یہی ہو کہ ساری انسانی دنیا اس حق کو قبول کرلے اور دینِ اسلام کو اپنالے اور پُوری زمین کے سارے ملکوں میں اللہ کے نازل کئے ہوئے مقدس قانون کی حکومت و فرمانروائی ہو (وَيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ) — لیکن اُن کے اپنے اپنے ملکوں کے جو حالات ہوں اور جو نظام حکومت وہاں قائم ہو اس کو ایک نفس الامری حقیقت اور ایک واقعہ تسلیم کرتے ہوئے اور موافق و ناموافق امکانات کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیتے ہوئے ان کو اپنا لائحہ عمل تجویز کرنا ہوگا اور اس سلسلہ میں شریعت کے معروف اصول[1] اختیار انفع و دفع اضر کو بطور رہنما اصول کے اپنے سامنے رکھنا ہوگا۔ اس اصول کی رہنمائی میں وہ مختلف حالات میں حکومت میں شرکت یا عدم شرکت، تعاون یا عدم تعاون وغیرہ کا فیصلہ کر سکیں گے۔

ایک چیز جو دینی اور شرعی حیثیت سے ہر مسلمان کے لئے یکساں درجہ میں ضروری ہے خواہ وہ دنیا کے کسی بھی علاقہ کا رہنے والا ہو اور اُس کی اصل جزا آخرت میں جنت اور اللہ تعالیٰ کی رضا ہے، لیکن غیر اسلامی ملکوں میں رہنے والے مسلمانوں کے مسائل و مشکلات کو حل کرنے اور ان کو عزت و احترام کا مقام دلانے میں اس کو خاص دخل ہے، وہ ایمان و یقین اور اعتماد علی اللہ کی دولت، تقویٰ یعنی سیرت کی طہارت و پاکیزگی، اللہ تعالیٰ سے

---

[1] اس اصول کا حاصل یہ ہے کہ جب حالات ایسے ہوں کہ کسی چیز کو کلی طور پر دینی و شریعت کے تقاضوں کے مطابق کرنا بس میں نہ ہو تو وہ رویہ اختیار کیا جائے جس میں نسبۃً بہتری کا پہلو ہو اور جس سے شر اور ضرر میں کمی کی توقع ہو، اسی اصول کا دوسرا عنوان "اختیار اھون البلیتین" ہے۔ ۱۲

خاص رابطہ اور خلق اللہ کی نفع رسانی والی زندگی ہے۔ ان ملکوں میں رہنے والے مسلمانوں کی یہ خاص الخاص ضرورت ہے کہ اپنے اندر یہ ایمانی اوصاف پیدا کرنے اور ان اوصاف کو اپنے معاشرہ میں عام کرنے کے لئے ہر دوسری چیز سے زیادہ جدوجہد کریں۔ اگر انہوں نے ایسا کیا تو ان کے لئے وہ ابدی بشارتیں کھلیں گی جن کا ان کو گمان بھی نہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کی کتاب قرآن مجید میں بجابجا اس کی ضمانت دی گئی ہے۔ اس سلسلہ میں ایک آیت یہاں بھی پڑھ لیجئے:-

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَکَانُوْا یَتَّقُوْنَ لَھُمُ	جو لوگ صاحب ایمان و یقین ہوں اور تقویٰ
الْبُشْرٰی فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَۃِ	اُن کا شعار ہو، اُن کے لئے فلاح و کامیابی کی
لَا تَبْدِیْلَ لِکَلِمٰتِ اللّٰہِ ذٰلِکَ	بشارت ہے دنیا کی زندگی میں بھی اور آخرت
ھُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ۔	میں بھی۔ اللہ کے سب فرمان پورے ہونے والے
(یونس - ع - ۷)	اور اٹل ہیں (دنیا اور آخرت کی یہ کامیابی
	بڑی فیروز مندی ہے۔"

سورہ یوسف کا پیغام ہمارے اس زمانہ میں مسلمان جن ملکوں میں سیاسی حیثیت سے کمزور یا اقلیت میں ہونے کی وجہ سے اپنے کو بے بس اور مغلوب و مجبور محسوس کر کے مایوسی و دلشکستگی کی زندگی گزار رہے ہیں، اُن کے لئے قرآن مجید کی سورۂ یوسف میں خاص روشنی اور امید کا خاص پیغام ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ کا خاص سبق یہی ہے کہ کسی ملک میں مسلمان کی سیاسی پوزیشن خواہ کتنی ہی کمزور ہو، خواہ وہ بالکل اکیلا ہو، کوئی دوسرا اس کا ہم مذہب اور ہم مسلک نہ ہو اور اُسے ہم نسلی اور ہم وطنی کی ہمدردی کا کسی طبقہ کی حاصل نہ ہو، لیکن اگر وہ

سچا مومن اور اللہ پرست ہے، تقویٰ اور پرہیزگاری اُس کا شعار ہے اور اُس میں کچھ ایسی صلاحیتیں بھی ہیں جن سے وہ ملک اور اہلِ ملک کو فائدہ پہنچا سکتا ہے اور وہ فائدہ پہنچاتا بھی ہے، تو ملک چاہے اُس کا کلمہ نہ پڑھے، لیکن ملک میں اس کو عزت و احترام کا خاص مقام ضرور حاصل ہو کر رہے گا اور اُس کے دین و مذہب کو بھی عزت کی نگاہ سے دیکھا جائے گا اور اہلِ ملک اس کے سامنے جھکنے پر مجبور ہوں گے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی سنت اور اُس کا دستور ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں کی اس حیرت کو رفع کرنے کے لئے کہ جس یوسف کو ہم نے کنوئیں میں ڈال دیا تھا، وہ مصر میں اقتدار کے اس مقام تک کیسے پہنچ گیا، یہ جواب ارشاد فرمایا تھا:۔

إِنَّهُ مَن يَتَّقِ وَيَصْبِرْ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ۔ — جو بندہ تقویٰ اور صبر اختیار کرے، تو اللہ کا یہ قانون ہے کہ وہ نیکو کاروں کے اجر کو ضائع نہیں کرتا، ان کو اجر ضرور دِلا کر رہے گا۔

اس میں اللہ تعالیٰ کے اسی دستور کا ذکر ہے اور اوپر کی سطروں میں اس سلسلہ میں کچھ عرض کیا گیا ہے، درحقیقت وہ اللہ تعالیٰ کے اس ازلی قانون و دستور ہی کی بنیاد پر کہا گیا ہے۔

خالص فکری راستہ سے عقل کا اس پر مطمئن ہو جانا شاید کچھ مشکل رہا ہو، لیکن جمہوریت اور آزاد خیالی کے اس دور میں تو یہ بات دو اور دو چار کی طرح آسانی سے سمجھ میں آجانے والی ہے۔

لیکن ہائے بد قسمتی! اس وقت پورے عالم کے مسلمانوں کا یہ عجیب حال ہے کہ سیاست و حکومت کے سلسلہ کی اپنی مشکلات اور اپنے مسائل حل کرنے کے لئے اُن سب تدبیر بازیوں کو تو وہ اختیار کر سکتے ہیں جو خالص مادی تحریکوں کی ایجاد ہیں اور جن کے نتیجہ میں نہ کوئی خیر کبھی پیدا ہوا ہے نہ پیدا ہو سکتا ہے، لیکن قرآن مجید کے بتائے ہوئے اس راستہ کو وہ آزمانے کے

لئے بھی تیار نہیں ہیں، گویا ان کا حال اس وقت بعینہ وہ ہے جو قرآن مجید میں بنی اسرائیل کے
ایک بے توفیق گروہ کا ان الفاظ میں بیان فرمایا گیا ہے:۔

وَاِنْ یَّرَوْا سَبِیْلَ الرُّشْدِ لَا یَتَّخِذُوْهُ سَبِیْلًا ۚ وَاِنْ یَّرَوْا سَبِیْلَ الْغَیِّ یَتَّخِذُوْهُ سَبِیْلًا
(الاعراف ۔ع ۔ ۱۷)

اگر ہدایت کا راستہ دیکھیں تو اس کو اپنا راستہ نہ بنائیں (اور اس پر چلنے کے لئے آمادہ نہ ہوں) اور اگر گمراہی کا راستہ دیکھیں تو اس کو اپنا راستہ بنالیں (اور اس پر چل پڑیں)۔

غیر اسلامی ملکوں میں بسنے والے مسلمانوں کے لئے یہ رہنمائی تو قرآن مجید کے بیان کے مطابق
اسوۂ یوسفی کی تھی اور رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مقدسہ کے واقعات میں صلح
حدیبیہ سے بھی بڑی رہنمائی ان مسلمانوں کو مل سکتی ہے۔

رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیبیہ کی صلح، مکہ کے کافر و مشرکوں کے ساتھ
بادی النظر میں ایسی مغلوبانہ شرائط پر اور بظاہر اس قدر دب کر کی تھی کہ حضرت عمرؓ جیسے کامل
الایمان اور وفادار صحابی کو اس پر ضبط کرنا اور ادب کے تقاضے کے مطابق خاموش رہنا بھی
مشکل ہوگیا، لیکن یہ صلح آپ نے اس قدر دب کر اور بظاہر ایسی ذلت آمیز ہار مان کر کیوں کی؟
ہر صاحب فکر او واقف کار جانتا ہے کہ اس وقت آپ کے سامنے ایک خاص مقصد یہ تھا
کہ مکہ والوں کے ساتھ (جو اس وقت اسلام دشمنی میں گویا پورے عرب کے لیڈر تھے) مسلمانوں
کے اختلاط کی راہیں کھلیں، تعصب اور اشتعال کی فضا ختم ہو اور انہیں اس کا موقع ملے کہ
وہ مسلمانوں اور اسلام کو قریب کر دیکھ سکیں اور صلح کی ٹھنڈی فضا میں ٹھنڈے دل سے معاملہ
پر غور کرنا اور حقیقت کا سمجھ سکنا اُن کے لئے آسان ہو جائے۔

اور تاریخ گواہ ہے کہ "بظاہر اس مغلوبانہ صلح" ہی نے مکہ والوں کے لئے اسلام کی

طرف سے کا راستہ کھولا، اس کے بعد حضرت خالد بن ولیدؓ، حضرت عمرو بن العاصؓ جیسے کتنے ہی ممتاز قریشی سرداروں نے اسلام قبول کیا۔ اہل سیر کا بیان ہے کہ صلح حدیبیہ کے بعد کے چند سالوں میں جتنے لوگوں نے برضا و رغبت اسلام قبول کیا ہے اُن کی تعداد اُن سے کہیں زیادہ ہے جنہوں نے آغاز اسلام سے صلح حدیبیہ تک کے ۱۹، ۲۰ برسوں میں قبول کیا تھا۔ اسی لئے قرآن مجید میں صلح حدیبیہ کو "فتح مبین" کہا گیا ہے:۔

"اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ۝" (سورۃ الفتح - ع - ۱)

کہنا یہ ہے کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیبیہ میں اس قدر مغلوبانہ صلح کر کے کفار مکہ کے ساتھ پرسکون ٹھنڈی فضا میں مسلمانوں کے اختلاط و تعلقات کا موقعہ حاصل کرنے کا جو خاص فائدہ اٹھایا تھا وہ آج اکثر غیر اسلامی ملکوں کے رہنے والے مسلمانوں کو بڑی حد تک اس وقت حاصل ہے، لیکن خود مسلمانوں میں وہ ایمان، وہ اسلامی زندگی، وہ اسلامی اخلاق، تمام بنی نوع انسان کا درد اور ان کی ہمدردی و غمخواری کا جذبہ اور اللہ کی طرف اور اس کی جنت کی طرف سب کو کھینچنے کا مخلصانہ داعیہ اور دین کی بے لوث دعوت ایک کچھ بھی نہیں ہے، نتیجہ وہ ہے جو آنکھوں کے سامنے ہے، پس ان ملکوں کے مسلمان اگر اسلام اور قرآن سے یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ ہمارے لئے کیا ہدایت ہے اور ہمارے مسائل کا کیا حل ہے، تو اصل جواب بس یہ ہے کہ اپنے کو مسلمان بنا دو، سب سے پہلے ایمان و یقین اور ایمان و یقین والی زندگی اور ایمانی صفات و اخلاق اور اللہ کے بندوں کی مخلصانہ فکر اپنے میں اور دوسرے مسلمانوں میں پیدا کرنے اور عام کرنے کے لئے جد و جہد کرو۔ اس کے بعد تمہارے لئے وہ راہیں کھلیں گی جن کا اس وقت تم کو وہم و گمان بھی نہیں ہو سکتا۔ واللہ غَالِبٌ عَلٰى اَمْرِهٖ!۔

ان ملکوں کے مسلمانوں کے لئے سب سے اہم اور بنیادی بات تو بس یہی ہے جو اوپر عرض کی گئی۔ اس کے بعد چند اصولی سی باتیں اور عرض کرنی ہیں، لیکن ان کی حیثیت ہمارے نزدیک ثانوی اور فرعی ہے، بہرحال ہم ان کو بھی ذکر کرتے ہیں۔

یہ بات اوپر ذکر کی جا چکی ہے کہ ان ملکوں کے مسلمانوں کو سب سے پہلے یہ فیصلہ اور اس کا عزم کر لینا چاہئے کہ انہیں مسلمان رہ کر اور اسلامی احکام پر چلتے ہوئے اپنے ملک میں رہنا ہے، یہ ایسا مسئلہ ہے کہ ملکی حکومت غیر اسلامی ہوتے ہوئے بھی اپنی معقولیت اور انصاف پسندی کی وجہ سے اس میں زیادہ سے زیادہ سہولتیں بھی پیدا کر سکتی ہے اور اپنی بدنیتی اور تنگ نظری کی وجہ سے اس کے راستے میں سخت مشکلات بھی پیدا کر سکتی ہے اس لئے سیاست و حکومت کے باب میں ان ملکوں کے مسلمانوں کا ایک اصول یہ بھی ہے گا کہ وہ ملک میں ایسے عنصر اور ایسی پارٹی کے برسر اقتدار آنے میں اگر مدد دے سکتے ہوں تو ضرور مدد دیں جس سے اس مقصد میں ہمدردی اور زیادہ سہولتیں حاصل ہونے کی اُمید ہو، مثلاً کسی ملک میں متعدد سیاسی پارٹیاں ہیں جو ملک کے نظام حکومت کو اپنے ہاتھ میں لینے کے لئے الکشن کے میدان میں اُتری ہوئی ہیں اور مسلمان یہ محسوس کرتے ہیں کہ کسی پارٹی کو برسر اقتدار لانے میں ان کی حمایت و تائید اثر انداز ہو سکتی ہے تو وہ اُس پارٹی کو برسر اقتدار لانے کی کوشش کریں جس سے یہ اُمید ہو کہ مسلمانوں کے ساتھ اور خاص کر ان کے دینی مسائل کے ساتھ اُس کا رویہ زیادہ ہمدردانہ ہے گا، اسی طرح اگر اس مقصد کا تقاضا حکومت میں شرکت کا ہو، تو اس میں شریک بھی ہوں۔

یہ حکمت عملی ہدایت عقل کا بھی تقاضا ہے اور شریعت میں اس کی بنیاد وہ معروف و مسلم اصول ہے جس کا مشہور عنوان فقہا اور اصولیین کی زبان میں "اختیار اھون البلیتین"

ہے اور اس کی صریح نظیر (بلکہ دلیل بھی) وہ مشہور واقعہ ہے کہ جس زمانہ میں صحابہ کرامؓ کی ایک جماعت نے ہجرت کرکے حبشہ میں قیام کرلیا تھا تو حبشہ کے بادشاہ نجاشی کے کسی دشمن نے اُسی زمانہ میں نجاشی کے خلاف فوج کشی کی، اس موقع پر صحابہ کرامؓ نے نجاشی کی فتحیابی کیلئے بڑے اخلاص اور الحاح سے دعائیں کیں اور مہاجرین کے اس قافلے کے سردار حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے اس معرکہ میں کوئی ایسا کارنامہ بھی انجام دیا جس کی وجہ سے نجاشی کے ہاں اُن کا اعتماد اور زیادہ بڑھ گیا۔ اس واقعہ سے متعلق حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی مفصل روایت میں تصریح ہے کہ نجاشی کے ساتھ ہماری یہ ہمدردی اس لئے تھی کہ ہم سمجھتے تھے کہ نجاشی کا دشمن اگر کامیاب ہوگیا تو اس کا سلوک ہمارے ساتھ اتنا اچھا نہ ہوگا جتنا اچھا نجاشی کا ہے۔ (تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو سیرت ابن ہشام ص [illegible]، البدایہ والنہایہ ص [illegible]، شرح سیر کبیر ص [illegible])

لہ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے اپنے ایک رسالہ "الحسبۃ فی الاسلام" میں اس پر کلام کرتے ہوئے کہ جب کوئی ایسا معاملہ درپیش ہو کہ ہماری کسی کوشش سے صورت حال میں نسبتاً کچھ بہتری پیدا ہو سکتی ہو یا کسی برائی میں کچھ کمی کی جا سکتی ہو تو مسلمانوں کو اس کے لئے جدوجہد کرنی چاہئے، استناد اور استشہاد کے طور پر لکھتے ہیں:۔

وقد كان النبي صلى الله عليه وسلم واصحابه يفرحون بانتصار الروم والنصارى على المجوس وكلاهما كافر لان احد الصنفين اقرب الى الاسلام وانزل الله فى ذالك سورة الروم ...... وكذالك يوسف الصديق كان نائباً لفرعون مصر وهو وقومه مشركون وفعل من العدل والخير ما قدر عليه ودعا الى الايمان بحسب الامكان۔ الحسبة ص۳۵ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

جس قسم کے ملکوں کے بارے میں یہ گفتگو ہو رہی ہے ان کے رہنے والے مسلمانوں کی ایک نہایت اہم ضرورت جس کا تعلق وہاں کی حکومتوں سے ہے ، یہ بھی ہے کہ حکومت مسلمانوں کے پرسنل لا کو ان کی خالص دینی چیز سمجھتے ہوئے اُس میں عدم مداخلت کے اصول کو تسلیم کرلے ، اس مقصد کے حاصل کرنے کے لئے ہر مناسب تدبیر اور ہر ممکن جدوجہد کرنا ان مسلمانوں کا فرض ہوگا ، اسی طرح مسلمانوں کا یہ بھی فرض ہوگا کہ ان کی زندگی کے جو مسائل اسلامی حکومت نہ ہونے کی صورت میں اُن کے اپنے کسی اجتماعی شرعی نظام کے ذریعہ ہی حاصل ہو سکتے ہیں ، ان کے لئے وہ شرعی اجتماعی نظام قائم کرلیں[1]۔

(بقیہ صفحہ ۲۴۵ سے آگے) جس کا حاصل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جب ایران کے آتش پرستوں اور روم کے عیسائیوں میں جنگ ہو رہی تھی تو اگرچہ دونوں فریق کافر تھے لیکن چونکہ رومی عیسائی بہ نسبت مجوسیوں کے اسلام سے قریب تھے اسلئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام کو عیسائیوں کی فتح کی خبر دلی خوشی ہوئی تھی اور سورۂ روم اسی سلسلہ میں نازل ہوئی تھی اور اسی طرح مصر کے بادشاہ فرعون اور اس کی پوری قوم کے مشرک ہونے کے باوجود سیدنا یوسف علیہ السلام نے اُس کا نائب ہونا قبول فرمالیا تھا اور جو اختیارات ان کو اس طرح حاصل ہو گئے تھے ان کو انہوں نے خیر اور عدل کیلئے حسب استطاعت استعمال فرمایا اور اپنے امکان کے بقدر لوگوں کو ایمان کی دعوت دی ۔ شیخ الاسلام کی یہ عبارت اس مسئلہ میں بالکل واضح اور فیصلہ کن ہے ۔ ۱۲

[1] اس طرح کا ایک نظام دوسری جنگ عظیم سے کچھ پہلے تک یوگوسلاویہ میں قائم تھا ، بلکہ وہاں تو اس کی حیثیت ایک نیم سرکاری نظام کی تھی اور ہمارے ہی زمانہ کے ایک بالغ النظر ہندوستانی عالم مولانا محمد سجاد مرحوم (نائب امیر شریعت صوبۂ بہار) نے ایسے ہی ایک نظام کا خاکہ ”محکمۂ نظارت امور شرعیہ“ کے عنوان سے غالباً ۱۹۲۸ء میں مرتب کر کے شائع کیا تھا جن ملکوں میں مسلمانوں کی آبادی بھی کافی ہے ، وہاں کے مسلمان اگر حکمت و دانشمندی اور عزم کے ساتھ اس طرح کے کسی نظام کے لئے جدوجہد کریں تو وہاں کی حکومتیں اس کو ماننے پر (بقیہ اگلے صفحہ پر)

جس قسم کے ملکوں کے بارے میں یہ گفتگو تھی اُن میں رہنے والے مسلمانوں کے لئے سیاست وحکومت کے باب میں جو اصولی باتیں یہاں لکھنا مناسب سمجھی گئیں وہ یہی تھیں، جو لکھیں جاچکیں۔

آخر میں ہم پھر اس بات کو دہراتے ہیں کہ ان مسلمانوں کو رہنمائی کے لئے اپنے سامنے سیدنا یوسف علیہ السلام کی اُس سرگزشت کو رکھنا چاہیے جس کو قرآن مجید نے پوری تفصیل سے ذکر کیا ہے، اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں کہ جس ملک میں بھی مسلمان حقیقی ایمان، پاک سیرت اور احسانی زندگی اور دانشمندی کے ساتھ رہیں گے اور اپنے وجود کو ملک اور اہل ملک کیلئے نفع مند ثابت کردیں گے اُس ملک میں ان کو اور ان کے دین کو عزت واحترام کا مقام حاصل ہو کر رہے گا، یہ اللہ کی سنت ہے۔ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ۝

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ سے آگے) آمادہ ہو سکتی ہیں۔ اس قسم کا انتظام خود ان ملکوں اور ان حکومتوں کے لئے بھی مفید ہوگا لیکن اگر بالفرض ان ملکوں کی حکومتیں ایسے کسی نظام کو سرکاری طور پر تسلیم نہ کریں تو مسلمانوں کے لئے اس میں تو کوئی رکاوٹ نہیں ہے کہ وہ اپنی دینی ضرورتوں کے لئے اپنا ایک شرعی نظام کم از کم اسی طرح کا قائم کرلیں جس طرح کا صوبۂ بہار میں "امارت شرعیہ" کے نام سے ایک نظام قائم ہے۔ اگر کسی ملک کے عام مسلمانوں کا تعاون و اعتماد ایسے کسی نظام کو حاصل ہو تو مسلمانوں کی بہت سی دینی ضرورتیں اور بہت سی وہ مشکلات جو اسلامی حکومت نہ ہونے کی وجہ سے پیش آتی ہیں حل ہو سکتی ہیں ۔۔۱۲

احسان وتصوف

احسان وتصوف کی حقیقت | دین کا ایک اہم شعبہ جس سے دین کی تکمیل ہوتی ہے، وہ ہے، جس کو حدیث نبوی میں "احسان" کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے اور ہمارے عرف میں اسی کو تصوف بھی کہا جاتا ہے، جس کی حقیقت مختصر اور عام فہم الفاظ میں یوں بیان کی جاسکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بارہ میں بندہ کے قلب کو ایسا یقین واطمینان نصیب ہوجائے جیسا کہ کسی حقیقت کے مشاہدہ سے ہوجایا کرتا ہے (جس کے بعد اس کے خلاف کسی وہم اور وسوسہ کی بھی گنجائش نہیں رہتی) پھر اُس کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ عبدیت کا وہ رابطہ پیدا ہوجائے جس کی وجہ سے قلب ہر دم اللہ تعالیٰ کی یاد اور اس کی عظمت ومحبت سے معمور رہے اور پھر اُس بندہ کی عبادت اُس کے اخلاق، اس کی معاشرت اور اُس کے سلسلے معاملات یعنی اُس کی پوری زندگی کی رُوح یہی ایمان ویقین اور یہی رابطۂ عبدیت بن جائے پھر وہ جو کچھ کرے اسی ایمان اور رابطۂ عبدیت کے داعیہ سے اور اُسی کے تقاضے کے مطابق کرے اور اس طرح اس کی قالبی اور ظاہری زندگی بھی اس قالبی وباطنی رنگ میں رنگ جائے۔ صِبْغَةَ اللهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللهِ صِبْغَةً ۔

احسان وتصوف کی یہ حقیقت معلوم ہوجانے کے بعد ہر شخص آپ سے آپ سمجھ سکتا ہے کہ یہ عین کمالِ دین وایمان ہے اور جس کو یہ دولت جتنی نصیب ہو، اتنا ہی اس کا

دین کامل ہے اور جس میں اس لحاظ سے جتنی کمی ہو، اتنی ہی اُس کے دین کے کمال میں کمی ہے۔ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مشہور حدیث جو حدیثِ جبرئیل کے نام سے معروف ہے اور جس میں سوال وجواب کے پیرائے میں صحابہ کرامؓ کو بالاجمال گویا پورے دین کی تعلیم دی گئی ہے، اُس میں اسلام وایمان کے بعد جس طرح احسان کا ذکر کیا گیا ہے اُس سے احسان کی حقیقت معلوم ہونے کے ساتھ یہ بھی اشارہ مل جاتا ہے کہ ایمان واسلام کی تکمیل مقامِ احسان ہی سے ہوتی ہے اور دین کی تکمیل کا وہی آخری عنصر ہے۔

اس حدیث کا حاصل یہ ہے کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چند صحابۂ کرامؓ کے ساتھ تشریف فرما تھے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام ایک نوارد اجنبی آدمی کی شکل میں آئے اور رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب آکر بیٹھ گئے اور آپ سے سوالات کرنے شروع کئے، پہلے پوچھا کہ۔ بتلایئے ایمان کیا ہے؟۔ آپ نے اس کا جواب دیا۔ پھر پوچھا کہ۔ بتایئے اسلام کیا ہے؟۔ آپ نے اس کا بھی جواب دیا۔ (یہ دونوں سوال گویا دین کے نظامِ اعتقادی وعملی سے متعلق تھے)۔ اس کے بعد تیسرا سوال یہ کیا کہ بتلایئے احسان کیا ہے؟ اس کے جواب میں آپ نے فرمایا: "اَلْاِحْسَانُ اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ کَاَنَّكَ تَرَاهُ فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ۔"

اور اسی حدیث کی بعض روایات میں "اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ" کی جگہ "اَنْ تَخْشَى اللّٰهَ" اور بعض میں "اَنْ تَعْمَلَ لِلّٰهِ" کے الفاظ بھی آئے ہیں۔

رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس جواب کا مطلب یہ ہے کہ مقامِ احسان یہ ہے کہ بندہ کی یہ حالت ہو جائے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت وبندگی اس طرح کرے اور اپنے ہر کام میں اللہ تعالیٰ کا ایسا ادب و لحاظ رکھے کہ گویا اللہ تعالیٰ اس کی نگاہ کے سامنے

ہے اور وہ اس کو دیکھ رہا ہے کیونکہ بندہ اگرچہ اللہ تعالیٰ کو واقعۃً نہیں دیکھتا، بلکہ اس دنیا میں کچھ دیکھ ہی نہیں سکتا، لیکن اس میں تو شبہ ہی نہیں کہ اللہ تعالیٰ حاضر ناظر ہے، اور وہ بندہ کو ہر وقت دیکھتا ہے، لہٰذا بندہ کو ہر وقت اور اپنے ہر کام میں اُس کا ایسا ہی ادب و لحاظ کرنا چاہئے کہ گویا اللہ تعالیٰ اُس کی نگاہ کے سامنے ہے اور وہ اس کو دیکھ رہا ہے۔

اور ظاہر ہے کہ یہ کیفیت جب ہی پیدا ہوتی ہے جب کہ بندہ کو حقیقتِ یقین نصیب ہو جائے اور وہ اس کے قلب پر اس طرح چھا جائے کہ اللہ تعالیٰ کی ہستی گویا ہر وقت اُس کے سامنے رہے، یہی وہ حالت ہے جس کے لئے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ سے دعا فرماتے تھے :۔

اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِيْ اَخْشَاكَ كَاَنِّيْ اَرَاكَ اَبَدًا حَتّٰى اَلْقَاكَ "ا؎	اے اللہ! میری حالت یہ کر دے کہ میں تجھ سے ایسا ڈروں اور تیرا ایسا ادب و لحاظ کروں کہ گویا تجھے ہر وقت دیکھ رہا ہوں (یہی میری حالت ہو جائے) یہاں تک کہ میں اسی حالت میں تجھ سے جا ملوں "

حضور و یادداشت و نسبت احسانی کیفیت ہی کی تعبیریں ہیں اسی حالت و کیفیت کو حضرات صوفیہ لفظ "حضور" "یادداشت" سے تعبیر کرتے ہیں اور اسی کو "نسبت" کہا جاتا ہے اور کسی بندہ کے صاحبِ نسبت ہونے کا مطلب ان حضرات کی اصطلاح میں یہی ہوتا ہے کہ اس کو یہ دولت کسی قابلِ لحاظ درجہ میں نصیب ہے۔

یہ کیفیت اور یہ نسبت جب کسی بندہ کو کامل درجہ میں نصیب ہو جاتی ہے تو پھر

اُس کا حال یہ ہو جاتا ہے کہ وہ اللہ سے غافل ہونا بھی چاہے تو غافل نہیں ہو سکتا اور وساوس و خطرات سے ایسا محفوظ ہو جاتا ہے کہ اگر کوئی خطرہ اور وسوسہ قلب میں لانا بھی چاہے تو نہیں لا سکتا۔ امام ربّانی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ غالباً اپنا ہی یہ حال اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں :۔

"درویشے از مخلصاں ایں سلسلہ علیہ بحکم" وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ" از حال خود چنیں خبر می دہد کہ خواطر از قلب بحدے منتفی می گردد کہ اگر فرضاً عمر حضرت نوح علی نبینا و علیہ الصلوٰۃ والسلام بصاحب آں قلب بدہند ہرگز خاطر بر قلب عبور نہ کند ...... بلکہ در آتیاں خاطر اگر سالہا تکلف نماید ہم میسر نشود" (دفتر اوّل مکتوب ۲۶۰)

اس سلسلۂ عالیہ (نقشبندیہ) سے مخلصانہ تعلق رکھنے والے ایک درویش حکم خداوندی" وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ" کے مطابق اپنا یہ حال بتاتے ہیں کہ خطرے اور وسوسے قلب سے اتنے ناپید ہو گئے ہیں کہ اگر بالفرض حضرت نوح علیہ السلام کی سی لمبی عمر مل جائے تو قریباً ہزار سال کی اس طویل مدت میں ایک خطرہ اور وسوسہ بھی قلب میں نہیں آئے گا، بلکہ اگر کسی خطرہ کے دل میں لانے کی برسوں تک کوشش کی جائے گی، جب بھی خطرہ نہیں آسکے گا۔[1]

---

[1] اور جو لوگ اپنی محرومی و بدنصیبی اور عدم مناسبت کی وجہ سے اس سے انکار کریں اور اس کو "افسانہ" کہیں، اُن کے بارے میں اسی مکتوب کے آخر میں امام ربّانی نے عارف رومی کے یہ دو شعر لکھے ہیں۔ ؎

ہر کس افسانہ بخواند افسانہ است ؞ وانکہ دیدش نقد خود مولانا است

آب نیل است و بقبطی خوں نمود ؞ قوم موسیٰ را نہ خوں بود آب بود

پھر اس نورِ یقین، اس حضوری نسبت اور احسانی کیفیت کا قدرتی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے تعلق کے مقابلہ میں سارے تعلقات فنا ہو جاتے ہیں اور پھر اُس کے تمام ظاہری و باطنی اعمال مثلاً دوستی، دشمنی، کسی سے ملنا اور کسی سے نہ ملنا، لینا اور دینا، سب اللہ ہی کے لئے ہونے لگتے ہیں۔ یہی وہ مقام اخلاص ہے جس کے متعلق رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

"مَنْ اَحَبَّ لِلّٰهِ وَاَبْغَضَ لِلّٰهِ وَاَعْطٰى لِلّٰهِ وَمَنَعَ لِلّٰهِ فَقَدِ اسْتَكْمَلَ الْاِيْمَانَ" (مشکوٰۃ بحوالہ ابوداؤد)

جس کا حال یہ ہو کہ وہ جس سے محبت کرے، اللہ ہی کے لئے کرے اور جس سے بغض رکھے، اللہ ہی کے لئے رکھے اور جس کو کچھ دے، تو اللہ ہی کے لئے دے، اور جس کے دینے سے ہاتھ روکے، اللہ ہی کے لئے روکے تو اُس نے اپنا دین کامل کر لیا۔

اس دولت کا اعلیٰ ترین درجہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حصہ تھا اور اس کی وجہ سے علم و معرفت اور تقویٰ و خشیت میں بھی سب سے بلند مقام آپ ہی کا تھا۔ چنانچہ ایک موقع پر ارشاد بھی فرمایا:۔

"اِنَّ اَتْقَاكُمْ وَاَعْلَمَكُمْ بِاللّٰهِ اَنَا" (صحیح بخاری کتاب الایمان)

میں تم سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا اور اُس کا ادب و لحاظ کرنے والا ہوں اور اللہ سے متعلق علم و یقین میں بھی سب سے زیادہ حصہ میرا ہی ہے۔

پھر آپ کے فیضِ صحبت سے یہ دولت اپنی اپنی استعداد اور اپنے اپنے احوال کے مطابق صحابہ کرام کو بھی بالعموم حاصل تھی اور ہر دور کے اولیاء اللہ کا خاص سرمایہ بھی یہی دولت رہی ہے یعنی یہ نورِ یقین اور اس سے پیدا ہونے والا رابطہ عبدیت اور کیفیت

خشیت و محبت۔ تصوف کے سارے اذکار و اشغال اور مجاہدات کا مقصد و منتہیٰ یہی ہے۔
ہماری اسی صدی کے ربانی عالم اور محقق صوفی حضرت مولانا گنگوہی (نور اللہ مرقدہ) اپنے ایک مکتوب میں اسی نور یقین کے بارے میں فرماتے ہیں :-

"یہ انتہا سب طرق کی ہے۔ . . . صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے تمام اپنا خان ومان اور آبرو و جان کیوں دی تھی ؟ کیا دیکھا تھا ؟ یہی کیفیت صحبت فخر عالم علیہ السلام سے یقین حاصل ہو گیا تھا۔ پس اس پر مدار سب کام کا تھا حضرت سیدی عبد القادر جیلانی اور خواجہ خواجگان معین الدین چشتی اور سید الطائفہ بہاء الدین بخاری کیوں بڑے ہو گئے ؟ اسی یقین کے سبب سے بڑے ہوئے تھے ۔"

چند سطر کے بعد فرماتے ہیں :-

"اس نسبت کا نام احسان ہے کہ بعثت جناب فخر رسل علیہ السلام کی اس کے ہی واسطے تھی اور صحابہ جملہ اس نسبت کے حامل تھے علی حسب مراتبہم ، پھر اولیاء امت نے اس کو دوسرے طریقے سے پیدا کیا ۔"

(مکاتیب رشیدیہ ص۳)

الغرض اس باب میں اصل چیز اسی نور یقین اور اسی احسانی نسبت کی تحصیل ہے اور جیسا کہ معلوم ہوا ، صحابہ کرام کو یہ چیز کامل عقیدت و محبت کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اور آپ کی ہدایت کے مطابق اعمال خیر کی مشغولیت اور اللہ کی راہ میں جان و مال کی قربانی سے حاصل ہوئی تھی۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد اکابر صحابہ (جو اس دولت میں امتیازی مقام رکھتے تھے) انفرادی

طور پر بھی اور اجتماعی حیثیت سے بھی صحابۂ کرام کی پوری جماعت اس باب میں گویا آپ کی قائم مقام تھی اور ایمان و اعمالِ صالحہ اور عقیدت و محبت کے ساتھ ان حضرات کی صحبت و رفاقت اس مقصد کے حصول کے لئے کافی ہو جاتی تھی۔

احسانی نسبت پیدا کرنے کیلئے طریقۂ صوفیہ کا آغاز!

پھر اس کے بعد جب صحابۂ کرام بھی دنیا میں نہیں رہے اور مرورِ زمانہ کے ساتھ اسلامی معاشرہ میں خیر کی مقدار گھٹتی اور شر کی مقدار بڑھتی رہی تو ایک وقت آیا کہ امت کے ایسے افراد نے جو اُس دور میں اس احسانی نسبت کے خاص وارث اور امین تھے (اور جن کو اس شعبہ میں تخصص و حذاقت کا قریباً وہی مقام حاصل تھا جو فقہ میں ائمہ مجتہدین کو حاصل تھا) یہ دیکھ کر کہ اب ہماری اس دنیا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرامؓ کی موثر صحبتیں بھی موجود نہیں ہیں اور اسلامی معاشرہ میں بھی بہ نسبت سابق کے خیر بہت کم اور شر بہت زیادہ ہو گیا ہے، قلب میں نورِ یقین اور احسانی کیفیت اور اللہ کی محبت و خشیت پیدا کرنے کے لئے بطور تدبیر کے کچھ ایسے اعمال و اشغال تجویز کئے جن کو انہوں نے اس کے حصول میں مفید اور معاون سمجھا، مثلاً کثرتِ ذکر، مراقبہ اور مجاہدۂ نفس وغیرہ، جن کا اس مقصد کے حاصل ہونے میں مفید اور معاون ہونا عقلی طور پر بھی سمجھ میں آنے والی بات ہے اور ان کی اس خصوصیت اور تاثیر پر نصوص میں واضح اشارات بھی ملتے ہیں اور پھر ان بزرگوں کی اس رائے پر سب سے بڑی مہر جمہورِ امت کی قبولیت اور تجربہ کی کامیابی نے لگائی۔

ہزار سال سے زیادہ کا تجربہ اور علمائے امت کا اتفاق

قریباً ہزار سال، بلکہ اس سے بھی زیادہ مدت سے امت کے صالح ترین طبقے نے اس پر اتفاق کیا ہے کہ نورِ یقین اور معیت مع اللہ یعنی احسانی نسبت حاصل کرنے کے لئے صوفیاء کرام کا یہ طریقہ (جس کا نام سلوک و

طریقت ہے) اصولاً صحیح اور نتیجۃً کامیاب ہے۔ کون اس سے انکار کرسکتا ہے کہ مشاہیر اولیاء امت مثلاً خواجہ معروف کرخی، بشر حافی، سری سقطی، شقیق بلخی، بایزید بسطامی، جنید بغدادی، ابوبکر شبلی، شیخ عبدالقادر جیلانی، شیخ شہاب الدین سہروردی، شیخ احمد رفاعی، شیخ ابوالحسن شاذلی، خواجہ عثمان ہارونی، خواجہ معین الدین چشتی، خواجہ بہاء الدین نقشبند اور پھر ہمارے اس دوسرے ہزارہ کی گزشتہ تین صدیوں میں خواجہ باقی اللہ، امام ربانی مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی اور ان کے خلفاء اور شاہ ولی اللہ دہلوی اور سید احمد شہید (رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین) اور ان جیسے ہزاروں، بلاشبہ ہزاروں، بلکہ لاکھوں افراد ہیں جو اپنے اپنے وقت میں اس نسبت کے حامل، بلکہ اس راہ کے امام اور داعی ہوئے ہیں اور ان میں سے ایک ایک کی صحبت و تربیت سے اللہ کے ہزاروں لاکھوں بندوں کو یہ دولت حاصل ہوئی ہے جو شخص ان سلسلوں سے کچھ بھی واقفیت رکھتا ہے وہ جانتا ہے کہ ان بزرگوں کو جو کچھ حاصل ہوا اسی راہ سے حاصل ہوا تھا۔ پس جس طریقہ نے امت محمدیہ میں اتنے کاملین اور اس قدر اصحاب احسان و یقین پیدا کیے ہوں جن کو بجا طور پر اس امت کا گل سرسبد کہا جاسکتا ہے، اس کے صحیح اور کامیاب و مقبول ہونے میں کیا شبہ ہوسکتا ہے۔

اغلاط تصوف اور ان کی اصلاح ہاں جس طرح دین کے دوسرے شعبوں میں عقائد میں بھی اور اعمال میں بھی امت کے بعض حلقوں سے چھوٹی بڑی غلطیاں بھی ہوئی ہیں، اسی طرح سلوک و تصوف کا شعبہ بھی غلطیوں سے محفوظ نہیں رہا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے جس طرح علماء ربانی و مجددین امت کے ذریعہ عقائد و اعمال کی غلطیوں کی اصلاح ہوتی رہی ہے اسی طرح اس شعبۂ احسان و تصوف کے سلسلہ کی اغلاط و ضلالات کی اصلاح بھی من جانب اللہ محققین صوفیاء کے ذریعہ برابر ہوتی رہی ہے[1]

---

[1] خاکسار کے خیال میں آخری ۳-۴ صدیوں میں تصوف کی اصلاح و تجدید کا جو کام ہندوستان میں ہوا ہے اس کو اتنا...(اگلے صفحہ پر)

پس کسی کے لئے جس طرح یہ درست نہیں ہے کہ وہ دین کے نظام عقائد یا نظام اعمال میں کچھ طبقوں کی غلط روی کی وجہ سے غیر مطمئن ہو کر عقائد و اعمال کی فکر سے بے نیاز ہو جائے، اسی طرح کسی کے لئے یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ وہ سلوک و تصوف میں کچھ لوگوں کی غلط روی کی وجہ دین کے اس شعبہ ہی سے بے نیاز ہو جائے جس کے بغیر بندہ کا دین کامل نہیں ہوتا اور حلاوت ایمان نصیب نہیں ہوتی۔

اب تک جو کچھ عرض کیا گیا اس سے ناظرین کو یہ تو معلوم ہو گیا کہ دین میں احسان کا مقام کیا ہے اور اس کی کیا حقیقت ہے اور یہ بھی کہ طالبوں کے لئے اس مقام تک پہنچنے کی عام شاہراہ وہی ہے، جس کو ہمارے عرف میں سلوک و طریق کہتے ہیں۔

ضرورت مرشد اس کے بعد معلوم ہونا چاہئے کہ اس فن کے ائمہ اور ماہرین، سب اس پر متفق ہیں اور سلوک کے تمام سلسلوں کا یہی تعامل بھی ہے کہ اس راہ کو طے کرنے کے لئے کسی رہنما کی رہنمائی ضروری ہے، یعنی جس طرح کوئی شخص صرف طب کی کتابیں دیکھ کر اپنی اور دوسروں کی بیماریوں کا علاج نہیں کر سکتا اور اگر کرے تو غلط اور خطرناک ہے، اسی طرح اس روحانی

(بقیہ ص۲۵۵ سے آگے) دودھ اور پانی کو الگ الگ کرنے کا بہترین نمونہ ہے، امام ربانی مجدد الف ثانیؒ اور ان کے فرزند و جانشین خواجہ محمد معصومؒ کے مکتوبات کے ضخیم ضخیم دفتر، پھر حضرت شاہ ولی اللہؒ اور حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ کی تصنیفات اور ان کے مکاتیب پھر حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ کا مرتب کیا ہوا حضرت سید احمد شہیدؒ کے ملفوظات و افادات کا مجموعہ صراط مستقیم پھر خاص ہماری اس صدی میں حضرت مولانا گنگوہیؒ کے اس سلسلہ کے رسائل و مکاتیب اور سب سے آخر میں حکیم الامت حضرت تھانویؒ کا تصنیف کیا ہوا اس سلسلہ کا ایک پورا کتب خانہ ان کوششوں نے تصوف کو تمام ان مفاسد و شبہات اور اسباب بے عملی و غش کر دیا ہے کہ اب اس راہ میں کسی کا گمراہ ہونا صرف اس کی بد قسمتی ہے۔

معالجہ میں بھی کسی ایسے روحانی طبیب سے استفادہ اور اس کی ہدایات و تجاویز کا اتباع فرمایا ہے جو خود اسی طریقہ پر چل کر یہ مقصد یعنی احسانی کیفیت اور رابطہ مع اللہ پیدا کر چکا ہو، اور اس راہ کے گرم و سرد سے واقف ہو۔ اس لئے طالب کا پہلا کام اور پہلا قدم یہ ہونا چاہئے کہ اپنی رہنمائی کے لئے اپنی مناسبت کے لحاظ سے وہ کسی صاحب نسبت اور صاحب ارشاد بندہ کا انتخاب کرے اور اُس سے علاج اور رہنمائی کا طالب ہو۔ اسی کا نام ارادت ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ایسے بندگانِ اللہ کی روز بروز کمی ہوتی جارہی ہے لیکن الحمدللہ دنیا ابھی اللہ والوں سے خالی نہیں ہوئی ہے اور اللہ کے ایسے بندے اب بھی موجود ہیں جن کے بارے میں اپنے محدود دبشری علم و اندازہ کے مطابق کہا جاسکتا ہے کہ وہ ہمارے اس زمانہ میں اس دولت و نسبت کے وارث اور امین ہیں اور ان کی رہنمائی میں اس راہ پر چلنے والے اور محنت و مجاہدہ کرنے والے مخلص طالب انشاء اللہ محروم نہیں رہیں گے۔

اللہ والوں کی پہچان اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ جو شخص بھی کہیں پیر بنا بیٹھا ہے وہ اس راہ کی رہنمائی کا اہل ہے، کون اس صورت حال سے ناواقف ہے کہ آج کل عالموں، مولویوں، طبیبوں اور ڈاکٹروں میں ناقص و کامل اور اصلی و نقلی سب طرح کے ہیں، اسی طرح "پیروں" میں بھی سب طرح کے ہیں، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ یہاں نقل اصل سے بہت زیادہ ہے، لیکن جس طرح دوسری لائنوں میں اصلی اور نقلی کو پہچانا جاسکتا ہے، اسی طرح تصوف کی اس لائن میں بھی اہل و نااہل کا پہچاننا کچھ زیادہ مشکل نہیں ہے۔ اس راہ کے محققین نے جو علم شریعت کے بھی ماہر ہیں (مثلاً قریبی زمانہ کے بزرگوں میں حضرت شاہ ولی اللہؒ اور حضرت قاضی ثناء اللہؒ) کتاب و سنت کے اشارات اور اپنی دینی فہم و فراست اور اس راہ کے تجربہ سے اللہ کے صادق بندوں کی ایسی علامتیں لکھ دی ہیں جن سے اہل قلوب و

اصحاب ارشاد کو پہچانا جاسکتا ہے۔ سب سے بڑی نشانی ان بزرگوں نے اللہ کے صلوق اور صاحب نسبت وارشاد بندوں کی یہ لکھی ہے کہ تقوٰی واتباعِ شریعت کے ساتھ ان کی یہ کیفیت ہو، کہ ان کے قریب رہنے سے اللہ یاد آتا ہو، دنیا کی محبت کم ہوتی ہو اور اللہ کی محبت اور آخرت کی فکر بڑھتی ہو اور ان کی رہنمائی میں اس راہ پر چلنے والوں میں یہ چیزیں صاف محسوس ہوتی ہوں۔

پس طالب کو چاہیے کہ اللہ کے کسی ایسے بندے کو یا تو خود تلاش کرے، یا اگر دوسرے ثقہ اور اصحاب نظر حضرات کے بتانے سے کسی بزرگ کے متعلق اس بارہ میں اطمینان ہوجائے اور ان کی خدمت میں پہنچ کر وہ اطمینان اور بڑھے تو پھر ان کی طرف رجوع کرے اور ان سے رہنمائی کا طالب ہو، اور پھر ان کی تجاویز وہدایات کی اسی طرح پیروی اور پابندی کرے جس طرح جسمانی مریض اپنے معالج طبیب کے نسخہ اور ہدایات کی پابندی کرتا ہے۔

اگر ایسا کیا گیا تو انشاءاللہ محرومی نہیں رہے گی اور اللہ تعالیٰ اُس نور یقین اور اس احسانی کیفیت کا کوئی حصہ ضرور نصیب فرمائیں گے جس سے دین وایمان کی تکمیل ہوتی ہے ایمان بالغیب مثل ایمان بالشہود کے ہو کر ہر قسم کے شک وشبہ اور وسوسہ سے محفوظ ہوجاتا ہے اور جس کے نتیجہ میں پوری زندگی احسانی زندگی بن جاتی ہے۔

سلوک وتصوف کا اصل موضوع اور اس کی اصل غایت تو یہی نور یقین اور احسانی کیفیت اور رابطہ مع اللہ ہے لیکن یہ جیسی اعلیٰ ترین نعمت ہے ویسی ہی اس کی قیمت بھی ادا کرنی پڑتی ہے، یعنی صرف وہی طالبانِ حق اس کو حاصل کرسکتے ہیں جو صرف اسی کو اپنا مطلوب ومقصود بنالیں اور اس کی طلب میں اپنا عیش وآرام اور اس کے علاوہ

بھی اپنا سب کچھ قربان کر دینے کی ہمت کر سکیں، اور اپنی جان کو بھی اس راہ میں بے قیمت کر دینا ان کے لئے آسان ہو۔ اس لئے ہر دور میں اس کے طالب اور اس راہ کے سالک کم ہی رہے ہیں۔

اصلاحِ عام لیکن اس سے نیچے کا ایک درجہ یہ ہے کہ بندہ اس کی فکر اور کوشش کرے کہ عقائد کی صحت اور پختگی کے ساتھ اس میں عبادت اور یادِ الٰہی کا کچھ ذوق و شوق پیدا ہو جائے، اس میں اسے لذت آنے لگے، اُس کی کم از کم ضروری درجہ کی عملی اور اخلاقی اصلاح ہو جائے، بُرے اعمال سے اُسے نفرت اور اچھے اعمال کی اُسے رغبت ہو جائے اور اُسی کے مطابق اس کی عادت بن جائے۔[۱]

الحمد للہ اس کی فکر اور اس کا شوق مسلمانوں کے دیندار طبقہ میں ابھی اچھی خاصی حد تک باقی ہے اور اصحابِ ارشاد مشائخ کے پاس آنے والے اکثر طالبین فی زماننا اسی مقصد کو لے کر آتے ہیں۔

اوپر جس نسبتِ احسانی اور رابطہ مع اللہ کا ذکر کیا گیا (جو سلسلۂ تصوف کی اصل غایت ہے) اس کے بارے میں تو یہ عاجز کچھ عرض کرنے کا بالکل بھی اہل اور حقدار نہیں ہے، اس کے طالبوں کو تو کسی صاحبِ دولت سے وابستہ ہو کر اور اُن کی رہنمائی و نگرانی ہی میں یہ سفر شروع کرنا چاہیے۔

لیکن دوسرے درجہ کے طالبین کے لئے چند وہ اصلاحی باتیں یہاں لکھ دینے میں

---

[۱] حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے طریقے پر اس کو احسان کا ادنیٰ اور لازمی درجہ قرار دیا جا سکتا ہے جس سے عام مسلمانوں کو حتی کہ ان میں کے مزدوروں اور دستکاروں جیسے مشغولین کو بھی خالی نہ رہنا چاہیے۔ بعض اکابر کی اصلاح میں اس کو "اصلاحِ عام" بھی کہا جاتا ہے اور ہم نے عنوان میں اسی اصطلاح کو اختیار کیا ہے۔ ۱۲

جن کی اپنے بزرگوں کو تلقین کرتے ہوئے دیکھا ہے (اور جو عمومی قسم کی دینی و شرعی ہدایات ہیں) یہ ناچیز کوئی حرج نہیں سمجھتا، بلکہ اُمید رکھتا ہے کہ اگر اللہ کے کسی بندہ نے بھی ان پر عمل کیا اور کچھ فائدہ اُٹھایا، تو ارحم الرحمین جتنا ثواب اُس بندہ کو اُس کے عمل کا عطا فرمائے گا، اتنا ہی اپنے قانونِ کرم "مَنْ[1] دَلَّ عَلٰی خَیْرٍ فَلَهٗ مِثْلُ اَجْرِ فَاعِلِهٖ" کے مطابق اس بے عمل ناکارہ کو بھی عطا فرمائے گا۔

اس درجہ کے طالبین کیلئے ابتدائی لائحۂ عمل (۱) سب سے مقدم چیز ایمان اور عقائد کی درستگی و پختگی ہے، عقیدہ اگر خراب ہو مثلاً کسی قسم کے اعتقادی شرک میں مبتلا ہو یا عقیدہ میں کوئی اور ایسی ہی خرابی ہو تو ہر عمل اکارت ہے حتیٰ کہ اگر ہمیشہ دن کو روزہ رکھے اور پوری رات عبادت و ذکر کیا کرے تو اللہ تعالیٰ کے یہاں اُس کی کوئی قیمت نہ ہوگی، اس لئے پہلا کام ایمان اور عقیدہ کی درستی ہے، اس کتاب کے شروع میں، اس سلسلہ میں جو کچھ لکھا گیا ہے، اصولی اور اجمالی حد تک وہ بھی کافی ہے۔

(۲) دین کے ضروری احکام و مسائل (خواہ اُن کا تعلق نماز روزہ وغیرہ عبادات سے ہو جن کا ہر شخص مکلف ہے، یا روزمرہ کے اپنے دوسرے معاملات سے) اگر معلوم نہیں ہیں تو ان کے معلوم کرنے اور سیکھنے کا اہتمام کیا جائے اور اپنے حالات کے لحاظ سے جو طریقہ اس کے لئے سہل اور مناسب ہو، وہ اختیار کیا جائے۔

(۳) اللہ تعالیٰ کے احکام کے بارے میں اب تک جو کوتاہیاں ہوتی رہی ہیں اور زندگی کا جو حصّہ معصیت اور غفلت میں گزرا ہے، اس سے سچی توبہ کر کے آئندہ کے لئے

---

[1] یہ حدیث نبوی ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ کسی نیک کام کی طرف رہنمائی کرنے والے کو بھی اتنا ہی اجر ملے گا جتنا کہ اُس کے کرنے والے کو ملے گا۔ (رواہ مسلم)

اُس مالک کے حکموں پر چلنے کا، اور بندگی والی زندگی گزارنے کا پختہ فیصلہ اور پکا ارادہ کیا جائے۔

(یاد رہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کو جس چیز کا بھی حکم ہے وہ وہی ہے جس کو بندہ کرسکتا ہے اور بغیر کسی مشکل میں پڑے کرسکتا ہے، جس عمل کا کرنا بندہ کے اختیار میں نہ ہو اُس کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے مطالبہ ہی نہیں ہوتا۔ دین میں تو آسانی کا اتنا لحاظ ہے کہ اگر بیماری کی وجہ سے نماز کھڑے ہو کر پڑھنی مشکل ہو تو بیٹھ کے اور یہ بھی مشکل ہو تو لیٹے لیٹے پڑھ لینے کی اجازت ہے، اسی طرح بیماری کی وجہ سے اور صرف سفر کی وجہ سے بھی رمضان کے روزے قضا کر دینے کی اجازت ہے، یہی حال سارے احکام کا ہے۔ اس لئے دین پر چلنا ہرگز مشکل نہیں ہے، جن کو مشکل معلوم ہوتا ہے ہمت نہ کرنے اور عادت نہ ہونے کی وجہ سے معلوم ہوتا ہے اگر ہمت کرلی جائے اور چند دن کر کے عادت ڈال لی جائے، تو پھر انشاء اللہ یہ حالت ہو جائے گی کہ دین پر چلے بغیر چین ہی نہ ملے گا۔)

(۴) ہم بشر ہیں اور ہمارے ساتھ بشری کمزوریاں لگی ہوئی ہیں، شیطان اور نفس کا بھی ہر وقت کا ساتھ ہے، اس لئے ایسا ہوتا ہے کہ آدمی معصیت سے بچنے کا اور اللہ تعالیٰ کے احکام پر چلنے کا پکا ارادہ کر لیتا ہے لیکن شیطان و نفس کے بہکانے سے پھر اس سے معصیت ہو جاتی ہے اس لئے اپنا یہ دستور و معمول بنا لیا جائے کہ جب کوئی غلط قدم اُٹھ جائے اور کوئی معصیت ہو جائے تو شعور اور تنبہ ہو جانے پر فوراً اللہ تعالیٰ سے معافی مانگ لی جائے اور آئندہ کے لئے اُس سے بچنے کا عہد کر لیا جائے۔ گناہ کے بعد رنجیدہ اور نادم ہو کر توبہ کر لینے سے گناہ کے بالکل معاف اور کالعدم ہو جانے کے علاوہ بندہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور محبت کا مستحق ہو جاتا ہے۔ إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ ○ اللہ تعالیٰ توبہ

کرنے والے بندوں کو پیار کرتا ہے)۔

اور اگر معصیت ایسی ہوئی ہے جس کا تعلق کسی بندہ کے حق سے بھی ہے مثلاً کسی پر کوئی ظلم ہوگیا ہے، کسی کی غیبت کی ہے، کسی کا کوئی حق مار لیا ہے، یا کسی کا دل دکھایا ہے تو اس کے لئے اللہ تعالیٰ سے معافی مانگنے کے علاوہ اُس صاحب حق بندہ سے معاف کرانا یا اس کا حق ادا کرنا بھی ضروری ہے۔ اسی کتاب میں "معاشرت و معاملات" کے بیان میں وہ حدیث ذکر کی جاچکی ہے۔ جس میں بتایا گیا ہے کہ بعض لوگ قیامت کے دن اس حال میں آئیں گے کہ اُن کے پاس عبادات، نماز، روزہ، صدقہ وخیرات وغیرہ کا بڑا ذخیرہ ہوگا، لیکن اسی کے ساتھ اُن کے ذمہ بہت سے بندوں کے حقوق بھی ہوں گے کسی کو ستایا ہوگا کسی کی غیبت یا آبرو ریزی کی ہوگی، کسی کو گالی دی ہوگی وغیرہ وغیرہ، تو وہاں اُن کی ساری عبادتیں اُن کے مظلوم حقداروں کو دلوادی جائیں گی اور جن حقداروں کا حساب اُن کی عبادتوں سے بھی پورا نہ ہوگا اُن کے گناہ ان ظالم عبادات گزاروں کے سر پر لاد کر ان کو جہنم میں جھونک دیا جائے گا، اَللّٰهُمَّ احْفَظْنَا۔

(۵) دین میں اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک اخلاق کی جو اہمیت ہے اور کسی آدمی کو اللہ کی رحمت اور رضا کا مستحق بنانے میں حُسن اخلاق کو جتنا دخل ہے اس کا بیان اسی کتاب میں اخلاق کے عنوان کے تحت کیا جاچکا ہے، اس لئے طالب حق اور طالب دین کی بڑی فکر یہ ہونی چاہئے کہ اس کی زندگی اچھے اخلاق سے آراستہ اور بُرے اخلاق (یعنی رذائل) سے پاک ہو جائے۔ لیکن اخلاق کا تعلق چونکہ بہت کچھ بندہ کی جبلت اور اُس کے پیدائشی مزاج سے ہے اس لئے اصلاح اخلاق کا معاملہ بہ نسبت اصلاح اعمال کے زیادہ مشکل ہے، لیکن اللہ تعالیٰ جس کے لئے آسان کردے، اُس کیلئے مشکل

نہیں۔ اس کی ایک عام تدبیر یہ ہے کہ اچھے اخلاق مثلاً :- تواضع، نرمی، حلم، ترحم وشفقت، صبر وقناعت، ایثار وفیاضی، دوسروں کی خیر خواہی وغیرہ کے تقاضوں پر اہتمام اور تکلف سے عمل کیا جائے اور اسی طرح ان کے اضداد رذائل، مثلاً کبر، غصہ، بخل، طمع، حسد، شماتت وخود غرضی وغیرہ کے تقاضوں کے خلاف چلنے کے لئے عزیمت سے کام لیا جائے اور اس بارے میں اپنی قوتِ ارادی کو پوری طرح استعمال کیا جائے، انشاء اللہ تھوڑے دنوں کے اس مشق ومجاہدہ سے طبیعت اس سانچہ میں ڈھل جائے گی۔ حدیثِ نبوی "من یستعف یعفہ اللہ ومن یستغن یغنیہ اللہ ومن یتصبر یصبرہ اللہ"[1] اور آپ کے ارشاد "امسح رأس الیتیم"[2] میں اسی طریقِ علاج کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے اور اطبار اخلاق کا یہی تجربہ بھی ہے۔

(۶) عبادات، خاصکر نماز اچھی طرح ادا کرنے کا اہتمام کیا جائے اور نفلی عبادات کا بھی اپنے کو عادی بنایا جائے۔ نفلی نمازوں میں خصوصیت سے تہجد کا اہتمام کیا جائے عبادات خواہ بدنی ہوں، خواہ مالی، خواہ مرکب قسم کی اور خواہ فرائض ہوں یا نوافل (اگر روح سے خالی نہ ہوں، تو) قربِ خداوندی اور روحانی ترقی کا سب سے بڑا ذریعہ ہیں۔

نماز، روزہ اور صدقہ وغیرہ عبادات کو بہتر طریقہ سے ادا کرنے اور ان کو جاندار

---

[1] اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص بہ تکلف عفت کا طرز عمل اختیار کرے گا، اللہ تعالیٰ اس کو باعفت بنا دیں گے اور جو شخص بہ تکلف استغنا کا رویہ اختیار کرے گا اللہ تعالیٰ اس کو غنا عطا فرمائیں گے اور جو شخص ہمت سے صبر کا رویہ اختیار کرے گا اللہ تعالیٰ اس کو صابر بنا دیں گے۔ (بخاری ومسلم)

[2] ایک صحابی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے دل کی سختی کی شکایت کی تو آپ نے ان کو یہ ہدایت فرمائی جس کا ترجمہ یہ ہے کہ "تم یتیم کے سر پر ہاتھ پھیرا کرو"۔ (مسند احمد)

اور مؤثر بنانے کے لئے جو مشورے اس کتاب میں عبادات کے بیان میں دیئے گئے ہیں، انشاء اللہ اُن پر عمل کرنا اس بارے میں بہت مفید ہوگا۔

(۷) قرآن مجید کی تلاوت اور ذکر اللہ کا بھی کچھ معمول مقرر کرلیا جائے، مثلاً صبح شام ایک تسبیح (یعنی سو دفعہ) کلمۂ تمجید:- سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ اور ایک تسبیح استغفار اور ایک تسبیح درود شریف کی پابندی سے روزانہ پڑھ لی جائے اور اِن کلمات کو معنی مطلب کے دھیان کے ساتھ دل لگا کر اور ذوق لے لے کر پڑھا جائے اور اس پڑھنے میں ثواب اور رضاء الٰہی کے علاوہ یہ بھی نیت رکھی جائے کہ ان کی برکت سے دل کو اللہ کے نام پاک کی نورانیت اور اس کی محبت نصیب ہو۔

اس کے علاوہ ہر نماز کے بعد تسبیح فاطمہ یعنی ۳۳ دفعہ سُبْحَانَ اللّٰه' ۳۳ دفعہ الحمد للّٰه' ۳۴ دفعہ اَللّٰه اکبر پڑھنے کی بھی حتی الوسع پابندی کی جائے، اس میں پورے دو منٹ بھی نہیں لگتے، بس اہتمام کی ضرورت ہے۔ رات کے سوتے وقت بستر پر پہنچنے کے بعد بھی یہی تسبیح فاطمہ اور ۳ دفعہ کلمہ استغفار" استغفر اللّٰه الذی لآ اله الاّ هو الحی القيّوم و اتوب اليه" پڑھ لیا جائے۔

قرآن مجید کی تلاوت کے لئے بھی کوئی مناسب وقت مقرر کیا جائے۔ تلاوت کی مقدار اگرچہ کم سے کم ہو (مثلاً رکوع دو رکوع ہی ہو) لیکن پابندی اور صحت کے اہتمام کے ساتھ اور ادب و عظمت کے ساتھ ہو۔

اس کی بھی عادت ڈالی جائے کہ اپنے کاروبار اور دوسرے کاموں کی مشغولیت کے اوقات میں، کسی عنوان سے اور کسی انداز میں اللہ کا نام پاک تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد زبان پر آیا کرے، مثلاً:- "یا اللّٰه" یا "لآ اِلٰهَ اِلاّ اللّٰه" یا پورا کلمہ طیبہ یا کلمہ شہادت

یا استغفار یا کوئی اور ایسا ہی کلمہ۔ تھوڑے دنوں کی ارادی مشق کے بعد انشاء اللہ سعادت ہوجائے گی۔ رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللهِ ؕ کے زمرے میں شامل ہونے کی ایک صورت یہ بھی ہے۔

(۸) رات کو بعد نماز عشاء یا دن میں اطمینان کا کوئی وقت اس کے لئے مقرر کرلیا جائے کہ اپنے خیالات کو ہر طرف سے ہٹا کے چار پانچ منٹ اپنی موت کا مراقبہ کیا جائے یعنی یہ سوچا جائے کہ جب موت آئے گی (جو بالکل یقینی ہے) تو مجھ پہ کیا گزرے گی، پھر نہلا کفنا کے اور نماز جنازہ پڑھ کر جب مجھے قبر کے سپرد کردیا جائے گا، تو تنہائی کے اس گھر میں میرا کیا حال ہوگا، پھر اگر میں اللہ کی رحمت اور بخشش کے قابل نہ ہوا، تو قیامت تک کا طویل زمانہ کیسی مصیبت سے کٹے گا، پھر قیامت کے دن جب اللہ تعالیٰ کے سامنے پیشی ہوگی اور میرا نامۂ اعمال میرے سامنے رکھا جائے گا اور حساب ہوگا، تو اس وقت میری کیا حالت ہوگی۔ (موت اور اس کے بعد کی ان منزلوں کا اس طرح تصور کیا جائے کہ گویا اس وقت وہ اسی منزل میں ہے)، اس کے بعد الحاح کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے اپنے سب گناہوں سے معافی مانگی جائے اور ایمان پر خاتمہ اور قبر اور اگلی منزلوں میں رحم و کرم کا معاملہ کرنے کی دعا کی جائے۔ اس مراقبہ کے لئے ۴۔۵ منٹ کافی ہوجاتے ہیں، بس اہتمام کی ضرورت ہے۔

(۹) ذکر و عبادت اور جو نیک عمل بھی کیا جائے، دل میں اس کے ثواب کا یقین رکھتے ہوئے، ثواب اور رضاء الٰہی کی غرض سے نیت اور دھیان کے ساتھ کیا جائے۔ دینی

ے ترجمہ: قرآن مجید کی اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص بندوں کی یہ صفت بیان کی ہے کہ "ان کو تجارت اور خرید و فروخت کی مشغولیت اللہ کی یاد سے غافل نہیں کرتی"

کی خاص اصطلاح میں اس کا نام ایمان واحتساب ہے، جو دو رکعت نماز ایمان واحتساب کے ساتھ پڑھی جائے وہ اُن دو سو رکعتوں سے زیادہ قیمتی ہے جو اس کے بغیر پڑھی جائیں، نیت اور ایمان واحتساب وہ کیمیا ہے جس سے کھانا، چلنا پھرنا، بیوی بچوں سے ہنسنا بولنا غرض زندگی کا ہر جائز عمل عبادت یعنی کارِ ثواب بن جاتا ہے۔

(۱۰) اپنے دینی اور جائز دنیوی مقاصد وضروریات کے لئے دُعا کرنا، اُن کے حصول کا ذریعہ اور وسیلہ ہونے کے علاوہ ایک مستقل عبادت بھی ہے، بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث میں دعا کو "عبادت کا مغز اور جوہر" بتلایا گیا ہے[1]۔ اور ایک دوسری حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ، "جس بندہ کے لئے دعا کا دروازہ کھل گیا، اس کے لئے رحمت کے دروازے کھل گئے"[2] اس لئے طالبِ الٰہی کو چاہئے کہ وہ دعا کو اللہ تعالیٰ کی رضا و رحمت اور اُس کے قرب کا خاص وسیلہ جانتے ہوئے دعاؤں کی کثرت کرے، خاص کر نمازوں کے بعد اور اس کے علاوہ مناسب اوقات میں اہتمام اور الحاح کے ساتھ دعا کیا کرے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جو نعمتیں عطا ہوئی تھیں، اُن میں ایک خاص الخاص نعمت دعا کے مضامین اور اُن کا سوز وگداز تھا، آپ کی سیکڑوں دعائیں حدیث کی کتابوں میں محفوظ ہیں، ان میں بڑی نورانیت اور برکت ہے بعض بندگانِ رب نے آپ کی دعاؤں کے مستقل مجموعے بھی تیار کر دیئے ہیں، ان میں مُلّا علی قاری کی "الحزب الاعظم" اور حکیم الامت حضرت تھانوی کی "مناجاتِ مقبول" اُردو ترجموں کے ساتھ چھپی ہوئی عام طور سے مل جاتی ہیں۔ دونوں ہفتہ کے سات دنوں کے لحاظ سے سات سات منزلوں پر تقسیم ہیں، اگر ہو سکے تو ان میں سے کسی ایک کی ایک منزل روزانہ پڑھلی

[1,2] رواہما الترمذی (مشکوٰۃ)

جایا کرے۔

اس عاجز راقم سطور نے اپنی کتاب "اسلام کیا ہے؟" کے آخر میں قرآن و حدیث سے منتخب کرکے مختصر اور ایسی جامع دعائیں شامل کردی ہیں جن میں دنیا و آخرت کی ہر ضرورت آگئی ہے، ان کو ترجمہ کے ساتھ بھی صرف پانچ منٹ میں پڑھا جاسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ توفیق دے کم از کم ان ہی دعاؤں کو اپنا ورد اور معمول بنالیا جائے۔

اگر عمل کیا جائے تو طالبین اصلاح کیلئے یہ دس نمبر انشاء اللہ کافی ہیں، لیکن اکثر طبیعتیں ایسی ہوتی ہیں کہ ایسی باتوں کا کسی کتاب میں پڑھ لینا اُن کیلئے کافی نہیں ہوتا، بلکہ کسی "زندہ کتاب" سے استفادہ اور صحبت کے بغیر عمل کی گاڑی نہیں چلتی، یہ بات عقل سلیم والوں کے لئے بدیہی ہے ؎

شو ہم پروانہ تا سوختن آموزی　　با سوختگاں بنشیں شاید کہ تو ہم سوزی

رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دو خاص دعائیں:۔

پچھلے صفحوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں کا ذکر آیا ہے۔ برکت اور حسن اختتام کیلئے حضورؐ کی دو دعائیں یہاں نقل کی جاتی ہیں اور بس یہی اس کتاب کا خاتمہ ہے۔

(۱) اَللّٰهُمَّ اِنَّكَ تَسْمَعُ كَلَامِيْ وَتَرٰى	اے میرے اللہ تو میری بات سنتا ہے اور میں
مَكَانِيْ وَتَعْلَمُ سِرِّيْ وَعَلَانِيَتِيْ وَلَا	جس جگہ اور جس حال میں ہوں وہ تیری نظر میں ہے
يَخْفٰى عَلَيْكَ شَيْءٌ مِّنْ اَمْرِيْ وَاَنَا الْبَائِسُ	اور میرا ظاہر و باطن سب تیرے سامنے ہے اور
الْفَقِيْرُ الْمُسْتَغِيْثُ الْمُسْتَجِيْرُ الْوَجِلُ	میری کوئی چیز بھی تجھ سے پوشیدہ نہیں ہے اور میں
الْمُشْفِقُ الْمُقِرُّ الْمُعْتَرِفُ بِذَنْبِيْ اَسْاَلُكَ	ایک دکھی اور فقیر ہوں مدد کا طالب اور پناہ جو

مَسْئَلَةَ الْمِسْكِيْنِ وَاَبْتَهِلُ اِلَيْكَ اِبْتِهَالَ الْمُذْنِبِ الذَّلِيْلِ وَاَدْعُوْكَ دُعَاءَ الْخَائِفِ الضَّرِيْرِ وَدُعَاءَ مَنْ خَضَعَتْ لَكَ رَقَبَتُهٗ وَفَاضَتْ لَكَ عَبْرَتُهٗ وَذَلَّ لَكَ جِسْمُهٗ وَرَغِمَ لَكَ اَنْفُهٗ اَللّٰهُمَّ لَا تَجْعَلْنِيْ بِدُعَائِكَ شَقِيًّا وَكُنْ لِيْ رَءُوْفًا رَحِيْمًا. يَا خَيْرَ الْمَسْئُوْلِيْنَ يَا خَيْرَ الْمُعْطِيْنَ ۞

تیرا خوف اور ڈر مجھ پر چھایا ہوا ہے، میں اپنے گناہوں کا اقراری ہوں، میں تجھ سے کسی عاجز و مسکین بندہ کی طرح سوال کرتا ہوں اور ایک ذلیل گناہگار کی طرح تیرے حضور میں گڑگڑاتا ہوں اور خوف زدہ اور دکھ درد میں مبتلا کسی بندہ کی طرح تجھ سے دعا کرتا ہوں، اس بندہ کی سی دعا جس کی گردن تیرے سامنے خم ہو اور جسکے آنسو تیرے حضور میں بہہ رہے ہوں اور جس کا جسم جھکا ہوا اور جو تیرے سامنے اپنی ناک رگڑ رہا ہو اور زمین پر سر رکھے پڑا ہو۔ اے میرے اللہ! میری دعا کو رد کر کے مجھے شقی نہ بنا اور مجھ پر مہربانی اور رحم فرما اے سب سے اچھے سب سے بڑے داتا، اے خیر المسئولین۔

(٢) اَللّٰهُمَّ بِعِلْمِكَ الْغَيْبِ وَقُدْرَتِكَ عَلَى الْخَلْقِ اَحْيِنِيْ مَا عَلِمْتَ الْحَيٰوةَ خَيْرًا لِّيْ وَتَوَفَّنِيْ اِذَا عَلِمْتَ الْوَفَاةَ خَيْرًا لِّيْ، اَللّٰهُمَّ وَاَسْئَلُكَ خَشْيَتَكَ فِي الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ

(٢) اے اللہ! بوسیلہ اپنے عالم الغیب ہونے کے اور مخلوق پر قادر ہونے کے، مجھے اس وقت تک زندہ رکھ، جب تک کہ تیرے علم میں زندگی میرے لئے بہتر ہو اور مجھے اٹھا لے جب کہ تیرے علم میں موت میرے لئے بہتر ہو اور میں تجھ سے مانگتا ہوں تیرا خوف غائب

وَاَسْأَلُكَ كَلِمَةَ الْحَقِّ فِي الرِّضَا
وَالْغَضَبِ، وَاَسْأَلُكَ الْقَصْدَ
فِي الْفَقْرِ وَالْغِنٰى وَاَسْأَلُكَ نَعِيْمًا
لَّا يَنْفَدُ وَاَسْأَلُكَ قُرَّةَ عَيْنٍ
لَّا تَنْقَطِعُ، وَاَسْأَلُكَ الرِّضَاءَ
بِالْقَضَاءِ وَاَسْأَلُكَ بَرْدَ الْعَيْشِ
بَعْدَ الْمَوْتِ وَاَسْأَلُكَ لَذَّةَ
النَّظَرِ اِلٰى وَجْهِكَ وَالشَّوْقَ
اِلٰى لِقَائِكَ وَاَعُوْذُ بِكَ مِنْ
ضَرَّاءَ مُضِرَّةٍ وَّفِتْنَةٍ مُّضِلَّةٍ
اَللّٰهُمَّ زَيِّنَّا بِزِيْنَةِ الْاِيْمَانِ
وَاجْعَلْنَا هُدَاةً مُّهْتَدِيْنَ ۝

اور حاضر میں اور میں تجھ سے توفیق مانگتا
ہوں حق بات کہنے کی خوشی میں اور ناراضی میں
اور میانہ روی کی تنگدستی میں خوشحالی میں اور
میں تجھ سے مانگتا ہوں وہ خوش عیشی جو سدا رہنے
والی ہو اور آنکھوں کی وہ ٹھنڈک جو دائمی اور
ابدی ہو اور میں تجھ سے مانگتا ہوں اپنے دل کی
رضا تیرے حکم اور فیصلہ پر اور میں سائل ہوں تجھ سے
موت کے بعد زندگی کی ٹھنڈک کا اور میں سائل
ہوں تجھ سے تیرے دیدار کی لذت کا اور تیرے وصال
کی تڑپ کا۔ (میں ان سب نعمتوں کا تجھ سے سائل
اور سائل ہوں) اور تیری پناہ چاہتا ہوں ہر
تکلیف دینے والی مصیبت سے اور ہر گمراہ کرنے
کرنے والے فتنہ سے اے اللہ! ہم کو ایمان کی
زینت سے آراستہ کر دے اور ہم کو بنا دے ہدایت یافتہ
اور دوسروں کا ہادی و رہنما۔

وآخر دعوٰنا ان الحمد للّٰه ربّ العٰلمین وسلامٌ علی المرسلین۔

*

ضمیمہ (از مصنف)

غیر اسلامی نظام حکومت میں شرکت اور ملازمت

ایک سوال

اور

اس کا جواب

یہ کتاب "دین و شریعت" جب پہلی دفعہ ۱۳۷۶ھ (۱۹۵۶ء) میں شائع ہوئی تو ایک صاحب نے اس کی ایک اہم بحث (غیر اسلامی اقتدار کے تحت رہنے والے مسلمانوں کا مسئلہ) سے متعلق ایک سوال بھیجا، یہ سوال سنجیدہ اور معقول تھا اسلئے راقم سطور نے اسکا جواب دینا ضروری سمجھا اور جواب دیا۔ موضوع کی اہمیت کے لحاظ سے اس سوال و جواب کا حق تھا کہ اس کو بھی اصل کتاب کے ساتھ شامل کر دیا جاتا، لیکن اب تک ایسا نہیں ہو سکا۔ البتہ اسی زمانے میں یہ "الفرقان" کے ایک شمارے میں شائع کر دیا گیا تھا اور اس لئے محفوظ ہو گیا تھا۔ اب جب کہ کتاب کا یہ جدید ایڈیشن ناچیز مصنف کی نظر ثانی اور بعض اضافات کے ساتھ شائع ہو رہا ہے تو اس کو بھی آخر میں ضمیمہ کے طور پر شائع کیا جا رہا ہے۔

سوال:۔ آپ نے اپنی کتاب "دین و شریعت" میں سیاست و حکومت کے باب میں غیر اسلامی (غیر شرعی) حکومت کے تحت رہنے والے مسلمانوں کے لئے جو اصولی راہِ عمل تحریر فرمائی ہے جس کے ماتحت وہ حکومت کے بہت سے شعبوں میں ملازمتیں بھی جائز طور پر کر سکتے

ہیں اور ملت کی دینی و دنیوی مصالح کا تقاضہ ہو تو حکومت اور قانون ساز اداروں میں شرکت بھی کر سکتے ہیں، اس کو میرے دل و دماغ نے پوری طرح قبول کیا ہے، بات بالکل دل لگتی اور شرعی نقطۂ نظر سے حق نظر آتی ہے اور آپ نے جو استدلالی بحث اس سلسلہ میں کی ہے، اگرچہ وہ بہت مختصر ہے مگر میرے نزدیک کافی حد تک اطمینان بخش ہے، لیکن ایک خلش یہ باقی رہ گئی کہ آپ نے ان دلائل اور اس نقطۂ نظر سے بالکل تعرض نہیں فرمایا جس کی بنیاد پر ہندو پاک کا ایک مشہور و معروف دینی مکتب فکر کسی غیر اسلامی حکومت یا اس کے قانون ساز اداروں میں شرکت کو ہر حال میں ایک طاغوتی عمل اور ایسی حکومتوں کی ملازمت کو مطلقاً تعاون "علی الاثم و العدوان" اور طاغوت کی چاکری قرار دیتا ہے۔

ان حضرات کی مشہور دلیل سورۂ توبہ کی آیت "اتخذوا احبارھم ورھبانھم" اور اس کی شرح کرنے والی حدیث بروایت عدی بن حاتم ہے، اس کی تفصیل یقیناً آپ کے علم میں ہوگی اچھا ہو کہ آپ اس پر بھی روشنی ڈال کر مجھ جیسے لوگوں کی یہ خلش دور فرما دیں۔

جواب: "دین و شریعت" کی جس بحث کا آپ نے اپنے سوال میں حوالہ دیا ہے واقعہ یہ ہے کہ جب میں نے ابتداً اس کو لکھا تھا تو اپنے مدعا اور مسلک کی وضاحت سے فارغ ہونے کے بعد اس مخالفانہ نقطۂ نظر اور اس کے ان مشہور دلائل سے بھی تعرض کیا تھا جن کا آپ نے تذکرہ کیا ہے، لیکن بعد میں مجھے یہ خیال ہوا کہ پوری کتاب میں میرا یہ رویہ رہا ہے کہ دین کے جس باب میں جو میرے نزدیک حق تھا، بس اسی کو میں نے وضاحت کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور ناظرین کے اطمینان قلب اور تاثیر کے لیے جہاں جتنی استدلالی بحث ضروری تھی بس اسی قدر بحث کر دی ہے، مخالفانہ دلائل سے کہیں

بھی تعرض نہیں کیا ہے، اس لئے مجھے یہی مناسب معلوم ہوا کہ اس بحث میں بھی اسی طریقہ کی پابندی کی جائے، چنانچہ وہ لکھا لکھایا حصہ میں نے کتاب سے نکال لیا۔ لیکن نکلا ہوا وہ حصہ اصل مسودہ میں محفوظ تھا، اس لئے الفاظ کے معمولی تصرف کے ساتھ میں اسی کو نقل کئے دیتا ہوں، انشاء اللہ آپ جیسے سلیم القلب حضرات کے اطمینان کے لئے وہی کافی ہوگا۔

پہلے میں نے چند سطروں میں اسی مخالفانہ نقطۂ نظر کا تذکرہ کیا تھا جس کا آپ نے حوالہ دیا ہے، اس کے بعد میں نے لکھا تھا کہ "کتاب و سنت" اور امت کے مسلسل تعامل سے اس بارے میں جو کچھ ہم نے سمجھا ہے وہ یہ ہے کہ ہر مسلمان کے لئے یہ تو ضروری اور گویا شرط ایمان ہے کہ وہ اسلام، اسلامی تعلیم یعنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کیلئے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے ضابطۂ حیات اور نظام زندگی کو حق و ہدایت سمجھے اور اس کے خلاف جو کچھ ہے۔ اس کو غلط و باطل یقین کرے اور اس لئے اس کی دلی آرزو اور چاہت یہی ہو کہ تمام انسان اللہ اور رسول پر ایمان لے آئیں اور ان کے مقدس دین اسلام کو اپنا لیں اور ساری دنیا اس کی حلقہ بگوش اور اسی کے زیر اقتدار ہو جائے (ویکون الدین کلہ للہ) نیز امت مسلمہ کا یہ بھی فرض ہے کہ اس مقصد کے لئے جس وقت براہِ راست یا بالواسطہ جو سعی و تدبیر مناسب ہو اس سے دریغ نہ کیا جائے۔ (یہ بات " دین و شریعت " میں " دین کی خدمت و نصرت " کے زیر عنوان تفصیل سے لکھی بھی جا چکی ہے)۔" لیکن ان حضرات کا یہ کہنا کہ کسی ملک کی غیر اسلامی حکومت کے ساتھ کسی معاملہ میں تعاون اور اس کی کوئی ملازمت بھی کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں اور اس کو مستقل شرعی " فتوے " کی حیثیت دینا ہمارے نزدیک ایسی بات ہے جس کی شریعت میں کوئی دلیل و بنیاد نہیں ہے،

علاوہ ازیں بعض حالات میں اس غائبانہ "فتوے" سے مسلمانوں کے دینی مقاصد و مصالح کو بھی سخت ضرر پہنچ سکتا ہے۔

ہمارے نزدیک عام شرعی مسئلہ اس باب میں یہ ہے کہ ایک مسلمان جسطرح کسی غیر صالح یا غیر مسلم فرد کے اُن معاملات کی انجام دہی کے لئے اُس کی ملازمت اور اس کے ساتھ تعاون و اشتراک کر سکتا ہے جو اثم و عدوان نہ ہوں، اسی طرح غیر اسلامی حکومتوں اور اس طرح کے دوسرے اجتماعی اداروں کے بھی ان کاموں میں ہم تعاون کر سکتے اور عملی حصہ لے سکتے ہیں جو خلاف شریعت اور از قبیل اثم و عدوان نہ ہوں، اور جس میں اسلام اور مسلمانوں کا کوئی ضرر نہ ہو، مثلاً حکومتوں کا محکمۂ صفائی، محکمۂ غذا، محکمۂ صحت، مواصلات، زراعت، صنعت، انسداد جرائم اور قیام امن اور ان کے علاوہ اور بھی متعدد شعبے حکومتوں کے ایسے ہیں جو اثم و عدوان نہیں ہیں بلکہ ان میں سے بعض میں تو خدمت خلق اور رفاہ عام کا پہلو بھی غالب ہے، پس ایسے کاموں میں تعاون اور ان شعبوں میں ملازمت کے شرعی عدم جواز کی کوئی بھی وجہ نہیں ہو سکتی۔

یہاں ایک بڑا اصولی مغالطہ جس پر عدم جواز کے اس فتوے کی بنیاد رکھی جاتی ہے یہ ہے کہ کہا جاتا ہے کہ ہر غیر اسلامی حکومت اللہ کے مقدس دین کے مقابلہ میں ایک متوازی دین اور اللہ کے نازل کئے ہوئے نظام حق کے مقابلہ میں ایک باغیانہ نظام ہے، اس لئے اس کے کسی بھی کام میں تعاون و اشتراک اور کسی بھی شعبہ میں اسکی ملازمت و خدمت دین حق کے مقابلہ میں ایک دین باطل کی خدمت اور مقدس الہی نظام کے ساتھ تعاون اور اسکی خدمت ہے۔

لیکن اگر اللہ نے دین کا کچھ بھی علم و فہم دیا ہو تو تھوڑا سا غور کرنے سے معلوم ہو جائے

گا کہ یہ بات شرعی دلیل سے زیادہ خطابت اور شاعری ہے، واقعہ یہ ہے کہ جس قسم کی دنیوی حکومتوں کے بارے میں یہاں گفتگو ہے (ان کے حدود واختیار اور حدود کار کی موجودہ وسعت کے باوجود) ان کی حقیقت اس سے زیادہ کچھ بھی نہیں ہے کہ وہ ملکی نظم ونسق کو چلانے والے ایسے ادارے ہیں جن کے افراد بھی بدلتے رہتے ہیں، پارٹیاں بھی بدلتی رہتی ہیں اصول اور دستور تک میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں، ان سے غلطیاں بھی ہوتی ہیں ان غلطیوں پر نکتہ چینی بھی کی جاتی ہے، خاص کر جمہوری حکومتوں والے ملکوں میں تو یہ نکتہ چینیاں بعض اوقات نہایت سخت اور حد درجہ رسوا کرنے والی ہوتی ہیں، پھر ان حکومتوں کے بڑے بڑے ذمہ داروں پر بھی بعض اوقات مقدمے چلتے ہیں اور ان کو سزائیں بھی دی جاتی ہیں، پھر عوام کے لئے ان حکومتوں کے بدلنے کا حق بھی تسلیم کیا جاتا ہے اور اسی بنیاد پر ملکوں میں یہ حکومتیں آئے دن بدلتی بھی رہتی ہیں اور اسی بنا پر ان حکومتوں کی اصل حیثیت بس یہی ہے کہ یہ ملکی نظم ونسق کے چلانے کے ادارے ہیں، ان میں بسا اوقات مختلف عقائد وخیالات رکھنے والے اور مختلف ادیان ومذاہب کے ماننے والے اور کبھی کبھی تو مختلف سیاسی نظریات رکھنے والے بھی شریک ہو جاتے ہیں۔ جن کے درمیان صرف حکومت کے اصولی پروگرام پر اتفاق ہوتا ہے۔ پس جن حکومتوں کی واقعی حیثیت اور پوزیشن یہ ہے کہ ان کے غیر اسلامی اور غیر شرعی ہونے کی وجہ سے شریعت کی زبان میں ان کو ناحق اور غیر صحیح حکومتیں تو بے شک کہا جا سکتا ہے، لیکن یہ کہنا کہ ایسی ہر حکومت اللہ کے مقدس دین کے مقابلہ میں ایک متوازی دین ہے اور ان کے چلانے والے اللہ کے مقابلہ میں خدائی کے دعویدار ہیں جب ہی صحیح ہو سکتا ہے جب کہ اللہ اور اس کے مقدس دین کو بہت نیچے اتار لیا جائے، یعنی اللہ کو دنیوی حکمرانوں اور فرمانرواؤں کی قسم کا بس

ایک "اسٹیٹ" اور "نظام حکومت" سمجھ لیا جائے" تعالی اللہ عن ذلک علوا کبیراہ

اسی طرح کا ایک دوسرا مغالطہ اس سلسلہ میں یہ بھی ہے کہ ان حکومتوں کی صرف دنیوی قانون سازی کو اللہ تعالیٰ کی دینی تشریع کے مقابل قرار دے کر "شرک" بلکہ اس سے بھی بڑھ کر "خدائی کا دعویٰ" کہا جاتا ہے اور اسی بنا پر ان حکومتوں کی مجالس قانون ساز کی شرکت کو دعویٰ خدائی کو متضمن اور قطعی حرام قرار دیا جاتا ہے حالانکہ جس تشریع کا حق غیر اللہ کے لئے ماننا واقعۃً شرک ہے وہ دینی تشریع ہے یعنی یہ کہ کسی مخلوق (فرد یا طبقہ یا ادارہ) کو مقدس مطاع اور منزہ عن الخطا مانتے ہوئے اُس کو تحریم و تحلیل اور امر و نہی کا حقدار مانا جائے اور اس کے احکام کی تعمیل کو بر و سعادت اور اس کی نافرمانی کو گناہ و شقاوت سمجھا جائے۔ قرآن مجید میں نصاریٰ کے جس گروہ کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ :-

"اتخذوا احبارھم ورھبانھم	انہوں نے اللہ کو چھوڑ کر اپنے مذہبی عالموں
اربابا من دون اللہ (توبہ ۔ ۴)	اور درویشوں کو اپنا معبود بنا لیا۔

ان کی گمراہی یہی تھی اور اپنے احبار و رہبان کو انہوں نے تقدس و تشریع کا یہی مقام دے رکھا تھا اس آیت کی تفسیر میں حضرت عدی بن حاتم سے جو حدیث مروی ہے خود اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے[1] اور مسیحیت کی تاریخ کے مطالعہ سے یہ چیز اور زیادہ وضاحت؟

---

[1] جامع ترمذی وغیرہ میں حضرت عدی بن حاتم سے روایت ہے کہ عدی بن حاتم جو عیسائی تھے انہوں نے تعجب سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سورۂ توبہ کی یہ آیت سنی تو عرض کیا کہ عیسائیوں نے اپنے عالموں اور درویشوں کو تو معبود نہیں بنایا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا ایسا نہیں ہے کہ ان کے یہ عالم اور درویش جس چیز کو حرام یا حلال قرار دیتے ہیں عیسائی ان کی تحریم و تحلیل کو مان کر ان کا اتباع کرتے ہیں۔ یہی ان کو معبود بنانا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد تحریم و تحلیل ہے اور مسیحیت کی تاریخ کے مطالعہ سے اس کی پوری تفصیل بھی معلوم ہو جاتی ہے۔

تفصیل سے معلوم ہوجاتی ہے۔

اور بالکل ظاہر ہے کہ عہدِ حاضر کی جن غیر اسلامی حکومتوں کے بارے میں گفتگو ہو رہی ہے ان کی اور انکے قانون کی حیثیت کسی کے نزدیک بھی یہ نہیں ہے اسلئے انکی قانون سازی کو وہ تشریع قرار دینا جو درحقیقت صرف اللہ کا حق ہے اور اس بنا پر اسکو خدائی کا دعویٰ یا شرک یا جرم کہنا سراسر شاعرانہ غلو ہے اور پھر اسکے ثبوت میں سورۂ توبہ کی مندرجہ بالا آیت پیش کرنا اور بھی بے جا جسارت ہے۔

امید ہے کہ اس مسئلے سے متعلق یہی سطریں آپ کی اور آپ جیسے دیگر حضرات کی غلط فہمی دور کرنے کے لئے کافی ہوں گی۔

اصل بات یہ ہے کہ اسلام کے نقطۂ نظر سے صحیح اور جائز حکومتیں تو صرف وہی ہو سکتی ہیں جو حکومت و سیاست کے اسلامی ضابطہ کی بنیاد پر قائم ہوں اور جن کے دستور و قانون کی اساس کتاب و سنت اور اسلامی شریعت کو قرار دیا گیا ہو لیکن جو حکومتیں ایسی نہیں ہیں خواہ ان کے چلانے والے غیر مسلم ہوں یا مسلمان یا مخلوط، انکے غیر صحیح اور ناجائز ہونے کے باوجود اسلام ان کے وجود کو اسی طرح تسلیم کرتا ہے جس طرح وہ غیر صالح اور غیر مسلم افراد کے وجود کو تسلیم کرتا ہے، پھر انکے حالات کے اختلاف کے لحاظ سے وہ ان کو مختلف قسموں میں تقسیم کرتا ہے اور انکے بارے میں الگ الگ احکام دیتا ہے۔ پھر جس طرح وہ عام حالات میں غیر مسلم افراد کیساتھ ایسے امور میں تعاون اور اشتراک سے منع نہیں کرتا جو اثم و عدوان نہیں ہیں، اسی طرح وہ ایسے امور میں غیر اسلامی حکومتوں کے ساتھ اشتراک و تعاون سے بھی منع نہیں کرتا، بلکہ اگر غیر مسلم افراد اور اسی طرح غیر اسلامی حکومتیں کوئی ایسا کام کریں جس میں اللہ کی مخلوق کی بھلائی ہو تو اسلام اس میں تو تعاون کی اپنے پیروؤں کو ترغیب دیتا ہے، نیکی اور بھلائی کے کاموں میں تعاون و تناصر کا حکم صرف مسلمانوں ہی سے مخصوص نہیں ہے، بلکہ اس

کے عموم میں غیر مسلم بھی شامل رہیں[1]۔

علاوہ ازیں کسی غیر اسلامی حکومت کے مسلمان شہریوں کے لئے ایسے حالات بھی پیدا ہو سکتے ہیں (بلکہ اکثر و بیشتر ایسا ہو گا) کہ حکومت کے کاروبار اور اس کی مجالس قانون ساز میں شرکت خود مسلمانوں کو دینی و دنیوی نقصانات سے بچانے کیلئے اور انکے دوسرے اہم ملی مصالح کیلئے ضروری بھی ہو جائے پس ایسے حالات اور ایسی صورت ہو تو ان مخلص مسلمانوں کا جو اس کیلئے اہل اور موزوں ہوں حکومت کے کاروبار میں شریک ہونا ضروری ہو گا اور بالکل اسی طرح بے تعلقی اور عدم تعاون مسلمانوں کے دینی و ملی مصالح کا تقاضہ ہو اور ان کے اہل علم اور ارباب دانش اسی پالیسی کو اختیار کرنے کا فیصلہ کریں تو اس وقت ان ملکوں کے مسلمانوں کو اسی کے مطابق چلنا اور اسی پالیسی پر عمل پیرا ہونا ضروری ہو گا، لیکن اس وقت بھی اس فیصلہ کی بنیاد یہ نہ ہو گی کہ غیر اسلامی حکومت سے اشتراک و تعاون ایمان باللہ اور کفر بالطاغوت کے بنیادی حکم کے منافی ہے اور اس لئے قطعاً حرام ہے بلکہ وہ اس وقت کے خاص حالات کا تقاضہ اور مخصوص صورت حال کا حکم ہو گا واللہ تعالیٰ اعلم۔

ربنا لا تزغ قلوبنا بعد اذ هديتنا وهب لنا من لدنك رحمةً انك انت الوهاب۔

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

---

[1] جس مکتب فکر کے نقطۂ نظر پر یہ بحث کی گئی ہے اسکے فکری رہنما مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی نے سورۂ مائدہ کی آیت "تعاونوا على البر والتقوى ولا تعاونوا على الاثم والعدوان" کے ذیل میں تفہیم القرآن میں جو کچھ لکھا ہے ان کے متبعین اس موقع پر اس کو ضرور دیکھ لیں۔